شتمِ رسول کا مسئلہ

قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ کی روشنی میں

مولانا وحید الدین خاں

شتمِ رسُول کا مسئلہ

قرآن وحدیث اورفقہ وتاریخ کی روشنی میں

مولانا وحید الدین خاں

Shatm-e-Rasool Ka Masla

By Maulana Wahiduddin Khan

First Published 1997
Reprinted 2024

This book is copyright free and royalty free. It can be translated, reprinted, stored or used on any digital platform without prior permission from the author or the publisher. It can be used for commercial or non-profit purposes. However, kindly inform us about your publication and send us a sample copy of the printed material or link of the digital work.

e-mail: info@goodwordbooks.com
info@cpsglobal.org

Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
e-mail: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
e-mail: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

پہلا باب

آغازِ کلام 8

اسلام مغربی لٹریچر میں 13

عرض مترجم 25

شتم رسول کا مسئلہ 28

امت کا فکری زوال 29

قرآنی پیٹرن کے بجائے فقہی پیٹرن 30

مقصد تخلیق 31

یہ اسلام نہیں 33

جہاد یا سرکشی 36

جذبات کا اعتبار نہیں 40

دوسرا باب

رشدی کی کہانی 42

جوابی انعام 44

اسلام کی تصویر بگاڑنا 45

ریاض کانفرنس کا فیصلہ 46

ایک مغالطہ 47

مضحکہ خیز ردّ عمل 49

سورج پر خاک 50

سطحی کتاب 53

کتاب کا مضمون 54

مسلّمہ عظمت 56

فرضی افسانہ 58

غلط بیانی 63

ایک مثال 67

اطاعت یا سرکشی 70

چند مثالیں 70

تعمیل حکم یا سرکشی 74

حکمت اعراض 80

حضرت عمر کا قول 85

پرنٹ میڈیا، الکٹرانک میڈیا 86

دورِ آزادی 91

زیادہ بڑی سزا 100

تیسرا باب

شتم وارتداد 108

فقہی مسئلہ، شرعی مسئلہ 110

قول بلا فعل 114

سامان تضحیک 118

متفرقات 121

اخباری بیان 121

ایک ملاقات 122
غلط ترجمانی 126
اشتعال انگیزی نہیں 128
ملاحظات 130
جلوس کی سیاست 133
چند تبصرے 135
دونوں یکساں 136
ناقابل فہم 139
قلم کا جواب قلم 143
شاتمِ رسول کی سزا 146
ابن تیمیہ کی کتاب 148
ذاتی حق کا معاملہ نہیں 157
دفاع نہ کہ حد 158
قیاسی مسئلہ 160
قرآن سے استدلال 160
حدیث سے استدلال 164
فقہ سے استدلال 169
پیغمبر اور مستہزئین 184
زیادہ بڑا مجرم 191
امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں 191

چوتھا باب

مصلحت دعوت 194
حالات سے بلند ہو کر 198
پیغمبر کا نمونہ 200
دعوتی تصویر 201
بدنامی سے بچت 201
مزید مثالیں 205
زیادہ قابلِ لحاظ 206
اغیار کو موقع نہ دینا 207
دو اقتباس 209
دورِ اوّل کی مثال 211
مستقبل پر نظر 212
اگلی نسلوں کا انتظار 216
آج کا دشمن کل کا دوست 218
اسلام قبول کرنے کے بعد 221
خدائی ضمانت 227
خدائی حفاظت 231
اصل ذمہ داری سے غفلت 234
پہلا کام اتمام حجت 236
شتمِ رسول کا مسئلہ 237
ڈائری سے انتخاب 243

پانچواں باب

جدید ذہن اور اسلام 254
ہجر جمیل 256
غیر فطری ردعمل 265
دعوت کے حدود 267

کارٹون	269	توہینِ رسول	304
پیغمبر کے نام پر غیر پیغمبرانہ روش	271	دلیل یا سزا	307
اعراض کی ضرورت	273	اختلاف رائے کا کیس	312
کارٹون کا مسئلہ	278	تحفظِ نبوت، تحفظِ کارِنبوت	313
بے فائدہ عمل	284	مثبت جواب	315
جذباتی ہنگامہ آرائی	286	نبیِ رحمت کا طریقہ	317
دو آپشن	288	**خاتمہ**	
قصاص کا اصول	289	سوچنے کی بات	320
پرامن احتجاج	290	اصل مسئلہ	321
حبل اللہ، حبل الناس	291	جدید اسلامی لٹریچر	324
سماجی جرم، اعتقادی جرم	294	مثبت طریقِ کار	326
سزا کا تعلق خدا سے	295	قابلِ تقلید نمونہ	328
عفو و درگزر کا حکم	296	خاموشی کی طاقت	329
شتم اور ارتداد	297	اصل کام	331
تاریخ کا سبق	299	سوال و جواب	337
قومی توہین	302	خاتمۂ کلام	341

پہلا باب

آغازِ کلام

عمر بن عبدالعزیز (61-101ھ) بنوامیہ کے دور کے ایک صالح اور راشد مسلم حکمراں تھے۔ ان کے زمانہ میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی۔ لوگ کثرت سے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونے لگے۔ عمر بن عبدالعزیز نے عمومی حکم جاری کر دیا کہ جو شخص اسلام قبول کرے، اس کے اوپر سے جزیہ کی رقم فوراً ساقط کر دی جائے۔ اس کے نتیجہ میں سرکاری بیت المال کی آمدنی کم ہوگئی۔

یہ اقتصادی نقصان دیکھ کر ایک عامل (گورنر) نے عمر بن عبدالعزیز سے کہا کہ جزیہ کی رقم ساقط کرنے کی وجہ سے لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس طرح تو ہمارا بیت المال خالی ہو جائے گا۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ تمہارا بُرا ہو، اللہ نے محمد کو ہدایت دینے والا بنا کر بھیجا ہے، اس نے آپ کو محصّلِ بنا کر نہیں بھیجا: **فَإِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا دَاعِيًا وَلَمْ يَبْعَثْهُ جَابِيًا** (الطبقات الکبریٰ، جلد 5، صفحہ 384)۔

عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ایسے مسلمان بہت تھوڑے ہوں گے جو پیغمبر اسلام کو محصّلِ (Tax-collector) سمجھتے ہوں۔ مگر موجودہ زمانہ میں تو بظاہر تمام مسلمان اسی سوچ کے ہو چکے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کے حالات بتاتے ہیں کہ اصاغر سے لے کر اکابر تک تمام مسلمان دعوت کے شعور سے خالی ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز کے قول میں جو شعور دعوت تھا وہ شعور دعوت موجودہ زمانہ کے مسلمانوں، کم از کم ان کے معلوم وممتاز افراد میں سے کسی میں بھی نہیں پایا جاتا۔

موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کے پاس مسلمان کی حیثیت کو بتانے کے لیے جو الفاظ ہیں، وہ کیا ہیں۔ وہ ہیں خدائی فوجدار، محتسب کائنات، خلیفۃ اللہ

فی الارض، وغیرہ۔ اس قسم کے تمام الفاظ بلاشبہ لغویت کی حد تک غیر اسلامی ہیں۔قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو:إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ۔لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (88:21-22)۔مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے عملاً اس آیت کو الٹ دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارا کام صرف نصیحت اور وعظ کہنا نہیں ہے، بلکہ داروغہ بن کر لوگوں کے اوپر حکمرانی کرنا ہے۔

یہی موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے۔موجودہ زمانہ کے مسلمان اس شعور سے خالی ہو گئے ہیں کہ وہ داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس کے بجائے وہ اپنے آپ کو زمین پر خدا کا سیاسی نائب سمجھتے ہیں۔حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کے گواہ ہیں:لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (2:143)۔ان کا کام یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی منصوبہ سے لوگوں کو آگاہ کریں۔انھیں خود حق پر قائم ہونا ہے، اور لوگوں کے درمیان حق کی پیغام رسائی کرنا ہے۔اس کے سوا جو امور ہیں، ان سب کو انہیں اللہ کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔

دعوت مومن کی شخصیت کی کلید ہے۔ یہی وہ شعور ہے جو دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کی تشکیل کرتا ہے۔یہی ان کے تمام خارجی رویہ کو متعین کرتا ہے۔ چونکہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے دعوت کے شعور کو کھو دیا ہے، اس لیے ان کا پورا خارجی رویہ بگڑ کر رہ گیا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان نہ صرف یہ کہ دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ مسلسل طور پر دعوت کو قتل کرنے میں مشغول ہیں۔دوسری قوموں کو سیاسی حریف سمجھنا، ان کے مقابلہ میں

احتجاجی اور مطالباتی مہم چلانا، ایسے جھگڑے کھڑے کرنا جس کے نتیجہ میں داعی اور مدعو کے درمیان تعلقات خراب ہوجائیں۔ اس طرح کی تمام سرگرمیاں دعوت کی فضا کو بگاڑتی ہیں۔ وہ دعوت ونصیحت کی قاتل ہیں۔ مگر ساری دنیا کے مسلمان ہر روز انہیں دعوت کُش سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ اصاغر تو درکنار، ان کے اکابر بھی یہ سوچ نہیں پاتے کہ ایسا کر کے وہ اپنے خلاف خدا کے غضب کو بھڑکا رہے ہیں۔

انہیں دعوت کُش سرگرمیوں میں سے ایک سرگرمی وہ ہے جو "شتم رسول" کے خلاف مسلمان ہر جگہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ اور جس کا ایک نمایاں مظاہرہ سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) کی اشاعت کے بعد 1989 میں سامنے آیا ہے۔ اینٹی رشدی ایجی ٹیشن بلاشبہ لغویت کی حد تک غیر اسلامی تھا۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے اصاغر واکابر کے درمیان اس لیے جاری رہا کہ دعوتی شعور سے محرومی کی بنا پر انھوں نے وہ کسوٹی کھودی تھی جس پر جانچ کر وہ معلوم کرسکیں کہ ان کی کون سی روش اسلام کے مطابق ہے، اور کون سی روش اسلام کے مطابق نہیں۔

مسلمانوں کے اوپر اپنے عقیدہ کے اعتبار سے لازم ہے کہ وہ داعی اور مدعو کی اصطلاحوں میں سوچیں۔ وہ اپنی انفرادی اور قومی سرگرمیوں کی تشکیل میں دعوت کو اصل معیار بنائیں۔ وہ دعوت کی مصلحت کو تمام دوسری مصلحتوں پر مقدم رکھیں۔ وہ ہر نقصان کو گوارہ کر لیں، مگر دعوت کا نقصان کسی قیمت پر گوارا نہ کریں۔ مسلمانوں کے اس داعیانہ منصب کا لازمی تقاضہ ہے کہ وہ ہرگز کسی ایسی سرگرمی میں مبتلا نہ ہوں جو دعوت کے مزاج کے خلاف ہو، یا دعوت کے امکانات کو برباد کرنے والی ہو۔

اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا تو یقینی طور پر وہ خدا کے یہاں مجرم قرار پائیں گے، خواہ انھوں نے اپنے دعوت کُش جلوس کا نام شوکت اسلام جلوس رکھ لیا ہو، اور خواہ اس کی قیادت

کے لیے ان کے تمام اعاظم واکابر اکٹھا ہو گئے ہوں۔

موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اگر ذرا بھی ان کے خلاف مزاج بات کرے تو وہ فوراً مشتعل ہو کر اس سے لڑنے لگتے ہیں — کوئی ان کی مسجد کی دیوار پر رنگ ڈال دے۔ ان کی نماز کے وقت کوئی گھنٹہ بجا دے۔ کسی کا جلوس ان کے محلہ کی سڑک سے گزر جائے۔ کوئی ایسا نعرہ لگا دے جو ان کے قومی وقار کے خلاف ہو۔ کوئی شخص ایک قابل اعتراض بیان اخبار میں چھاپ دے۔ اس قسم کی کوئی ادنیٰ اشتعال انگیزی بھی انھیں مشتعل کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اتنا بے خود ہو جاتے ہیں کہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو لڑائی وہ چھیڑ رہے ہیں اس میں دوسرا فریق چھری ثابت ہو گا اور وہ خود خربوزہ کی مثال بن کر رہ جائیں گے۔

ناگوار باتوں پر مشتعل ہو جانے کی اس فہرست میں سب سے زیادہ نمایاں چیز وہ ہے جس کو "ناموس رسول پر حملہ" یا "رسول کی شان میں گستاخی" جیسے جذباتی الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس نوعیت کی اگر کوئی افواہ بھی پھیل جائے تو اس کے بعد مسلمان اس طرح بھڑک کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام تو درکنار عقل وہوش سے بھی ان کا دور کا کوئی تعلق نہیں۔

مسلمانوں کا یہ لغو مزاج صرف اس لیے ہے کہ انھوں نے دعوت کا شعور کھو دیا ہے۔ دوسری اقوام کو وہ صرف اپنا قومی رقیب اور دنیوی حریف سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہر بات کو فوراً قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اگر ان کے اندر داعیانہ شعور زندہ ہو تو وہ دوسری اقوام کو اپنا مدعو سمجھیں گے۔ اس کے بعد دوسری اقوام سے انھیں نفرت کے بجائے خیر خواہی پیدا ہو جائے گی۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں پر وہ اسی طرح صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں گے جیسا کہ رسول اور اصحاب رسول نے اختیار کیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کے اندر دعوتی شعور پیدا کیا جائے۔ ان کے اندر یہ احساس بیدار کیا جائے کہ وہ داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی سے ان کی جھوٹی جذباتیت ختم ہوگی۔ اسی سے ان کے اندر یہ حکمت آئے گی کہ وہ ناگوار باتوں سے اعراض کریں اور اشتعال انگیز باتوں پر مشتعل نہ ہوں، دعوتی شعور ان کے اندر صبر، حکمت، بصیرت اور بلند فکری جیسی صفات پیدا کرے گا۔ اور بلاشبہ یہی وہ صفات ہیں جو کسی آدمی کے لیے دنیا کی کامیابی کا بھی زینہ ہیں اور آخرت کی کامیابی کا زینہ بھی۔

زیرنظر کتاب میں اس مسئلہ کا مطالعہ سلمان رشدی کے واقعہ کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس موضوع پر علمی اور صحت مند بحث کا آغاز ثابت ہو۔

وحیدالدین

27 جون 1989

زیرِ نظر اشاعت میں اس موضوع سے متعلق مولانا وحیدالدین خاں صاحب کے ان تمام مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو اس کتاب کا حصہ نہیں تھے۔

ناشر

8 مئی 2024

اسلام مغربی لٹریچر میں

ڈاکٹر ہٹی (Plilip K. Hitti) عربی زبان اور تاریخ کے مشہور ماہر ہونے کی حیثیت سے مغربی دنیا میں مشرق قریب کے مسائل پر سند سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے عرب اور اسلام کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں اور انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار ہیں۔ ان کی کتابیں یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہی ہیں۔ وہ مختلف یونیورسٹیوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اور اس وقت پرنسٹن یونیورسٹی (نیوجرسی) میں سامی ادب کے پروفیسر ہیں۔

اسلام اور مغرب (Islam and the West) ڈاکٹر ہٹی کی کتاب ہے جو 1962ء میں امریکا سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے 190 صفحات ہیں اور اس کا موضوع عیسائی دنیا اور اسلام کے تمدنی تعلقات کی تاریخ ہے جس میں بازنطینی سلطنت کے وقت سے لے کر اب تک مختلف قسم کے اتار چڑھاؤ پائے جاتے رہے ہیں۔ موصوف نے ترجموں کی مدد سے نہیں بلکہ اصل مآخذ سے براہ راست استفادہ کرکے یہ کتاب تیار کی ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کے ابتدائی تین ابواب میں اسلام کا بالترتیب مذہب، ریاست اور کلچر کی حیثیت سے تعارف ہے۔ چوتھا باب ہے — "اسلام مغربی لٹریچر میں"۔ پانچویں اور چھٹے باب میں بالترتیب مشرق کا مغرب پر اور مغرب کا مشرق پر نفوذ و اثر دکھایا گیا ہے۔ ساتویں باب میں اس تحریک کا مختصر تعارف ہے جو اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لیے مختلف اسلامی ممالک میں جاری ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں قرآن اور دوسری قدیم کتابوں سے اسلام اور اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیتوں کے بارے میں اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ یہ اقتباسات کل 29 ہیں۔

ذیل میں کتاب کے چوتھے باب (Islam in Western Literture) کا ترجمہ

دیا جارہا ہے، اس معذرت کے ساتھ کہ نقل کفر کفر نباشد۔

قرون وسطیٰ کے مغربی لٹریچر میں پیغمبر اسلام کو عام طور پر جعل ساز اور جھوٹے رسول کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ قرآن ان کی ایک بناوٹی کتاب اور اسلام ایک نفس پرستانہ طریق حیات تھا، دنیا میں بھی اور دوسری زندگی میں بھی۔ اس زمانے میں مذہب، اسلام اور عیسائیت دونوں کے درمیان دشمنی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ دونوں طرف یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ ان ہی کا مذہب تمام صداقتوں کا واحد خزانہ ہے۔ مگر سیاسی اور فوجی تصادم، نظریاتی تصادم سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ڈیڑھ صدی تک ان کے پیرو پہلے مدینہ، پھر دمشق اور اس کے بعد بغداد سے نکل کر بازنطینی سلطنت کو روندتے رہے۔ یہاں تک کہ بڑھتے ہوئے مسیحیت کے مشرقی دارالسلطنت کے دروازے تک پہنچ گئے۔ قسطنطنیہ کے سقوط (1453ء) کے بعد چار صدیوں میں مسلم سلجوق اور عثمانی ترک اپنی ہمسایہ مسیحی طاقتوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن گئے۔ 711ء سے شروع ہو کر تقریباً آٹھ سو برس میں مسلمان اسپین کے ایک حصہ پر قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے فرانس تک پر دھاوا بول دیا تھا۔ سسلی دو صدیوں تک ان کے قبضہ میں رہا۔ اور اٹلی کے خلاف ایک فوجی اڈے کا کام کرتا رہا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی کے دوران میں مغربی اقوام مسلمانوں کی زمین پر صلیبی جنگ لڑتی رہیں۔ ان صلیبی لڑائیوں کی یاد آئندہ نسلوں میں باقی رہی۔

زرتشت، بدھزم اور دوسرے کم ترقی یافتہ مذاہب کی کبھی اس طرح سے نفرت اور تحقیر نہیں کی گئی، جیسا کہ اسلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ قرون وسطیٰ کے مغرب کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ اور نہ انھوں نے مقابل میں آنے کی کبھی کوشش کی۔ اس لیے یہ بنیادی طور پر خوف، دشمنی اور تعصب تھا جس نے اسلام کے بارے میں مغرب کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا۔ اسلام کا عقیدہ ایک دشمن عقیدہ تھا۔ اس لیے وہ غلط نہ ہو جب بھی شبہ کی نظر سے دیکھا جانا لازمی تھا۔

پھر زبان کا روک بھی تھا مسیحیت اور دنیائے اسلام کے درمیان سیاسی اور فوجی تصادم کے چھ سو سال تک یورپ قرآن کی باقاعدہ مطالعہ کی سہولت سے محروم رہا۔ اس پوری مدت میں لاطینی زبان کا کوئی عالم یورپ میں ایسا نہیں ملتا جو عربی زبان پر بھی عبور رکھتا ہو۔ قرآن کی زبان سے اس کامل بے خبری نے قرآن کے بارے میں غلط تعارف کو پھیلنے کا موقع دے دیا۔

قرون وسطیٰ اور اس کے بعد کی مسیحیت نے جس تحریری یا زبانی ذرائع سے اسلام کے بارے میں اپنا تصور قائم کیا، وہ وہی تھا جو صلیبی جنگوں کے دوران میں وجود میں آئے یا ان ممالک کی معرفت ملے جن سے اسلام کی لڑائی پیش آ چکی تھی۔ مسیحی علماء اور پادریوں نے اسی کے ذریعہ اسلام کی تصویر بنائی۔ اسلام کی اس یورپی تصویر اور اس کی حقیقی اسلامی تصویر میں کوئی مشابہت محض اتفاق ہے۔

شام کے مشہور عیسائی عالم سینٹ جان آف دمشق (749ء) کو بازنطینی روایات کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ جان نوجوانی کی عمر میں بنوامیہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ عربی، سریانی اور یونانی زبانیں جانتا تھا اور اپنے زمانہ کے اہل علم میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کیا ہے جس میں ایک جھوٹے رسول کی پرستش ہوتی ہے۔ اس کے بیان مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آرین راہب کی سرپرستی میں بائبل کی مدد سے اپنے اصول وضع کیے۔ یہ اسلام کے متعلق عیسائیت کے قدیم اور عام تصور کی ایک مثال تھی۔ چنانچہ ڈانتے (وفات 1321ء) نے اپنی مشہور کتاب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نویں جہنم کے سپرد کر دیا جو تفرقہ پردازوں اور رسواکن اعمال کرنے والوں کے لیے مخصوص ہے (نعوذ باللہ)۔

بازنطینیوں میں پہلا شخص جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باقاعدہ ذکر کیا اور اسلام پر گفتگو کی، وہ مورخ تھیوفینس (Theophanes) ہے۔ جس کا زمانہ 818-758 ہے۔ وہ ایک

خانقاہ کا بانی بھی تھا۔ تھیوفین بغیر کسی حوالے کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ’’مشرقی باشندوں کا حکمراں اور ایک بناوٹی رسول‘‘ لکھتا ہے۔ ڈانتے کا ایک ہم عصر مسیحی جس نے بغداد کا سفر کیا تھا، اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ شیطان جب خود مشرقی ممالک میں عیسائی مذہب کی ترقی کو روک نہ سکا تو اس نے اپنی طرف سے ایک آسمانی کتاب تیار کی اور ایک ابلیس فطرت آدمی کو اپنے وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہ آسمانی کتاب قرآن اور وہ وسیلہ محمد ہیں (نعوذ باللہ)۔

عبدالمسیح بن اسحاق الکندی ایک مشرقی عیسائی تھا۔ اس کو اسپین میں ایک سیدزادہ مسلمان نے تحریری طور پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ نے عرب کے عیسائی کو موقع دیا کہ وہ عیسائیت کا دفاع کرے اور اسلام پر حملہ آور ہو۔ الکندی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شہوت پرست اور ایک قاتل کی حیثیت سے پیش کیا جن کی کتاب محض مصنوعی الہامات کا مجموعہ تھی اور جن کا مذہب دھوکے، تشدد اور نفس پرستانہ تعلیمات کی چاٹ دلا کر پھیلایا گیا (رسالات الکندی مطبوعہ قاھرہ 1912ء)۔

ان باتوں کے نتیجہ میں عیسائی دنیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کچھ ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ کوئی افسانہ خواہ کتنا ہی عجیب ہو اور اس کی کوئی اصل نہ ہو، فوراً قبول کرلیا جاتا تھا۔ قرطبہ کا ایک بشپ ایولوگیس (Eulogius) جو اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا، وہ لاطینی تحریر کے حوالے سے جو ایک عیسائی راہب نے تیار کی تھی، لکھتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کے اصحاب فرشتوں کا انتظار کر رہے تھے جو اتریں اور ان کے جسم کو اوپر لے جائیں۔ مگر اس کے بجائے کتے آئے اور ان کے جسم کھا گئے اسی لیے مسلمان ہر سال بہت بڑے پیمانے پر کتوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ ایولوگیس، اسپین کے مسلم دارالسلطنت میں رہتا تھا۔ وہ معمولی کوشش سے جان سکتا تھا کہ اس پورے افسانے میں صرف اتنی سی حقیقت ہے کہ مسلمان کتے کو ایک ناپاک جانور سمجھتے ہیں۔

لاطینی زبان سے یہ کتے کا افسانہ فرانسیسی میں پہنچا۔ چنانچہ ایک قدیم فرانسیسی نظم میں کتے

اورسور دونوں کو دکھایا گیا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کو کھا رہے ہیں۔ سور کی یہ روایت عوام میں بہت مقبول ہوئی اور قرآن میں سور کی حرمت کی بہت آسان توجیہ بن گئی (حالانکہ سور کی حرمت آپ کی وفات سے بہت پہلے کا واقعہ ہے — دروغ گورا حافظہ نباشد، مترجم)۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تابوت زمین وآسمان کے درمیان فضا میں معلق ہے۔ اورلوگوں نے اس پر یقین کرلیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں صلیبی جنگوں کے ذریعہ اسلام کو مغلوب کرنے کی کوشش جب ناکام ہوگئی تو مسیحی حلقہ میں ایک نیا رجحان ابھرا—اسلام کو تبلیغ وتحریص کے ذریعہ تباہ کیا جائے۔ بے دخلی کی کوشش کی جگہ عقیدہ کی تبلیغ نے لے لی۔ مشنری تحریک وجود میں آئی کارملی رہبانوں کا حلقہ (Carmelite Friar Order) ایک صلیبی ہی نے (1154ء) ماونٹ کارمل پر قائم کیا تھا۔ اس صلیبی کا نام (Berthold) ہے۔ اس جماعت کے لوگ سفید چغہ پہنتے تھے، اسی لیے ان کو سفید پوش رہبان (White Friars) کہا جاتا ہے۔ (مترجم) فرانسس بیکن نے اس کی پیروی کی۔ 1219ء میں سینٹ فرانسس آف اسیسی قاہرہ گئے اور فرانسس کن مشنری سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مگر اس دور کی سب سے بڑی مشنری تحریک ایک اسپینی تحریک تھی، جو ریمنڈ لل (Raymond Lull) نے شروع کی جس کا زمانہ 1315-1232ء ہے۔ لل نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کے لیے بہت دانشمندانہ نقشے بنائے جس کا مقصد مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ بحث ومناظرہ اور استدلال کے ذریعہ کامیاب ہونے کے بارے میں اس کا یقیناً آخر وقت تک قائم رہا۔ اس کی تیاری کے لیے اس نے عربی پڑھی اور اپنی خانقاہ میں اس کا درس دینا شروع کیا جو اس نے مرامر (Miramar) میں قائم کی تھی۔ اس کی عربی زبان اور اسلام سے اس کی واقفیت اس زمانہ میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھی۔ مگر ٹیونس میں اس کی مشنری سرگرمیاں ناکام ہوگئیں۔ توحید پرست مسلمانوں کے ذہن میں تثلیث کا عیسائی عقیدہ بٹھانے کی کوشش اتنی فضول

تھی کہ بالآخراس نے اسلام پر حملہ کرنا شروع کیا۔ وہ گلیوں میں نکل کر چلاتا پھرتا تھا— "عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے اور مسلمانوں کا عقیدہ غلط ہے۔" ٹیوسن میں ایک مشتعل مجمع نے اس پر حملہ کیا اور پتھر مارنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گیا۔

عیسائیت اور اسلام میں زبان کا روک پہلی بار اس وقت ٹوٹا جب فرانس میں قرآن کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔ یہ بیرونی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ تخمیناً 1141ء میں کیا گیا تھا اور اس کے کرنے والے تین عیسائی اور ایک عرب باشندہ تھا۔ اس ترجمۂ قرآن کے ساتھ ایک ضمیمہ اس عنوان کے ساتھ لگا ہوا تھا —"مسلمانوں کے عقائد کی تردید" اس کے بعد 1649 میں فرنچ مستشرق سیور ڈو ریر (Sieur du Ryer) نے اس ترجمہ کی مدد سے قرآن کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ شخص اسکندریہ میں فرانسیسی قونصل رہ چکا تھا۔ پھر اسی سال سیور ڈو ریر نے براہِ راست عربی زبان سے فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے بعد اس کو محمد کا قرآن (The Alcoran of Mahomet) کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا گیا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کا مقصد مترجم کے الفاظ میں "ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنا تھا جو ترکی کے کھوکھلے مذہب (Turkish Vanities) کے جاننے کے خواہش مند تھے۔ لفظ Mahomet خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ آکسفرڈ انگلش ڈکشنری میں اس کی اٹھارہ شکلیں بتائی گئی ہیں۔ اسی طرح Mahound کی سترہ شکلیں Mohammad کی پانچ Muhammad کو لے کر ایک ہی نام کی 41 مختلف شکلیں۔ (مصنف نے یہاں Maumet کو شمار نہیں کیا جس کی سب سے زیادہ شکلیں آکسفرڈ ڈکشنری میں بتائی گئی ہیں اور ان کو شامل کرنے کے بعد ناموں کی یہ فہرست ستر سے بھی زیادہ تک پہنچ جاتی ہے— مترجم)۔

قرآن کا یہ گمنام ترجمہ الکزنڈر روس (Alexander Ross) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اسپین میں نام نہاد مورس (Moors) کے زوال کے بعد عثمانی ترک، دشمن مذہب (اسلام) کے علم بردار نظر آرہے تھے۔ مارٹن لوتھر نے پہلے یہ خیال کیا کہ ترکوں کو مسیحیت کے گناہوں کی پاداش میں خدا کا بھیجا ہوا عذاب سمجھ کر گوارا کرنا چاہیے۔ مگر 1529ء میں جب ترک وائنا کے دروازوں تک پہنچ گئے تو اس نے اپنے ذہن کو بدل دیا اور یہ تبلیغ کی کہ ان کافروں کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کا پہلا انگریزی ترجمہ براہِ راست عربی زبان سے 1734 میں کیا گیا، اور اس کا مترجم جارج سیل (George Sale) تھا۔ سیل عیسائی علوم کی ترقی کے انجمن کا ایک رکن تھا اور اس نے شامی علما کی مدد سے عربی زبان سیکھی تھی۔ سیل کا ترجمہ انگریزی دنیا میں ڈیڑھ صدی تک چھایا رہا۔

سترہویں صدی میں ایک نیا سنگ میل پیدا ہوا جب آکسفرڈ یونیورسٹی نے عربی کی تعلیم کے لیے ایک نشست اپنے یہاں مخصوص کی۔ اور ایڈورڈ پکاک (Edward Pocock) کو 1632 میں اس منصب پر مقرر کیا۔ پکاک چھ سال تک شام میں پادری کی حیثیت سے رہ چکا تھا اور عربی میں دستگاہ اور اسلام کی براہ راست معلومات حاصل کر چکا تھا۔ آکسفرڈ میں عربی شعبہ کے کھلنے سے یورپی عربی داں پیدا ہونے کا دروازہ کھل گیا۔ پکاک خود غالباً اپنی صدی کا سب سے بڑا یورپی عربی داں تھا۔ اس نے متعدد کتابیں تصنیف یا ایڈٹ کیں۔ اس نے اپنے قارئین کو یقین دلایا کہ معلّق تابوت کا افسانہ مسلمانوں کے لیے ایک مضحکہ خیز بات ہے جس کو وہ صرف عیسائیوں کی ایجاد سمجھتے ہیں۔ اس نے مزید اس مروجہ کہانی کو چیلنج کیا کہ اسلام کے بانی نے ایک سفید کبوتر کو تربیت دے رکھا تھا۔ تا کہ وہ ان کے کندھے پر بیٹھا رہے اور کان کے اندر پڑے ہوئے دانے کو چگنے کے لیے کان میں چونچ مارتا رہے۔ اس سے وہ اپنے متبعین کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ کبوتر کے ذریعہ سے روح القدوس ان کو الہام کر رہا ہے۔ یہ افسانہ اس قدر مشہور ہوا کہ وہ انگریزی ادب میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ شکسپیئر

کے ایک کردار کی زبان سے ہم سنتے ہیں:

"We Mahomet inspired by a dove,
Thou with an angle art inspired then."

شکسپیئر سے بہت پہلے جان لڈ گیٹ اس کبوتر کا رنگ تک جانتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کبوتر کا رنگ دودھیا سفید تھا۔ پھر یہ یقین یہاں تک بڑھا کہ اٹھارہویں صدی کے ایک کبوتروں کے ماہر نے ایک خاص قسم کے کبوتر کا نام مومت (Maumet) رکھ دیا جو دراصل لفظ محمد کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کبوتر عیسائیوں کے یہاں تو روح القدس کی علامت ضرور ہے (لوقا 3:22)۔ مگر اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

اسی طرح مومٹ (Maumet) کا لفظ بت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ وہ شخص جس نے کعبہ میں سیکڑوں بتوں کو توڑا، جس کے پیرو فخر کرتے ہیں کہ وہی صرف حقیقۃً توحید پرست ہیں اور کسی قسم کے بت یا مورتی کو تسلیم نہیں کرتے، وہی شخص مغربی من گھڑت کہانیوں میں ایک خدا اور ایک بت بن گیا۔ قرون وسطیٰ کی انگریزی روایات میں مہون (Mahoun) بار بار پرستش کا ایک مظہر قرار دیا گیا ہے۔ یہ مان لیا گیا تھا کہ ترکوں اور مسلمانوں کے یہاں اس کی پوجا ہوتی تھی۔

مومٹ کی طرح قرآن بھی الکرون (Alkaron) کے نام سے مسلمانوں کا ایک بت قرار پایا۔ مغربیوں کو یقین دلایا گیا کہ مسلمان اپنے بتوں کے آگے عبادتی رسوم منعقد کرتے ہیں جن میں لوبان جلایا جاتا ہے اور نرسنگھا پھونکا جاتا ہے۔ اسی طرح سورج (Apollo) ان کا دوسرا دیوتا تھا۔ ایک فرانسیسی مصنف کے بیان کے مطابق 778ء میں شارلی مین کی فوجوں سے مسلمانوں کو ''شکست'' ہوئی تو انھوں نے اپنا غصہ سورج دیوتا پر نکالا اور اس پر پل پڑے۔ ایلزبتھ کے دور کا ایک اور نامور مصنف

فرانسس بیکن (Francis Bacon) محمد کو عطائی (Mountebank) قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنے مقالہ ''ہمت واستقلال'' (Boldness) میں نقل کیا ہے:

''محمد نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑی کو بلائیں گے اور وہ ان کے پاس چلی آئے گی۔ لوگ جمع ہوئے۔ محمد نے پہاڑی کو اپنے پاس آنے کے لیے کہا۔ وہ بار بار پکارتے رہے اور جب پہاڑی اپنی جگہ کھڑی رہی تو وہ ذرا بھی نہیں شرمائے۔ بلکہ انھوں نے کہا —''اگر پہاڑی محمد کے پاس نہیں آسکتی تو محمد تو پہاڑی تک جاسکتے ہیں''۔

Works of Francis Bacon, Vol. II, London 1929, p 279

مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں اس واقعہ کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ تاہم قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے اس خلاف اسلام انداز کو نہیں اپنایا تھا۔ صلیبی دور کا ایک بشپ، ولیم آف ٹریپولی (William of Tripoli) جس کی پیدائش شام میں ہوئی تھی۔ اس نے 1270 میں ایک رسالہ لکھا جس میں اگرچہ محمد کو وہ جھوٹے رسول کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ مگر آپ کے حالات میں دشنام طرازی اور افسانوی حصے کو بہت کم کرکے پیش کیا ہے۔ اسی طرح 1679 میں ایک انگلش پادری لانس لاٹ اڈیسن (Lancelot Addison) نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے ان من گھڑت اجزاء کو الگ کرنے کی کوشش کی جو محمد کے نام کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ بعض مواقع پر اس نے پہلے کسی واقعہ کو افسانوی تصویر کو نقل کیا ہے اور اس کے بعد تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ اڈیسن کے ایک ہم عصر ہمفری پرائیڈکس (Humphrey Prideaux) نے آپ کی مکمل سوانح حیات لکھی جس میں کبوتر کے قصہ کو اور اسی طرح دوسری بہت سی کہانیوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ان کو صحیح ماننے کے لیے کوئی واقعی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم اس سوانح حیات کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام ایک مکارانہ مذہب (Fraudulent Religion) کا معیاری

نمونہ ہے۔ یہ سوانح عمری ایک صدی تک مغربی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

زیادہ رواداری کا نقطہ نظر اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں مغرب کے عربی دانوں نے اسلام کے متعلق زیادہ قابل اعتماد ذرائع کا ترجمہ کیا۔ سیاح اور تاجر زیادہ اچھے تاثرات لے کر لوٹے اور سفیروں اور مشنری کے عہدیداروں نے بھی اضافۂ معلومات میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر جارج سینڈیز (George Sandys) جس نے قسطنطنیہ، مصر اور فلسطین کی زیارت کی تھی، وہ 1615ء میں اپنے سفر کی روداد لکھتے ہوئے مسلمانوں کی بہت سی چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ کی تعریف کرتا ہے جو عیسائیوں اور یہودی غرباء کو بھی دی جاتی تھی۔ تاہم زیادہ تر مثالوں میں لوگ ذاتی تحقیق سے زیادہ روایتی معلومات ہی پر اکتفا کرتے رہے۔ حتیٰ کہ متخصصین پروفیسروں تک کا یہ حال تھا کہ پیدائشی طور پر سنی سنائی روایات کو دہرایا کرتے تھے۔ 1784 میں پکاک کا جانشین جوزف وائٹ (Joseph White) اپنے مشہور بیمپٹن لکچرز (Bampton Lectures) میں مسیحیت کی حمایت کرتے ہوئے جب اسلام پر آیا تو محمد کے لیے اس کے پاس جو لفظ تھا وہی عام روایتی لفظ تھا یعنی مکار اور فریبی (imposter)۔ اسی طرح بعد کے ممتاز علماء مثلاً ولیم میور (اڈنبرا یونیورسٹی) ڈایسا مارگولیتھ (آکسفرڈ) ہنری لامنز (بیروت یونیورسٹی) کے یہاں بھی قدیم رجحانات کے آثار ملتے ہیں۔

مقالہ نگاروں اور مورخوں کے ہاتھوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور اسلام کا معاملہ اس سے بہتر رہا ہے جو پہلے مذہبی علماء، ناول نگاروں اور شاعروں کے ہاتھوں میں اس کا حشر ہوا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا قابل ذکر نام سائمن آکلے (Simon Ockley) کا ہے، وہ کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ اس نے مسلمانوں کی تاریخ پر دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اگر چہ کیمبرج کا یہ عالم بھی مکار (Imposter) کو محمد کے ہم لفظ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اور اسلام اور توہمات اس کے یہاں مرادف الفاظ ہیں۔ مگر مخصوص تاریخی واقعات کے بیان میں اس

نے راست گوئی سے کام لیا ہے۔ شام کی فتح کا حال بتاتے ہوئے، مثال کے طور پر، وہ بازنطینیوں کی غارت گری اور دغا بازی کا مقابلہ ابوبکر کی شجاعت اور ان کے اعلیٰ رویہ سے کرتا ہے، جن کو خلیفہ کی ہدایت تھی کہ کسی عورت یا بچہ کو قتل نہ کریں۔ کھجور کے درخت نہ کاٹیں اور نہ کھیت کو نقصان پہنچائیں۔ آکلے کی اس کتاب نے مستند درجہ حاصل کیا اور گبن کے ظہور سے پہلے تک وہ عرب تاریخ پر بنیادی ماخذ سمجھی جاتی رہی۔

اڈورڈ گبن (Edward Gibbon) جو جدید انگریزی تاریخ کا بانی ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب "سلطنت روما کا زوال" کی پانچویں جلد کے پچاسویں باب کو موضوع کے لیے مخصوص کیا ہے۔ اپنے اعتراف کے مطابق وہ "مشرقی زبانوں سے مکمل طور پر ناواقف" تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کا ماخذ وہی کتابیں تھیں جو اس سے پہلے یورپ میں لکھی گئی تھیں اور اس بنا پر اس کی ترجمانی بھی واقعہ کے مطابق نہ ہوسکی۔ تاہم اس نے بہت سی روایات کو غلط قرار دیا مثلاً اس نے کہا کہ مکار نبی کا لقب ایک خطرناک اور ناقابل اعتبار (Perilous and Slippery) چیز ہے۔

فرانس میں والٹیر (Voltaire) پیدا ہوا جو بحیثیت مورخ زیادہ محتاط تھا مگر بحیثیت المیہ نگار (Tragedian) محتاط نہیں تھا۔ اپنی تاریخی کتاب 1756 میں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر رواداری کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ محمد کا مقابلہ کرامویل (Cromwell) سے کرتا ہے۔ وہ ان کے کارناموں کو انگلینڈ کے نجات ہندہ (کرامویل) سے بہت زیادہ عظیم قرار دیتا ہے مگر اپنے المیہ (Tragedy) ناٹک 1742ء میں وہ محمد کو قرون وسطیٰ کے لباس میں مکار، ظالم، اور عیاش بنا کر پیش کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ والٹر کا اسلام پر حملہ، عمومی طور پر اس کے مخالف مذہب ہونے کا نتیجہ تھا۔ والٹر کا انحصار انگریزی آخذ پر تھا۔ خاص طور پر سیل کا ترجمہ قرآن کیوں کہ وہ انگلینڈ میں رہا تھا اور انگریزی زبان سیکھی تھی۔

والٹیر سے زیادہ جرمن شاعر گوئٹے (1749-1832) وہ شخص تھا جو جدید اسپرٹ اور

نئے بین الاقوامی نقطۂ نظر کا پیغامبر بنا۔ گوئٹے نے اپنی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالات پر ایک نظم شروع کی مگر وہ اس کو مکمل نہ کرسکا۔ گوئٹے یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ عربی پیغمبر ایک مکار شخص تھا۔ سعدی کی گلستان کے جرمن ترجمے نے خاص طور پر گوئٹے کو بہت متاثر کیا۔ 1812 میں حافظ کے کلام کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا تو گوئٹے کو اس میں حکمت، تقدس اور سلامتی نظر آئی جو اس کے خیال میں مغرب کو خاص طور پر درکار تھی۔

اسلامی کلچر کے بارے میں مغربی علماء کا بدلا ہوا نقطہ نظر جس کا آغاز انگریز اور فرانسیسی پروفیسروں نے کیا تھا اور جرمن اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے جس کو تقویت دی تھی ، وہ انیسویں صدی کے وسط تک بالکل واضح ہو گیا۔ کارلائل کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبرانہ ہیرو کے کردار کے لیے منتخب کرنا، بیک وقت نئے رجحان کی طرف اشارہ تھا۔ اور اس میں اضافہ کرنے والا بھی تھا۔ کارلائل کی کتاب میں مشکل سے کوئی ناخوشگوار فقرہ ہوگا۔ درحقیقت یہ کتاب اس لیے قابلِ تنقید ہوسکتی ہے کہ وہ غیر تنقیدی ہے۔ ”محمد ایک سازشی مکار ہیں، وہ جھوٹ کا مجسم ہیں۔ ان کا مذہب محض عطائی نسخوں کا مجموعہ ہے“— اس قسم کی باتیں کارلائل کو گوارا نہیں تھیں۔ اس کا ہیرو (محمد) واقعی ایک انسان تھا، سچا انسان۔ [۱]

---

(۱) فلپ ہٹی کے مضمون کا ماخذ درج ذیل کتابیں ہیں:

1. Latin translation in Migne Patrologiae Graecae, vol. XCIV (Paris, 1860), cols. 1585-1598; vol. XCVI (1864), cols. 1335-1348.
2. Inferno, XXVIII, 31-32
3. Theodor Bibliander, Historiae Saracenorum in Machvometis Saracenorum principis (Zurich, 1550), pp. 3-6.
4. Lydgate's Fall of Princes, ed. Henry Bergen, Part III (Washington, 1923), p. 921.
5. Romeo and Juliet, III, v, 184; I Henry IV, II, iii, 88.
6. Works of Francis Bacon, vol. II (London, 1824), p. 279.
7. The True Nature of Imposture fully Display'd in the Life of Mahomet, 8th ed. (London, 1723), p. 38.

اگلے صفحہ کا بقیہ:

عرض مترجم

اوپر جو ترجمہ نقل کیا گیا ہے، وہ بتاتا ہے کہ عیسائی حضرات نے پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے کتنی زیادہ لغو حرکتیں کی ہیں۔ مزید یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کے ساتھ کس قدر ظالمانہ سلوک کیا گیا ہے۔

خدا کے پیغمبر خالص سچائی کے علمبردار تھے۔ ان کا وجود ان لوگوں کو غیر معتبر ثابت کرنے کے ہم معنی تھا جو جھوٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبروں کو

پچھلے صفحہ کا بقیہ:

8. George Sandys, A Relation of a Journey Begun An. Dom. 1610, 2nd ed. (London, 1621), p. 57.
9. Joseph White, Sermons Preached before the University of Oxford in 1784 (Oxford, 1784), p. 171.
   For more on Islam in the literature of the West, consult Samuel C. Chew's The Crescent and the Rose (New York, 1937); Norman Daniel Islam and the West (Edinburgh, 1960); Byron P. Smith, Islam in English Literature (Beirut, 1939).
10. In Recherches de science religieuse, Vol. II (Paris, 1911), pp. 25-53, 140-166.
11. Simon Ockley, The History of the Saracens, 5th ed. (London, 1848), pp. 94 seq. Ralph Waldo Emerson commented on Ockley's account of prodigies of individual valour in his "Heroism," Essays, first series (Boston, 1861), p. 226.
12. Oeuvres complètes de Voltaire, Vol. XXIV (Paris, 1828), p. 325.
13. Oeuvres, vol. XIX (Paris, 1827), p. 443.
14. (Stuttgart, 1819), pp. 253 seq.
15. Thomas Carlyle, On Heroes, Hero-Worship and the Heroic in History (London, 1897), p. 43.

For more information on Islam in the Western literature, refer to "Islam and the West, Islam in Western Literature", pp. 48-63.

برداشت نہ کرسکے۔ انھوں نے پیغمبروں کی سخت ترین مخالفت کی اوران کے بعدان کی تاریخ کواس طرح بگاڑ ڈالا کہ کوئی شخص ان کی سیرت اوران کے پیغام کوجاننا چاہے تواس کے لیےاس کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرناممکن ہی نہ رہے۔

اوپر یورپ کے مسیحی لٹریچر کی جومثالیں، نقل کفر کفرنباشد کے اصول کے تحت درج کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی وہی سب کچھ بدترین شکل میں کیا گیا جو دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کیا گیا تھا(سورہ الحجر، 15:11)۔ آپ کے مخالفین نے آپ کی سیرت اورآپ کے پیغام کو بگاڑنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جووہ کرسکتے تھے۔

مگر یہاں دونوں کے درمیان ایک زبردست فرق ہے۔ دوسرے پیغمبروں کی سیرت اوران کے پیغام کو بگاڑنے والے بظاہر اپنے اعتبار سے کامیاب ہوگئے۔ یعنی انھوں نے بگاڑنا چاہااور عملاً بگاڑ دیا۔ چنانچہ ان سابق پیغمبروں کے بارے میں آج قرآن کے باہر کہیں صحیح تاریخی ریکارڈ نہیں ملتا۔ حتی کہ ان کی اپنی کتابوں میں بھی نہیں۔ لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں صورت حال بالکل مختلف رہی۔ یہاں مخالفین کی ساری کاروائیاں بالکل ناکام ہوکررہ گئیں۔ لوگوں کی بدترین مخالفانہ کوششوں کے باوجود، آج آپ کی تاریخ اورآپ کی لائی ہوئی تعلیمات کا متن اس طرح کامل صورت میں محفوظ ہے کہ اس سے زیادہ محفوظ اور مستند صورت موجودہ دنیا تک ممکن نہیں۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ فرق دراصل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الرسل ہونے کا عظیم الشان ثبوت ہے۔ پچھلے زمانوں میں جو پیغمبر آئے، وہ علم الٰہی کے مطابق، سلسلہ نبوت کے خاتم نہ تھے۔ ان کے بعد بھی نبیوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہنے والا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا کہ ان کے مخالفین کی معاندانہ کاروائیوں کو غیرموثر بنادے تاکہ وہ ان کی تاریخ اوران کی تعلیمات کو بگاڑنے سے عاجز رہ جائیں۔ مگر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ تھا کہ علم الٰہی کے مطابق وہ آخری رسول اور خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد پھر کوئی نبی یا رسول آنے والا نہ تھا، اس لیے ضروری تھا کہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کو کامل طور پر محفوظ رہے۔ کیوں کہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کے غیر محفوظ ہوجانے کی صورت میں دوسرے نبی کا آنا ضروری ہوجاتا۔

خاتم النبیین صرف سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے والے نہ تھے، اسی کے ساتھ آپ مخالفین حق کے لیے اس موقع کو بھی ختم کر دینے والے تھے کہ وہ پیغمبر کی سیرت اور اس کی تعلیمات کو بگاڑنے یا مٹانے میں کامیاب ہوسکیں۔ ختم نبوت لازمی طور پر حفاظت نبوت کا مقتضی ہے، اور اس کا اہتمام اللہ تعالی کی طرف سے پوری طرح کر دیا گیا ہے۔

اب پیغمبر کی آمد کا سلسلہ بلا شبہ ختم ہو چکا ہے۔ مگر خود ختم نبوت ہی کے طفیل میں مومنانِ نبوت کو ایک عظیم الشان خدائی مدد ابدی طور پر حاصل ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ پیغمبر خدا کی سچی اور بے آمیز دعوت کو لے کر اٹھیں تو مخالفین کی بڑی سے بڑی کوششیں ہباءً منثورا ہوکر رہ جائیں گی۔ دعوتِ رسالت کو بدنام کرنے یا اس کو ناکام بنانے کی ہر کوشش کا وہی انجام ہوگا جو خود ذاتِ رسالت کے معاملہ میں ہوا۔ یہ خداوند عالم کا فیصلہ ہے، اور خداوند عالم کے فیصلہ کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

ختم نبوت کا لازمی تقاضا حفاظتِ نبوت ہے، اور حفاظتِ نبوت کا لازمی تقاضہ حفاظت امت۔ یہ تینوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ ختم نبوت اس کے بغیر مکمل نہیں کہ نبوت کا ریکارڈ پوری طرح محفوظ حالت میں موجود رہے۔ اور اس عالم اسباب میں نبوت کا ریکارڈ اسی وقت محفوظ رہ سکتا ہے جب کہ ایک امت مسلسل اس کی پشت پر کھڑی ہوئی ہو۔

یہ صورت حال امت محمدی کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اب امت کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ وہ نبوت کی چوکیدار بنی رہے، جس میں نبوت کی تبلیغ واشاعت بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ اس کے بعد اغیار اور اعداء کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کا کام خود خدا کی طرف سے قیامت تک کیا جاتا رہے گا، اس کے لیے امت کو الگ سے اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔

شتم رسول کا مسئلہ

اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے — یہ ایک بے بنیاد مسئلہ ہے۔ کیوں کہ یہ حکم نہ قرآن سے ثابت ہے، اور نہ حدیث سے۔ البتہ فقہا نے بطور خود ایسے مسائل وضع کر لیے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں، شاتم کی سزا قتل، مرتد کی سزا قتل، وغیرہ۔

اس قسم کے مسائل اسلام کی اسپرٹ کے خلاف ہیں۔ اسلام کے نزدیک ایسے ایمان کی کوئی حقیقت نہیں، جو قانونی جبر کے تحت کسی نے اختیار کیا ہو۔ اسلام وہ ہے، جو قانونی جبر کے تحت نہیں، بلکہ آزادانہ طور پر اختیار کیا گیا ہو (البقرہ، 2:256)۔ اسلام کی اصل ذاتی دریافت ہے۔ ایمان وہ ہے جو سیلف ڈسکوری (self-discovery) کی بنیاد پر کھڑا ہو۔

اسلام کے مطابق، جہاں کوئی شخص "شتم" یا "ارتداد" میں مبتلا پایا جائے، تو خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے دعا کی جائے، اس سے ڈسکشن کیا جائے۔ اگر اس کے اندر کچھ شک پیدا ہوا ہے، تو اس کے شک کو علمی ڈسکشن کے ذریعے دور کیا جائے (سبا، 34:46)۔ اس کو ایک مجرم کی طرح نہ دیکھا جائے، بلکہ اس طرح دیکھا جائے، جس طرح کوئی ڈاکٹر مریض کو دیکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مقصد لوگوں کو فتویٰ دے کر قتل کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو خیر خواہی کے جذبے کے تحت اللہ کی رحمت کے سائے میں لانے کی کوشش کرنا ہے۔ اصل حقیقت کے اعتبار سے ایسے افراد کا کیس بے خبری (unawareness) کا کیس ہوتا ہے۔ داعی یا مصلح کا کام یہ ہے کہ اس کی بے خبری کو توڑا جائے، اس کی فطرت کو بیدار کیا جائے۔ اس کو اپنے خالق سے قریب ہونے کا موقع دیا جائے۔ یہ کوشش کی جائے کہ اس کے اندر توبہ کی نفسیات جاگے۔ یہ کوشش کی جائے کہ وہ اپنی اصلاح کر کے دوبارہ صراطِ مستقیم پر قائم ہو جائے۔

اسلام میں سماجی جرم (social crime) پر قتل کی سزا ہے، اسلام میں اعتقادی جرم (thought crime) پر قتل کی سزا نہیں۔

امت کا فکری زوال

ایک حدیث رسول میں بتایا گیا ہے : ”عَنْ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ رضي الله عنهما: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ “(صحیح البخاری، حدیث نمبر 3650)۔یعنی عمران بن حصین روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کا بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر وہ جو اس سے ملا ہوا ہے، پھر وہ جو اس کے بعد ہے۔

اِس حدیث رسول میں اسلام کے تین ادوار کو خیر کے ادوار کہا گیا ہے۔ اِن ادوار کو قرونِ ثلاثہ یا قرونِ مشہود لہا بالخیر کہا جاتا ہے۔ اِن تین ادوار سے مراد ہے— عہدِ رسالت، عہدِ صحابہ، عہدِ تابعین۔ اِن تین ابتدائی ادوار کی مدت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (632ء) کے بعد تقریباً ایک سو سال تک رہی۔ اِس کے بعد وہ دور شروع ہو گیا جو قرونِ مشہود لہا بالخیر کے بعد کا دور تھا۔ گویا کہ اسلام کی تاریخ میں مستند ادوار صرف ابتدائی تین ادوار ہیں۔ بعد کے ادوار کو اسلام میں مستند حیثیت حاصل نہیں۔

اِس مسئلے کی مزید تعیین کی جائے تو کہا جائے گا کہ اسلام کے ابتدائی تین ادوار میں اسلام کا فکری مرجع تمام تر قرآن تھا۔ ثانوی مرجع کے طور پر حدیث بھی اِس میں شامل ہے، کیوں کہ حدیث قرآن کی تشریح ہے۔ حدیث کے بغیر قرآن کو درست طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔ تقریباً سو سال بعد اسلام کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس کو فقہی دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر کے علاقے فتح ہوئے اور بتدریج اِس علاقے کے لوگ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ یہ لوگ اسلام سے پہلے مجوسی مذہب یا مسیحی مذہب میں شامل تھے۔ اِن تمام مذاہب میں اُس وقت ساری اہمیت صرف فارم (form) کو دی

جاتی تھی۔ اِن لوگوں نے جب اسلام قبول کیا تو اپنے قدیم مائنڈ سیٹ (mindset) کے تحت وہ یہ جاننے کی کوشش کرنے لگے کہ اسلام کا فارم کیا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب کہ اسلام کی تاریخ میں وہ شعبہ پیدا ہوا جس کو فقہ کہا جاتا ہے۔

قرآنی پیٹرن کے بجائے فقہی پیٹرن

یہیں سے مسلمانوں میں فکری ڈی ریلمنٹ (derailment) شروع ہوا۔ اگر آپ فقہی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ پائیں گے کہ فقہ میں بظاہر اسلام کی مختلف تعلیمات زیر بحث آتی ہیں، لیکن عملاً تمام فقہی بحثیں اِن تعلیمات کے فارم پر ہوتی ہیں۔ فقہ کا یہ پیٹرن اصولی بنیاد پر نہیں بنا، بلکہ حالات کے زیر اثر (situational factor) بنا ہے۔ آپ قرآن کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں سارا زور اسلام کی اسپرٹ پر دیا گیا ہے، لیکن فقہ میں ایک انتقالِ تاکید (shift of emphasis) کا واقعہ پیش آیا اور سارا زور اسپرٹ کے بجائے فارم پر دیا جانے لگا۔

دین میں اسپرٹ کے بجائے فارم کو اہمیت دینے کا یہ فقہی طریقہ بعد کے لوگوں کے لیے ایک رجحان ساز (trendsetter) واقعہ بن گیا۔ اِس کے بعد دینی موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ تقریباً سب کی سب اِسی نہج پر لکھی گئیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے — دینِ بیضا کے دینِ غیر بیضا بن جانے کا اصل سبب یہی ہے۔

فقہ کا یہ اسلوب، عملاً اہلِ علم کے درمیان عام ہوگیا۔ بعد کے اہلِ علم نے اِسی پیٹرن کو معیاری پیٹرن کی حیثیت سے اختیار کرلیا۔ وہ اِسی انداز میں سوچنے لگے اور اِسی انداز پر کتابیں لکھنے لگے۔ یہ فقہی پیٹرن اتنا زیادہ عام ہوا کہ بعد کے زمانے میں لکھی جانے والی کتابوں میں شاید کوئی بھی کتاب اِس سے مستثنیٰ نہیں۔

مثلاً ابن تیمیہ (وفات 1328ء) کی کتاب 'الصارم المسلول علی شاتم الرسول' اِسی نہج کی

ایک کتاب ہے۔ اِس کتاب میں ابن تیمیہ نے شاتمِ رسول کے لیے قتل کی سزا بتائی ہے۔ صرف اِس لیے کہ فقہا نے بعد کے زمانے میں یہ حکم وضع کیا کہ شاتم کو بطور سزا قتل کیا جائے گا (یُقتل حدًّا)۔ حالاں کہ قرآن میں اس حکم کی کوئی اصل موجود نہیں۔ ابن تیمیہ اگر کتبِ فقہ سے اوپر اٹھ کر اِس موضوع پر قرآن کی اسپرٹ کے مطابق، اِس مسئلے پر غور کرتے تو وہ لکھتے کہ شاتم کی حیثیت ایک مدعو کی ہے، شاتم کو دعوت دینا ہے، نہ کہ قتل کرنا۔ شاتم بظاہر دشمن نظر آتا ہو، تب بھی اپنی فطرت کے اعتبار سے، وہ ایک انسان ہے۔ اگر اس کے سامنے اسلام کا دین حکیمانہ انداز میں پیش کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرے اور اس کی دشمنی، قرآن کے بیان کے مطابق، دوستی میں تبدیل ہو جائے (41:34)۔

اِس طرح کی ایک مثال شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات 1762ء) کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغۃ ہے۔ اِس کتاب کا ٹائٹل بظاہر قرآن کی ایک آیت (6:149) سے ماخوذ ہے۔ مگر عملاً یہ کتاب قرآنی پیٹرن پر نہیں لکھی گئی ہے، بلکہ فقہی پیٹرن پر لکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کتاب کے تمام مباحث فقہی اسلوب پر مبنی ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں سُترہ سے لے کر جہاد تک کے تمام ابواب موجود ہیں، لیکن اِس میں دعوت الی اللہ کا باب موجود نہیں۔ حالاں کہ اگر مصنف، قرآن کے اسلوب کی چھان بین کرتے تو یقیناً وہ اِس حقیقت کو دریافت کر لیتے کہ قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت دعوت الی اللہ کو دی گئی ہے۔ قرآن پورا کا پورا ایک کتابِ دعوت ہے۔

مقصدِ تخلیق

اس فکری ڈی ریلمنٹ کا سبب کیا ہے۔ اس کو اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے ایک واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے ایک گورنر عدی بن ارطاۃ نے ان کو لکھا — لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اِس کے نتیجے میں حکومت کے مالیہ میں کمی ہو جائے گی۔ اِس کا جواب خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے اِن الفاظ میں دیا: واللّٰہِ لَوَدِدْتُ أَنَّ

النَّاسَ كُلَّهُمْ أَسْلَمُوا حتّى نَكُونَ أناوَأنتَ حَرَّاثَيْنِ نَأكُلُ مِن كَسْبِ أَيْدِينَا" (سيرۃ عمر بن عبدالعزیزلابن الجوزی، صفحہ 124)۔یعنی خدا کی قسم، مجھے یہ پسند ہے کہ سارے لوگ اسلام قبول کرلیں، یہاں تک کہ میں اورتم دونوں کاشت کار بن جائیں اور اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنا رزق حاصل کریں۔

مذکورہ واقعہ کاایک پہلو یہ تھا کہ کثرتِ اسلام سے حکومت کی مالی آمدنی کم ہورہی تھی۔ اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ پیغمبر کا اصل مشن یہی تھا کہ لوگوں کوسچائی ملے۔خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے دونوں پہلوؤں کو الگ کرکے دیکھا، اس لیے وہ ایک واضح اور درست رائے تک پہنچ گئے۔

اِس کے برعکس، ان کے گورنر کا حال یہ تھا کہ اُس کے کلام میں مادّی مفاد کی اہمیت موجود تھی،لیکن اُس کے کلام میں یہ اہمیت مفقود تھی کہ لوگوں کوسچائی ملے۔خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اسلام میں کس چیز کواصل اہمیت حاصل ہے۔وہ یہی ہے کہ اپنے اندر مومنانہ شخصیت کی تعمیر کی جائے اور دوسروں کواللہ کا پیغام پہنچایا جائے۔

بعد کے دور میں جوفکری زوال پیدا ہوا، اس کا اصل سبب یہ تھا کہ فقہی تعبیرات کے درمیان عملاً یہ حقیقت گم ہوگئی کہ انسان کی تخلیق کا مقصد (purpose of life) کیا ہے۔ اِس کوختم کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان کے مقصدِ تخلیق کوفوکس کیا جائے۔مقصدِ تخلیق کے تعین کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ مسلم ملّت کا ذہنی فوکس بدلے اور وہ تمام انسانوں کو دوست و دشمن اور شاتم وغیر شاتم کے اعتبار سے دیکھنے کے بجائے خدا کے تخلیقی منصوبہ کے اعتبار سے دیکھنے لگیں۔

یہ اسلام نہیں

بنگلور کے انگریزی اخبار دکن ہرالڈ نے اپنے سنڈے اڈیشن 7 ستمبر 1986 میں پی کے این نمبو دری کے نام سے ایک کہانی چھاپی۔ اس کا عنوان (نقل کفر کفر نباشد) یہ تھا:

"Mohammad, the Idiot"

یہ عنوان بلا شبہ لغو ہے۔ مگر اس کے جواب میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ بھی یکساں طور پر لغو ہے۔ وہ اس مضمون کو دیکھ کر مشتعل ہو گئے۔ انھوں نے اخبار مذکور کے دفتر پر دھاوا بول دیا اور اس کے گودام کو جلا ڈالا جس میں ایک کرور روپیہ کا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ان مسلمانوں نے اپنے اس عمل کو اسلامی جہاد کا نام دیا ہے۔ مگر یہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اس قسم کا ہر فعل مسلمانوں کی قومی اُدھم بازی ہے، نہ کہ وہ مقدس عمل جس کو قرآن وحدیث میں جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔

مذکورہ اخبار نے جو بے ہودہ گوئی کی وہ اسلامی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں۔ موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو امتحان کی آزادی عطا کی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات عین اس وقت سے پیش آرہے ہیں جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس دنیا میں موجود تھے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ آپ نے جب عربوں کے سامنے پیغمبرانہ دعوت پیش کی تو انہوں نے آپ کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ انھوں نے آپ کو عملی طور پر ستانے کے علاوہ آپ پر طرح طرح کے برے القاب چسپاں کیے۔ ان میں سے چند القاب قرآن کے مطابق، نعوذ باللہ، یہ تھے:

متقوّل (52:33) : بات بنانے والا

مجنون (81:22) : دیوانہ

ساحر (10:2) : جادوگر

کذّاب (38:4) : بہت جھوٹ بولنے والا

مذکورہ مسلمان اگر واقعۃً "اسلامی جہاد" کرنا چاہتے تھے تو ان کا فرض تھا کہ سب سے پہلے قرآن اور حدیث اور سیرت کو دیکھ کر معلوم کرتے کہ اس طرح کی صورتِ حال جب دورِ اول میں پیش آئی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس معاملہ میں کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ اور پھر وہی کرتے جو رسول اور اصحاب رسول کے نمونہ سے ثابت ہورہا ہو۔ سیرتِ رسول اور اسوۂ صحابہ سے بے نیاز ہو کر موجودہ قسم کا اشتعال انگیز کارروائی اپنے نفس کا اتباع ہے، نہ کہ خدا اور رسول کا اتباع۔

جب ہم اس اعتبار سے دور اول کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کی گستاخی کرنے والے غیر مسلموں کے خلاف کبھی بھی اس طرح کی کاروائی نہیں کی گئی جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے کی یا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف صحابہ نے نہ جلوس نکالا، نہ ان کے گھروں اور جائدادوں کو جلایا۔ اور نہ ان کے خلاف نعرہ بازی کا ہنگامہ کھڑا کیا۔ اس کے بجائے جو کچھ کیا گیا وہ صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے حق میں ہدایت کی دعائیں کی گئیں۔ اور دلیل کے ذریعے ان کی بات کی تردید کی گئی۔ اس سے آگے ان کا سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دیا گیا۔

رسول اور اصحاب رسول کا یہ نمونہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ہم ایسے لوگوں کے حق میں اصلاح اور ہدایت کی دعا کریں۔ ان سے ملاقات کر کے پروقار طریقہ سے ان کی غلط فہمی کو دور کریں۔ سنجیدہ اور علمی انداز میں وضاحتی مضامین لکھ کر اخبارات میں شائع کرائیں۔ یہی واحد کام ہے جو مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس کے سوا مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے، نہ کہ خدا کی رحمت کا مستحق بنانے والا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا کے لیے رحمت بنا کر

بھیجا ہے، نہ کہ دنیا کو جلانے اور پھونکنے والا بنا کر۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے اس مزاج کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے ان سے ایک عظیم نعمت کو چھین لیا۔ اور وہ داعیانہ کلام کی صلاحیت ہے۔ داعی اپنی قوم کا ناصح ہوتا ہے۔ داعیانہ کلام مخاطب کے لیے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ سے نکلتا ہے۔ مگر جب مسلمانوں کا حال یہ ہو کہ وہ بات بات پر بھڑک اٹھیں تو ان کا دل دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور بیزاری کے جذبہ سے بھر جائے گا۔ ان کے اندر وہ معتدل نفسیات باقی ہی نہ رہے گی جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ کسی کے سامنے سنجیدہ اور مدلل انداز میں خدا کے رسول کا پیغام پیش کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جشنِ رسالت کی دھوم کے باوجود تبلیغ رسالت کا کام ٹھپ پڑا ہوا ہے۔ پیغمبر اسلام کے بعد آپ کی امت پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ آپ کی خدائی پیغام کو خدا کے تمام بندوں تک پہنچائے۔ مگر پیغام رسالت کو دوسری قوموں تک پہنچانے کے لیے دوسری قوموں کی سچی خیر خواہی درکار ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے منفی مزاج کے نتیجہ میں پہلے ہی اس کو کھو چکے ہیں۔

جہاد یا سرکشی

بنگلور کے انگریزی اخبار دکن ہرالڈ (7 ستمبر 1986) نے ایک کہانی چھاپی جس میں پیغمبر اسلام کے خلاف گستاخی کا پہلو پایا جاتا تھا۔ اس پر مقامی مسلمان بگڑ گئے۔ انھوں نے اخبار کے گودام جلا ڈالا جس میں ایک کرور روپیہ کا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پاکستان کے انگریزی اخبار فرنٹیر پوسٹ (9 جنوری 1987) میں کسی مغربی پرچہ سے ایک مضمون نقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ آدم اور ہوا کی ایک تصویر تھی وہ بھی فرنیٹر میل میں چھپ گئی۔ اس کے بعد ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں بپھرے ہوئے مسلمانوں نے اخبار کی وسیع عمارت کو گھیر لیا اور اس کو سازوسامان سمیت جلا کر خاکستر کر دیا۔

اس قسم کے واقعات ایک یا دوسری شکل میں ہر ملک میں ہو رہے ہیں جہاں مسلمانوں کو عمل کی آزادی حاصل ہے۔ مسلمان اپنی ملی ہوئی آزادی کو اسی قسم کی تخریب کاری میں استعمال کر رہے ہیں اور اس کا نام انھوں نے اسلامی جہاد رکھا ہے۔

اس قسم کا ہر عمل بلا شبہ غیر اسلامی عمل ہے۔ یہ جہاد نہیں بلکہ سرکشی ہے اور سرکشی اللہ تعالیٰ کے یہاں بدترین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معاملہ کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجیے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ :أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم أُتِيَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ فَقَالَ:اضْرِبُوهُ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ : فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهِ، وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهِ، وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهِ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لِأَصْحَابِهِ: بَكِّتُوهُ فَأَقْبَلُوا عَلَيْهِ يَقُولُونَ: مَا اتَّقَيْتَ اللّٰهَ، مَا خَشِيتَ اللّٰهَ، وَمَا اسْتَحْيَيْتَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَلَمَّا انْصَرَفَ، قَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: أَخْزَاكَ اللّٰهُ. فَقَالَ

رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لَا تَقُولُوا هَكَذَا، لَا تُعِينُوا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ، وَلَكِنْ قُولُوا اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، اللَّهُمَّ ارْحَمْهُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 4477-4478)۔ یعنی، حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ آپ نے فرمایا اس کو مارو۔ پس ہم میں سے کوئی شخص اس کو ہاتھ سے مارنے لگا اور کوئی شخص کپڑے سے اور کوئی شخص جوتے سے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس کو عار دلاؤ۔ پس لوگ کہنے لگے کیا تم کو ڈر نہیں، کیا تم کو اللہ کا خوف نہیں، کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم نہیں آئی۔ پھر حاضرین میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ تمہیں رسوا کرے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اس طرح مت کہو۔ اس کے مقابلہ میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔ بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ اس پر رحم فرما۔

اس حدیث سے سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ صحابہ کرام نے جب ایک شاربِ خمر کو دیکھا تو وہ خود اس کو مارنے نہیں لگے۔ بلکہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے جو اس وقت مدینہ میں صاحبِ اَمر (ruler) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر ایک ایسا فعل کرے جو ثابت شدہ شرعی جرم کی حیثیت رکھتا ہو تب بھی عوام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بطور خود اس پر مقررہ سزا کا نفاذ شروع کردیں۔ سزا کے نفاذ کا حق صرف صاحبِ امر کو ہے۔ اور اسی طرف معاملہ کو لوٹایا جانا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ ثابت شدہ مجرم کو سزا دینے کا کام بھی خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کو صرف "سزا" دی جائے، اس کو "ذلیل" نہ کیا جائے۔ کوئی بھی قولی یا عملی روش جو

ذلیل کرنے کے ہم معنی ہو وہ مجرم کے اندر منفی نفسیات پیدا کرے گی۔ مجرم کو سزا دینے کے ساتھ ذلیل ورسوا کرنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ وہ دین اور اہلِ دین سے متنفر ہو جائے۔ اس طرح کی روش کے نتیجہ میں اس کے اندر ضد اور نفرت کا جذبہ بھڑک اٹھے گا۔ اس سے پہلے اگر وہ حق سے ایک قدم دور تھا تو اب وہ اس سے سو قدم دور ہو جائے گا۔ شیطان اس کے اندر مخالفانہ جذبات بھڑکا کر اس کو اپنا شکار بنالے گا۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ کسی جرم کی شرعی سزا وہی ہے جو کتاب وسنت سے ثابت ہو۔ اس کے سوا کوئی اور سزا دینا یقینی طور پر فعلِ حرام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً شاربِ خمر کے لیے اگر شریعت میں یہ سزا مقرر کی گئی ہے کہ اس آدمی کو مارا جائے جس نے شراب پی ہے تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ شاربِ خمر کے بھائی بہنوں کو مارنے لگے، یا وہ شاربِ خمر کا گھر جلانے لگے، یا وہ اس کے کارخانے کو لوٹنا شروع کردے۔

سزا نافذ کرنے والے ادارہ کا کام صرف یہ ہے کہ جب ایسا کوئی کیس سامنے آئے تو وہ تحقیق کرے۔ جب تحقیق اور شہادت سے ثابت ہو جائے کہ متعلقہ شخص فی الواقع مجرم ہے تو ایسے جرم کے لیے شریعت کی مقررہ سزا ہے اس کو اس شخص پر نافذ کرے۔ کوئی دوسری سزا نافذ کرنا شریعت کی تعمیل نہیں بلکہ شریعت سے بغاوت ہے۔ ایسا شخص خود سب سے بڑا مجرم ہے، اس کو حق نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو مجرم قرار دے کر اس کے اوپر اپنی خودساختہ سزا کا نفاذ کرنے لگے۔

زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب نے یہ دستور بنا رکھا تھا کہ وہ اونچے خاندان کے مجرم اور نیچے خاندان کے مجرم کے درمیان سزائیں فرق کرتے تھے۔ اس پر قرآن میں قصاص کی آیت (2:178) اُتاری گئی ۔ اس میں کہا گیا کہ اے ایمان والو، تم پر مقتولین کے

معاملے میں برابری اور مساوات کو فرض کیا گیا ہے۔ سزائے قتل کے معاملہ میں جو لوگ قصاص (برابری) کے شرعی اصول کو اختیار نہ کریں۔ یا مثلاً معافی اور دیت قبول کرنے کے بعد مزید یہ کریں کہ وہ قاتل کو قتل کر ڈالیں تو یہ اعتداء (زیادتی) ہے۔ اور اس قسم کا اعتداء کرنے والوں کے لیے خدا کے یہاں دردناک عذاب ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص قتل کیا جائے تو اس کے وارثوں کے لیے تین میں سے ایک چیز ہے۔ قصاص، یا معاف کر دینا، یا دیت لینا۔ اس کے بعد اگر وہ کوئی چوتھی چیز چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ جو اس کے بعد بھی زیادتی کرے تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا: وَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ نَارُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4496)۔

اس حکمِ شریعت کے مطابق جرم اور سزا میں برابری ہونا ضروری ہے۔ کسی مجرم کو حدِ شرعی سے زیادہ سزا دینا یا مقررہ سزا کے سوا کوئی اور سزا دینا سراسر حرام ہے۔ ایک شخص سے کوئی شرعی جرم سرزد ہو تو خود مجرم پر شرعی سزا کا نفاذ کیا جائے گا۔ اس کے بجائے اگر اس کے ہم قوموں کو مارا جانا لگے یا مجرم کی جائیداد کو تباہ کیا جائے تو یہ سراسر حرام ہے۔ جو لوگ ایسا کریں یا جو لوگ ایسا کرنے والوں کی حمایت کریں حتیٰ کہ جو لوگ ایسے فعل کو دیکھ کر خاموش رہیں وہ اپنے آپ کو اس خطرہ میں مبتلا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی سخت ترین باز پُرس کی جائے۔

ملک کا اقتدار اگر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن سے یہ امید نہ ہو کہ وہ مجرم کے اوپر شرعی سزا کا نفاذ کریں گے تب بھی مسلمانوں کے لیے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا جائز نہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کے لیے نصیحت اور صبر ہے، نہ کہ سزا کا نفاذ۔ یہ اصول مکّی دور کے عمل سے ثابت ہے۔ اس وقت مکہ کے لوگ کھلے طور پر شراب پیتے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب نے ان پر حد جاری کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حد کا نفاذ اقتدار ملنے کے بعد کیا گیا۔

جذبات کا اعتبار نہیں

اس طرح کے مواقع پر عام طور پر یہ بات کہی جاتی کہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ مگر مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کسی قوم کے جذبات کا مجروح ہونا شریعت میں ہرگز معتبر نہیں۔ یہ شریعت کے حدود و تعزیرات کی کوئی دفعہ نہیں۔ اس قسم کی باتوں کا حوالہ دے کر کسی کو مارنا یا کسی کی جائداد کو جلانا دہرا سرکشی ہے۔ یہ اسلام کی حدود و تعزیرات کی فہرست میں ایک نئے حکم کا اضافہ کرنا ہے جس کا کسی بھی شخص کو کوئی اختیار نہیں۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ اس قسم کی ناخوشگوار باتوں پر صبر کرتے ہوئے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں۔ اس کے سوا وہ جو کچھ بھی کریں گے وہ صرف ان کے اپنے جرم میں اضافہ کرنے والا ثابت ہوگا، نہ کہ دوسروں کے حق میں اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو ادا کرنا۔

دوسرا باب

رشدی کی کہانی

17 فروری 1989 کی صبح جو اخبارات آئے، ان سب کے صفحہ اول پر یہ سنسنی خیز خبر تھی ایران کے شیعہ رہنما آیت اللہ خمینی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ شیطانی آیت (The Satanic Verses) مصنف سلمان رشدی (42 سال) کو قتل کر دیں۔ اسی کے ساتھ ایرانی حکومت نے قتل کرنے والے کے لیے انعام کا بھی اعلان کیا۔ ٹائمس آف انڈیا (17 فروری 1989) کے مطابق قتل کرنے والا اگر ایرانی ہے تو اس کو 26 لاکھ ڈالر ($2.6 million) دیے جائیں گے اور اگر قتل کرنے والا غیر ایرانی تو اس کو 10 لاکھ ڈالر ($1 million) ملے گا۔ ایران کے خود ساختہ لغت میں اسلام بھی ایرانی اور غیر ایرانی ہو گیا۔

19 فروری کے اخبارات یہ خبر لائے کہ سلمان رشدی نے لندن میں ایک بیان جاری کرکے اس کے بارے میں معافی مانگ لی ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ:

> "Living in world of many faiths, the experience had served to remind us that we must all be conscious of the sensibilities of others."

اگلے دن 20 فروری 1989 کو دوبارہ اخبارات نے بتایا کہ ایران کے مذہبی پیشوا آیت اللہ خمینی نے اعلان کیا ہے کہ سلمان رشدی کو معافی مانگنے کے باوجود بخشا نہیں جائے گا۔ ٹائمس آف انڈیا (20 فروری) کے مطابق انھوں نے کہا:

> "Even if Salman Rushdie repents and becomes the most pious man, it is incombent on every Muslim to employ everything he's got, his life and wealth , to send him to hell."

قومی آواز (23فروری 1989) کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ مزید خبروں کے مطابق سنّی علماء بھی اس ایرانی جہاد میں مکمل طور پر شریک ہو گئے ہیں۔ اردو روزنامہ قومی آواز (20فروری 1989) کے مطابق، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ناظم مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے ایک بیان میں ایرانی پیشوا آیت اللہ خمینی کے فرمان کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مصنف نے مذہب اسلام کی سخت توہین کی ہے جس سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ امام خمینی کے فرمان پر مسلمان اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں۔ مولانا ندوی نے کہا کہ اسلام میں پیغمبر اسلام کی توہین کے مجرم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ مسلم علماء اور مفتی اس معاملے میں متفق ہیں (صفحہ 1)۔

اس کے بعد اخباری بیانوں، خطوط اور مضامین کا لمبا سلسلہ چل پڑا۔ ہر لکھنے اور بولنے والا مسلمان بڑھ چڑھ کر پُر جوش الفاظ کا مظاہرہ کر رہا تھا اور سلمان رشدی کے قتل سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھا۔ تاہم اس لفظی جہاد میں زیادہ تر ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان شریک تھے۔ لندن کی سڑکوں پر جو مظاہرے ہوئے اس کے پیچھے بھی انھیں ملکوں کے مسلمان شریک تھے۔ بقیہ مسلم دنیا نے اس نام نہاد جہاد میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا۔ حتّٰی کہ آیت اللہ خمینی کو چھوڑ کر، خود ایرانی قوم بھی بحیثیت مجموعی اس مہم میں شریک نہ ہو سکی۔

قومی آواز (23فروری 1989) کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ مکہ میں علماء اسلام کی ایک میٹنگ کے بعد رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے ایک بیان میں کہا کہ سلمان رشدی مرتد ہے، اور اسلام میں اس جرم کی سزا موت ہے۔ انھوں نے یہ اپیل کی کہ سلمان رشدی کی عدم موجودگی میں کسی اسلامی ملک میں مقدمہ چلایا جائے۔ ڈاکٹر نصیف نے کہا کہ رشدی نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کو تحریر کی آزادی نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ یہ ایک زبانی مجرمانہ حملہ ہے۔ سلمان رشدی مرتد ہے اور شریعت کے مطابق

ارتداد کے جرم کی سزا موت ہے۔تاہم رابطہ نے اس رسمی بیان کے سوا اس مہم میں اور قابل ذکر سرگرمی نہیں دکھائی۔

7 مارچ 1989 کو حکومت ایران نے برطانیہ سے اپنے سفارتی تعلقات ختم کر دیے اور اپنے تمام سفارتی عملہ کو لندن سے واپس بلا لیا۔(ٹائمس آف انڈیا 8 مارچ 1989)

جوابی انعام

ٹائمس آف انڈیا (20 فروری 1989، سکشن 2، صفحہ 1) پر ایک خبر اس عنوان کے ساتھ چھپی:

"For a Civilised Khomeini"

خبر میں کہا گیا تھا کہ لندن کے ایک بڑے اخبار کے مالک رابرٹ میکسول نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو شخص آیت اللہ خمینی کو مہذب انسان بنانے کا کام انجام دے، وہ اس کو بطور انعام 106 لاکھ ڈالر ($10.6 million) ادا کریں گے۔ان کا یہ اعلان لندن کے ہفتہ وار اخبار پیپل (People) میں چھپا ہے۔اعلان کے مطابق یہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو ایرانی لیڈر کو اپنی غلطی کے اعتراف پر آمادہ کرے اور ان کو اس پر راضی کرے کہ وہ عوام کے سامنے بائبل کے احکام عشرہ میں چھٹا اور نواں حکم پڑھ کر سنائیں جو کہ یہ ہے—تم خون نہ کرنا، تم جھوٹی گواہی نہ دینا:

> The British newspaper magnate Mr. Robert Maxwell had pledged 16 million ($10.6 million) as a reward to anyone who could "civilise" Ayatollah Khomeini, the Iranian ruler. "The People," a London weekly tabloid, stated that the money would be given to anyone who could convince Ayatollah Khomeini to repent and publicly recite the sixth and ninth commandments from the

Christian Bible, which are "Thou shalt not kill" and "Thou shalt not bear false witness."

رابرٹ میکسول کا یہ بیان حقیقۃً ایک طنز تھا۔ اس کا مقصد بالواسطہ طور پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسلام قتل اور خون کا مذہب ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسیحیت رحم اور رواداری کا مذہب۔

اسلام کی تصویر بگاڑنا

ٹائم میگزین (27 فروری 1989) کی کور اسٹوری آیت اللہ خمینی کے بارے میں ہے۔ اس کے صفحہ اول پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ آیت اللہ ایک مصنف کی مذمت کرتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ کتاب "شیطانی آیات" اسلام کے خلاف ہے، خمینی اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ سلمان رشدی کو قتل کر دیا جائے:

The Ayatullah condemns an auther: Saying the book " The Satanic Verses" is aganist Islam. Khomeini calls for the death of Salman Rushdie.

ٹائم نے اپنی رپورٹ میں جو باتیں درج کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مغرب کے سیاسی لیڈروں نے اس بات پر سخت غصہ کا اظہار کیا ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک کے شہری کے لیے قتل کی سزا کا اعلان کرے۔ اس واقعہ کے بعد مغربی حلقوں میں یہ سوال اٹھ گیا ہے کہ آزاد معاشرے اپنے کو اور اپنے شہریوں کو تخویف کی ایسی شدید اور سیمابی صورت سے کس طرح بچا سکتے ہیں:

It raised concerns about how free societies can effectively protect themselves and their citizens against such intense and unpredictable intimidation (p. 6).

ٹائم نے اہل مغرب کے جس تاثر کا ذکر کیا ہے اس کی زد بالواسطہ اعتبار سے اسلام پر پڑتی ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جو لوگ اپنے یہاں آزادانہ آمدورفت کا ماحول قائم کیے ہوئے ہیں، وہ اس بات کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ اسلام کا ان کے معاشرے میں آنا، ان کی زندگیوں کے لیے زبردست خطرہ ہے۔ کیونکہ مہذب سماج میں غیر مہذب انسانوں کے داخلہ کے ہم معنی ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اسلام جو امن کا دین تھا اور جس کے پیغمبر کو رحمتِ عالم کہا گیا تھا، اس کی تصویر ایسی بنا دی جائے کہ اس کی قربت سے لوگوں کو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہونے لگے۔

ریاض کانفرنس کا فیصلہ

14-16 مارچ 1989 کو ریاض میں تنظیم اسلامی کانفرنس (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کا اجتماع ہوا۔ اس میں 46 مسلم ملکوں کے وزرائے خارجہ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے ایجنڈے پر افغانستان کے مسئلہ کے بعد دوسرا سب سے زیادہ حسّاس مسئلہ سلمان رشدی کے معاملہ پر اپنا فیصلہ دینا تھا۔ سعودی حکمراں شاہ فہد کی تقریر سے اس کا افتتاح ہوا۔ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر چند روزہ بحث کے بعد 16 مارچ 1989 کو مسلم ممالک کے نمائندوں نے اپنا متفقہ فیصلہ دے دیا۔

اس فیصلہ کے مطابق، 46 ملکوں کی تنظیم اسلامی کانفرنس کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں ایران کے واحد اختلاف کے ساتھ "شیطانی آیات" کے مصنف سلمان رشدی کے خلاف آیت اللہ خمینی کے موت کے فتویٰ کو سختی سے مسترد کر دیا گیا۔ سفارت کاروں نے ایرانی فتویٰ کو مسترد کیے جانے کو انتہائی اقدام قرار دیا۔ کانفرس نے سلمان رشدی کے ناول کو اسلام کی اہانت کرنے والی کتاب قرار دیتے ہوئے عالمی برادری سے اپیل کی کہ وہ

مختلف مذاہب کے پیشواؤں کی دل آزادی نہ کریں۔سعودی عرب کے شاہ فہد نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو عفو درگذر سے کام لینا چاہیے۔اور غلط کاروں کو توبہ کرنے کا موقع دینا چاہیے۔انھوں نے اس طرح کے معاملات میں اعتدال پسندی کی تلقین کی(قومی آواز 17 مارچ 1989)۔

اس فیصلہ سے یہ ظاہر ہو گیا کہ رشدی کے قتل کے فیصلہ میں ایران کی نام نہاد اسلامی حکومت تنہا ہے۔ بقیہ تمام مسلم ممالک، سرکاری سطح پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ رشدی نے اگرچہ انتہائی قابلِ اعتراض کتاب لکھی ہے، اس کے باوجود یہ صحیح نہیں کہ مذہبی فتویٰ جاری کر کے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اکسایا جائے کہ جہاں پائیں قتل کر دیں۔سلمان رشدی کا جواب ہمیں پرامن ذرائع سے دینا چاہیے، نہ کہ بم اور گولی سے۔

ایک مغالطہ

سلمان رشدی کے بارے میں قتل کی وکالت کرنے والے جو مضامین شائع ہوئے، ان میں عام طور پر یہ الفاظ تھے کہ رشدی نے دنیا کے ایک بلین مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ یہ الفاظ بلاشبہ خلاف واقعہ ہیں۔اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سلسلے میں جتنے خطوط اور مضامین چھپے ہیں وہ 99 فی صد سے زیادہ ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کے "اردوخواں" مسلمان ہیں جنھوں نے اس معاملہ میں پُرشور حصہ لیا۔حتیٰ کہ بیرونی ملکوں میں جو مظاہرے ہوئے ہیں وہ بھی عملاً وہاں بسنے والے ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کی طرف سے تھے۔ ان ملکوں میں عرب ممالک یا دوسرے ملکوں کے جو مسلمان آباد ہیں انھوں نے اس میں عملاً اتنا کم حصہ لیا ہے کہ وہ تقریباً نہیں کے برابر ہے۔

مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (3 اپریل 1989) میں آخری صفحہ کے نیچے ایک خبر

ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ برطانیہ میں شیطانی آیات کے خلاف شورش تیز تر:

"Anti Verses Stir Intensified in the U.K."

خبر میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ کے مسلمانوں نے طے کیا ہے کہ وہ شیطانی آیات کے خلاف ایجی ٹیشن کو تیز تر کر دیں۔ حتیٰ کہ اس معاملہ میں وہ برطانی قانون کو توڑ کر بھی اپنی مہم کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد خبر میں بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر کلیم صدیقی نے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے تحت ہونے والی ایک کانفرنس میں اس بات کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر کلیم صدیقی کون ہیں۔ یہ ہندستان کے ایک "اردوداں" مسلمان ہیں جو ہندستان سے جا کر لندن میں آباد ہو گئے ہیں۔ (18 اپریل 1996 کو ان کا انتقال ہو گیا)۔

28 مئی 1989 کو رشدی کی کتاب کے خلاف لندن میں مظاہرہ کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً 20 ہزار مسلمان اس میں شریک تھے۔ ان لوگوں نے تشدد اور توڑ پھوڑ بھی کیا۔ یہ مظاہرہ بھی برصغیر ہند کے ان لوگوں کی طرف سے تھا جو انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ اس کے لیڈر معین الدین چودھری تھے جو اصلاً بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں (قومی آواز 29 مئی 1989)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو بیرونی ملکوں میں مسلمانانِ عالم کے نام پر اس احتجاجی مہم کی قیادت کر رہے ہیں۔ یہ دراصل ہندوستان اور پاکستان کے کچھ مسلمان ہیں، نہ کہ ساری دنیا کے مسلمان۔

اس سلسلہ میں جو خبریں آتی رہی ہیں ان میں اب تک عرب یا ترکی یا ملیشیا یا انڈونیشیا جیسے ملک کے لوگوں کا نام نہیں آیا ہے جو اس قسم کے مظاہرے اور ایجی ٹیشن میں سرگرم حصہ لے رہے ہوں۔ حتیٰ کہ خود ہندوستان، پاکستان میں بھی صرف وہ لوگ اس مہم میں آگے ہیں جن کو ہم نے "اردوداں" مسلماں کہا ہے۔ خود اس علاقہ کے غیر اردوداں (مثلاً جنوبی ہند کے مسلمان) اب تک اس مہم میں کسی قابل لحاظ حیثیت میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ واقعہ ثابت

کررہا ہے کہ یہ مہم سارے عالم اسلام کی مہم نہیں ہے۔ بلکہ عالم اسلام کی ایک محدود اقلیت کی مہم ہے جس نے غیر واقعی طور پر اپنے آپ کو اسلام کا واحد ٹھیکیدار سمجھ لیا ہے۔

مضحکہ خیز ردّ عمل

سلمان رشدی کی کتاب بلا شبہ لغو ہے (ملاحظہ ہو زیر نظر کتاب کا موضوع، "سورج پر خاک")۔ مگر شیعہ اور سنی علماء کا مذکورہ ردّ عمل بلا شبہ اس سے بھی زیادہ لغو ہے۔ سلمان رشدی نے اگر پیغمبر اسلام کی توہین کی تھی تو آیت اللہ خمینی اور ان کے ہم نوا علماء اسلام کی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انھوں نے دنیا کی نظر میں اسلام کی یہ تصویر پیش کی ہے کہ وہ ایک وحشی اور غیر مہذب دین ہے۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب سیکولرزم کے نام پر لکھی تھی مگر شیعہ اور سنی علماء اپنا ردّ عمل اسلام کے نام پر ظاہر کررہے ہیں۔ رشدی نے سیکولرزم کو بدنام کیا تھا، شیعہ اور سنی علماء نے اسلام کو ساری دنیا میں بدنام کر دیا۔

توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم (شتم رسول) پر فقہاء نے جو سزا مقرر کی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب بھی کسی کو محسوس ہو کہ فلاں شخص نے پیغمبر کی توہین کی ہے تو وہ فوراً بندوق ہاتھ میں لے اور وہاں پہنچ کر اسے گولی مار دے۔ اسلام میں جرم کا معاملہ ایک عدالتی معاملہ ہے۔ یعنی مجرم ہاتھ کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے اور عدالتی کارروائی کے بعد اس پر ضروری فیصلہ کا نفاذ کیا جائے گا۔ عدالتی کارروائی کے بغیر اگر کوئی شخص کسی مجرم کو سزا دینے لگے تو یہ ایک سرکشی کا فعل ہے، نہ کہ اسلام کا فعل۔

مزید یہ کہ توہین رسول کی سزا کا معاملہ کوئی مطلق معاملہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب بھی کوئی شخص توہین رسول کا مرتکب ہو تو لازماً اس کو قتل کر دیا جائے یا اس کے قتل پر انعام کا اعلان کر دیا جائے۔ اسلام کی پوری تاریخ میں ایسا کبھی نہیں کیا گیا۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم قائدین ہیں جو اس قسم کے بیانات جاری کر کے اسلام کو دنیا کی نظر میں مضحکہ بنا رہے ہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سرکشی ہے، نہ کہ اسلام کی تعمیل۔

سورج پر خاک

سلمان رشدی بمبئی میں 1947 میں پیدا ہوئے۔ اب وہ اپنی برطانوی بیوی میریا نے وگنس (Marianne Wiggins) کے ساتھ لندن میں رہتے ہیں۔ ان کی کئی انگریزی کتابیں (ناولیں) اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور کتاب آدھی رات کے بچے (Midnight's Children) ہے جو 1981 میں شائع ہوئی ہے۔ حال میں ان کی 547 صفحات کی ایک کتاب ایک برطانوی پبلشر وائکنگ پریس (Viking Press) نے شائع کی ہے، جو لندن سے 26 ستمبر 1988 کو ریلیز کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے — ''شیطانی کلام'':

"The Satanic Verses"

مصنف نے کتاب کا نام (شیطانی کلام) بطور خود اس کے اساسی کردار ''محاونڈ'' (Mahound) کی نسبت سے استعمال کیا ہے جو کہ، نعوذ باللہ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا یہ نام کتاب کے مفروضہ کردار کے بجائے خود کتاب کے مصنف کے اوپر زیادہ صحیح طور پر چسپاں ہوتا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنے ایک بیان (ٹائمس آف انڈیا 18 اکتوبر 1988) میں کہا ہے کہ یہ کتاب مذہب اور الہام کے بارے میں ایک سیکولر آدمی کا نقطۂ نظر بیان کرنے کی ایک کوشش ہے:

"Its's an attempt to write about religion and revelation from the point of view of a secular person."

مگر زیادہ صحیح بات یہ ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ وہ ایک سیٹانک پرسن (Satanic

person) کے نقطۂ نظر بیان کرنے کی کوشش ہے۔ کیونکہ سیکولرزم، یا سیکولر انسان کا یہ مطلب کسی بھی سنجیدہ صاحب علم نے کبھی نہیں بتایا جس کا نمونہ سلمان رشدی نے اپنی مذکورہ کتاب میں پیش کیا ہے۔

یہ کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ایک انتہائی بیہودہ اور فحش قسم کا ناول ہے۔ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، وغیرہ کے نام تو بالکل اصل حالت میں درج کیے گئے ہیں، البتہ پیغمبر کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے محاونڈ (Mahound) لکھا گیا ہے۔ یورپ کے مسیحی علماء اور مستشرقین نے قدیم زمانہ میں اپنے جذبۂ عناد کی تسکین کے لیے آپ کے نام کو طرح طرح سے بگاڑا تھا (ملاحظہ ہو زیرِ نظر کتاب کا پہلا باب، اسلام مغربی لٹریچر میں)۔ انھیں میں سے ایک بگڑا ہوا نام وہ ہے جس کو سلمان رشدی نے انتہائی مجرمانہ طور پر اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نسل انسانی کی بزرگ ترین شخصیت ہیں۔ آپ کی ذات گرامی بلاشبہ پوری انسانیت کے لیے فخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی عظمت اور آپ کا تقدس اتنا زیادہ مسلّم ہے کہ دنیا کے تمام سنجیدہ لوگوں نے متفقہ طور پر اس کا اقرار کیا ہے۔

آپ کا ایک خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ابدی طور پر فتح وغلبہ کی نسبت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ قدیم عرب میں ہر قسم کی شدید ترین مخالفت کے باوجود آپ تمام قبائل کے اوپر مکمل طور پر غالب رہے۔ آپ کے زمانہ کی دو طاقت ور ترین سلطنتیں (روم اور ایران) آپ سے ٹکرائیں مگر وہ خود پاش پاش ہو کر رہ گئیں۔ آپ کے ظہور کے بعد یہودی اور عیسائی ساری دنیا میں آپ کے دشمن ہو گئے، مگر آپ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے۔

صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کی مسیحی اقوام نے متحدہ طور پر یہ کوشش کی کہ آپ کی تصویر کو بگاڑیں اور آپ کی تاریخ کو بالکل مسخ کر ڈالیں۔ مگر ہزار برس تک اپنی ساری طاقت خرچ

کرنے کے باوجود ان کی کوششیں صدفی صدنا کام ہوگئیں۔ یہاں تک کہ سائنس کے زیر اثر خود علم انسانی میں وہ انقلاب آیا جس نے آپ کے معاندین کے تیار کردہ لٹریچر کو غیر حقیقی قرار دے کر رد کردیا۔ خود مسیحی طبقہ کی بعد کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ابتدائی نسلوں کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ ان میں ٹامس کارلائل (1795-1881ء) ہے جس نے 1840ء میں ایک لکچر دیا تھا جس کا عنوان یہ تھا:

"The Hero As Prophet Mahomet: Islam"

اس لکچر میں کارلائل نے یہ ثابت کیا کہ پیغمبر محمد ایک ہیرو پیغمبر (A Hero-Prophet) ہیں۔ کارلائل کا یہ لکچر اس کی مشہور کتاب میں شامل ہے، جس کا نام یہ ہے:

On Heroes, Hero-Worship, and the Heroic in History, 1905, New York, pp. 41-75.

ان کے درمیان سے ایک اور شخص مائیکل ہارٹ (پیدائش 1932) اٹھا جس نے ایک کتاب اس عنوان سے لکھی، دی ہنڈریڈ (The 100)۔ اپنی کتاب میں اس نے یہ اعلان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے سب سے کامیاب انسان تھے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں—

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels." (*The 100: A Ranking of the Most Influential Persons in History*, New York, 1993, p. 3)

جو ہستی اتنی عظیم ہو اور جس کی بڑائی ایسا مسلّمہ واقعہ بن چکی ہو، اس کے خلاف کتاب لکھنا یا اس کی شان میں برے کلمات اپنی زبان سے نکالنا یقیناً ایسا ہی ہے جیسا سورج کے اوپر خاک ڈالنا۔ جو شخص سورج کے اوپر خاک ڈالنے کی کوشش کرے وہ خود اپنے منہ میں خاک

ڈال رہا ہے، وہ خود اپنے آپ کو باطل ثابت کر رہا ہے۔

کتا اگر ہاتھی کے اوپر بھونکے تو ہاتھی کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کتے کی بھونک کی تردید کرے۔ ہاتھی اپنے باعظمت وجود کے ساتھ اپنے آپ کو کتے کی بھونک کی تردید ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کسی کے قلم کی سیاہی اس کو داغدار کر سکے۔ ساری تاریخ، تمام انسانی علوم، حتی کہ پوری کائنات ایسی ہر کوشش کی تردید ہے۔ جس ہستی کے ظہور نے خود انسانی تاریخ کو بدل ڈالا ہو، کون ہے جو اس کی تصویر کو بدلے، کون ہے جو اس کی تاریخ کو مٹا سکے۔

سطحی کتاب

جن لوگوں نے سلمان رشدی کی کتاب کو پڑھا ہے، وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) بلاشبہ ایک سطحی اور عامیانہ کتاب ہے۔ اس میں قاری کے لیے کوئی کشش نہیں۔ نہ صرف یہ کتاب غیر معیاری (Sub-standard) ہے۔ بلکہ خود اس کا مصنف سلمان رشدی انگریزی کا کوئی معیاری ادیب نہیں۔ برطانیہ کے مشہور ادبی ناقد آبروں واف (Auberon Waugh) نے کہا ہے کہ سلمان رشدی اس قابل ہے کہ اپنی خراب انگلش کی بنا پر اس کو سزا دی جائے:

"Mr. Salman Rushdie deserves to be punished for bad English."

خود مغرب کے سنجیدہ تبصرہ نگاروں نے اس ناول کے بارے میں اس قسم کے الفاظ کہے ہیں بوجھل، ناقابل فہم، ناقابل مطالعہ:

"Dense, impenetrable, un-readable."

مسٹر خوشونت سنگھ نے رشدی کی کتاب کے بارے میں کہا کہ ایک ناول کی حیثیت

سے بھی ”شیطانی آیات“ مطالعہ کے لائق نہیں:

"Even as a novel 'The Satanic Verses' is not readable."

ایک اور ہندوستانی جرنلسٹ مسٹر ارن شرما نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ تیسرے درجہ کی تھیم، دوسرے درجہ کا مصنف اور اول درجہ کا کاغذ:

"Third rate theme, by a second rate author, on a first rate paper."

کتاب کا یہ سطحی اور ناقص معیار مقتضی تھا کہ اس کو ایک جاہل کی جہالت سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اس طرح یہ کتاب اپنی موت آپ مر جاتی۔ ریاض کے عربی ہفتہ وار الدعوۃ (15 رمضان 1409ھ، 20 اپریل 1989) میں دکتور عبدالکریم محمد الحسن بکار نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس کتاب پر بہترین تنقید یہ تھی کہ اس سے اعراض برتا جائے (كَانَ خَيرَ نَقْدٍ لَهُ الإِعْرَاضُ عَنْهُ، صفحہ 47)۔ اسی طرح اردن کے صالح القاسم نے لکھا ہے کہ ماضی میں بے شمار کتابیں اسلام کے خلاف لکھی گئیں۔ مگر علماء اسلام نے ان کو نظر انداز کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اپنی ساری عظمت کے ساتھ زندہ رہا اور یہ کتابیں گوشۂ اہمال میں جا کر ختم ہو گئیں۔ اگر اہمال و اعراض کا یہی طریقہ سلمان رشدی کی کتاب کے ساتھ اختیار کیا جاتا تو وہ بھی فراموشی کی تاریکی میں گم ہو کر ختم ہو جاتی (صفحہ 39)۔

کتاب کا مضمون

سلمان رشدی کی کتاب کا نام (شیطانی آیات) ایک جھوٹی کہانی پر مبنی ہے۔ یہ جھوٹی کہانی 5 نبوی میں اس وقت گھڑی گئی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پر سورہ النجم نازل ہوئی (تفصیل ملاحظہ ہو: فرضی کہانی)۔ کہانی کی ابتدائی مصنفین عین اسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے جس کا ارتکاب سلمان رشدی نے اپنی کتاب شیطانی آیات لکھ کر کیا ہے۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب نے ان کے اوپر وہ سزا نافذ نہیں کی جس کا اعلان آج ایران کے شیعہ عالم اور ہندوستان کے سنی عالم مبینہ طور پر کر رہے ہیں۔ اگر اس جرم کی سزا لازمی طور پر وہی ہے جس کی موجودہ علماء وکالت کر رہے ہیں تو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام کو مکہ میں اس کا نفاذ کرنا چاہیے تھا۔ مگر ثابت شدہ طور پر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ علماء کے اعلان کا ماخذ ان کی اپنی خواہشات ہیں، نہ کہ قرآن اور سنت۔

سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک توہین آمیز نام محاونڈ (Mahound) کا استعمال کیا ہے۔ یہ نام بلاشبہ اشتعال انگیز حد تک لغو ہے۔ انگریزی میں ہاونڈ کا لفظ کتے کے لیے استعمال ہوتا ہے، ''مَ'' انگریزی لفظ مائی (My) کا مخفف ہے۔ اس طرح محاونڈ کا دوسرا مطلب (نعوذ باللہ، نقلِ کفر کفر نباشد) ہے میرا کتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ بے ہودہ نام سلمان رشدی کی ذاتی ایجاد نہیں۔ یہ کروسیڈ (1096-1271) کے بعد یورپ میں گھڑا گیا۔ یورپ کی مسیحی قومیں جب دوسوسالہ صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ناکام ہوگئیں تو انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے بہت سی پست حرکتیں کیں۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے آپ کے نام کو طرح طرح سے بگاڑا۔ ایک بگڑا ہوا نام یہ لفظ (Mahound) ہے۔ مگر پچھلے سات سو سال کے اندر اس گستاخی کی بنیاد پر کسی کو بھی قتل کی سزا نہیں دی گئی۔ اور نہ اس قسم کا فتویٰ جاری کیا گیا۔

سلمان رشدی نے جس کہانی کی بنیاد پر اپنی کتاب کا نام شیطانی آیات رکھا ہے، وہ کہانی سب سے پہلے 5 نبوی میں مکہ میں وضع کی گئی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واضعین کو قتل نہیں کرایا۔ سلمان رشدی نے پیغمبر اسلام کے لیے جو گستاخانہ نام ''محاونڈ''

استعمال کیا ہے، وہ صلیبی جنگوں کے بعد کے دور میں یورپ میں وضع کیا گیا۔مگر اس وقت علماء اسلام نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جن لوگوں نے یہ گستاخانہ نام وضع کیا ہے، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے۔

ازواج مطہرات کے خلاف جو بے ہودہ باتیں سلمان رشدی نے لکھی ہیں، اس کا مصنفِ اول مدینہ کا عبداللہ بن ابی تھا۔مگر پیغمبر اسلام نے اصرار کے باوجود اس کو قتل کرنے سے منع کر دیا۔ اٹلی کے دانتے (1265-1321) نے ڈیوائن کمیڈی میں، نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ، نقل کفر کفر نباشد، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جہنم میں دکھایا ہے۔ترکی کی عثمانی سلطنت کا بانی سلطان عثمان غازی (1258-1326) دانتے کا ہم عصر تھا۔مگر اس نے یہ فرمان جاری نہیں کیا کہ جو شخص دانتے کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو سنہری سکہ انعام دیا جائے گا۔ شیکسپیئر (1564-1616) نے اپنے ڈرامے میں پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ جھوٹا رسول بتایا ہے۔شاہ جہاں (1592-1666) شیکسپیر کا معاصر تھا۔مگر ہندوستان کے علماء نے شاہ جہاں سے یہ نہیں کہا کہ فوراً ایک یا زیادہ آدمی کو ہتھیار دے کر انگلینڈ بھیجو، تا کہ وہ وہاں پہنچ کر شیکسپیئر کو قتل کر دیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس اعراض کی وجہ ماضی کے اہل ایمان یا سلاطین کی بے غیرتی نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس قسم کی باتوں کو "کتّے کی بھونک" سمجھتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ کتا اگر ہاتھی پر بھونکے تو اس کا زیادہ بہتر اور کارگر جواب یہ ہے کہ ہاتھی اس کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ جائے۔

مسلّمہ عظمت

قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود (17:79) پر کھڑا کیا گیا ہے۔اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی نبوت علمی اور تاریخی

اعتبار سے مکمل طور پر تسلیم شدہ نبوت ہے۔ آپ کی حیثیت نبوت ابدی طور پر سارے عالم کے لیے مسلّم ہو چکی ہے۔ ایسے پیغمبر کے خلاف ہر پروپگنڈا جھوٹا پروپگنڈا ہے اور جھوٹا پروپگنڈا کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔

اگر کوئی شخص کہے کہ "ہمالیہ پہاڑ محض ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے" تو دنیا میں کوئی ایک شخص نہ ہو گا جو اس قول کو سن کر ہمالیہ پہاڑ کی عظمت کے بارے میں مشتبہ ہو جائے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام کے خلاف کوئی مضمون یا کتاب کسی بھی درجہ میں آپ کی شانِ کمال میں کوئی کمی نہیں کرتی۔

یہاں وضاحت کے لیے ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔ انڈیا کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (24 فروری 1989) میں نئی دہلی کی ایک مسلم خاتون مسز زاہدہ خان کا تفصیلی خط چھپا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ میری ایک رشتہ دار خاتون باہر رہتی ہیں۔ وہ ہندوستان آئیں تو اپنے ساتھ سلمان رشدی کی کتاب (The Satanic Verses) بھی لے آئیں۔ ان سے لے کر میں نے اس کتاب کو پڑھا۔ مگر میں آپ کو اور اپنی کمیونٹی کے رہنماؤں کو یہ یقین دلاتی ہوں کہ پیغمبر اسلام کے بارے میں میرا عقیدہ اس کو پڑھنے سے کچھ بھی کم نہیں ہوا، بلکہ میرے یقین میں اور اضافہ ہو گیا:

"The offending book was brought to India by a visitor, and during her stay here, I read it. But I assure you and my community leaders that my faith in the Prophet Mohammad has been strengthened." (p.8).

جس پیغمبر کی عظمت اتنی مسلّم ہو، اس کے خلاف کوئی بیان دیکھ کر اگر مسلمان مشتعل ہوں تو وہ صرف اپنے چھوٹے پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ پیغمبر کی عظمت وشان میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

فرضی افسانہ

سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات(The Saltanic Verses) جو 547 صفحات پر مشتمل ہے، اس پر نیو یارک کے ہفت روزہ ٹائم (13 فروری 1989) میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔تبصرہ نگار مسٹر پال گرے(Paul Gray) کا کہنا ہے کہ کتاب کے خلاف مسلمانوں کے عوامی احتجاجات(Public protests)غیر ضروری تھے۔ راقم الحروف خودبھی اس قسم کے احتجاج اور شور وغل کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ کتا اگر ہاتھی پر بھونکے تو ہاتھی کتے پر نہیں بھونکتا۔ کیوں کہ ہاتھی کی عظمت بذات خود کتے کی ہر بھونک کا جواب ہے۔ اور جب چپ کی زبان کافی ہوتو بولنے کی زبان استعمال کرنے کی کیا ضرورت۔

تاہم اس سلسلہ میں تبصرہ نگار نے جو توجیہ کی ہے، اس توجیہ سے مجھے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب کے سوا اور کچھ نہیں کہ تاریخ کی جگالی (Rumination on history) ہے۔ باالفاظ دیگر، وہ اصلاً تاریخی واقعات پر مبنی ہے، اور جب ایسا ہے تو اس کے خلاف ہنگامہ اور احتجاج کیوں۔مگر مفروضہ بذات خود واقعہ کے مطابق نہیں کہ کتاب میں جو باتیں درج ہیں ان کی بنیاد کسی تاریخی واقعہ پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی افسانہ ہے اور اپنی تاریخی بنیاد کے اعتبار سے بھی افسانہ۔

تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ کتاب میں جبریل اور محمد کے درمیان تبادلۂ کلام، بظاہر بگڑے ہوئے اور خیالی انداز میں، ایک قصہ پر مبنی ہے جو محمد کی زندگی میں پیش آیا۔ پیغمبر ابتداءً اس پر راضی ہو گئے کہ عرب کی تین دیویوں کا اعتراف قرآن میں شامل کردیں، اور بعد کو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ آیتیں شیطان کی الہام کی ہوئی تھیں۔ اگر محمد خود یہ اقرار

کرنے کے لیے تیار تھے کہ انھیں دھوکا دیا گیا ہے تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ قدیم گزرے ہوئے واقعہ کا مماسی (tangential) اور افسانوی بیان آج کیوں اتنے ہنگامہ کا سبب بن جائے:

"The Gibreel-Mahound exchanges are based, in a distorted and hallucinatory manner, on an episode in the life of Muhammad—the Prophet's early willingness to include in the Quran an acknowledgement of three female deities and his later repudiation of these verses as satanically inspired. If Muhammad was willing to admit that he had been deceived, it is difficult to see why a tangential, fictional version of this long-ago event should cause such contemporary uproar." (p.42).

اس اقتباس میں جس "واقعہ" کا ذکر ہے، وہ سورہ النجم سے تعلق رکھتا ہے۔ متعلقہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى۔ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى۔ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثَى۔ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَى (53:19-22)۔ یعنی، کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسرے ایک اور منات کو۔ کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں۔ یہ تو بہت بے ڈھنگی تقسیم ہے۔

قدیم عرب میں تین بڑے بت تھے — لات، عزیٰ، اور منات۔ ان بتوں کو اس زمانہ میں بہت بڑی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ان بتوں کی بڑائی بیان کرنے کے لیے لوگوں نے طرح طرح کے کلمات وضع کر رکھے تھے۔ یاقوت الحموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ قریش کعبہ کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہا کرتے تھے: اللَّاتَ وَالْعُزَّى. وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ

الْأُخرى فَإِنَّهُنَّ الْغَرَانِيقُ الْعُلَى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى (معجم البلدان، جلد 4، صفحہ 116)۔ یعنی، قسم ہے لات اور عزیٰ کی اور تیسرے منات کی۔ یہ سب بلند ترین ہیں۔ ان کی سفارش ضرور متوقع ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں سورہ النجم کی مذکورہ آیتیں اتریں تو آپ نے حسب معمول ایک مجمع میں ان کو سنایا۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کچھ مشرک لوگ بھی موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جب یہ الفاظ نکلے: أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى. وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى (کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسرے ایک اور منات کو) تو بعض مشرکین نے اس میں اپنے الفاظ ملا دیے۔ اپنے بتوں کے نام سن کر وہ فوراً وہ الفاظ بول پڑے جو ان بتوں کی نسبت سے پہلے سے ان کے یہاں رائج تھے اور جن کو وہ ان بتوں کے نام کے ساتھ جوڑ کر کہا کرتے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے: فَإِنَّهُنَّ الْغَرَانِيقُ الْعُلَى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى (یہ تینوں بلند مرتبے کے خوبصورت پرندے ہیں، اور ان سے سفارش کی امید کی جاتی ہے)۔

ان دوسرے الفاظ کا کوئی بھی تعلق پیغمبر اسلام سے نہ تھا۔ آپ نے تو صرف اول الذکر الفاظ (أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى. وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى) فرمائے تھے۔ ثانی الذکر الفاظ (فَإِنَّهُنَّ الْغَرَانِيقُ الْعُلَى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى) تمام تر مشرکین کے الفاظ تھے جن کو انھوں نے آواز ملا کر اپنی طرف سے کہہ دیا۔ یہی بات بعض مفسرین نے ان الفاظ میں کہی ہے:

”أَنَّ الشَّيْطَانَ أَوْقَعَ فِي مَسَامِعِ الْمُشْرِكِينَ ذَلِكَ فَتَوَهَّمُوا أَنَّهُ صَدَرَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَيْسَ كَذَلِكَ فِي نَفْسِ الْأَمْرِ، بَلْ إِنَّمَا

كَانَ مِنْ صَنِيعِ الشَّيْطَانِ لَا مِنْ رَسُولِ الرَّحْمَنِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 389)۔ یعنی، شیطان نے مشرکوں کے کان میں یہ الفاظ ڈال دیے۔ پس مشرکوں نے گمان کرلیا کہ یہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ وہ دراصل شیطان کا کلام تھا، نہ کہ رسولِ رحمان صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام۔"

یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی نہ کسی شکل میں ہر شخص کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً حکمراں پارٹی کا لیڈر ایک بار تقریر کر رہا تھا۔ مجمع میں اس کی پارٹی کے لوگ بھی تھے اور دوسری پارٹیوں کے لوگ بھی۔ تقریر کے دوران ایک بار لیڈر نے (بطور تنقید) مخالف پارٹی کے لیڈر کا نام لیا۔ مخالف پارٹی کے آدمیوں نے جب اپنے لیڈر کا نام سنا تو عین اسی وقت وہ "زندہ باد، زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ حکمراں پارٹی کے لیڈر نے مخالف پارٹی کے لیڈر کے لیے زندہ باد کہا تو یہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ حکمراں پارٹی کے لیڈر نے تو اس کا نام محض تنقید کے لیے لیا تھا، یہ دراصل مخالف پارٹی کے لوگ تھے جو اس کی آواز میں اپنی آواز ملا کر زندہ باد کے الفاظ بولنے لگے۔

واقعہ کی سادہ شکل وہی ہے جو اوپر نقل کی گئی۔ مگر اسلام کے کچھ مخالفوں نے اس واقعہ کو غلط صورت دے کر ایک خود ساختہ کہانی بنائی۔ انھوں نے مشرکین کے قول کو پیغمبر کا قول دیدیا۔ اور کہا کہ پیغمبر اسلام پر سورہ النجم اتاری جارہی تھی جب اس کا سلسلہ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى تک پہنچا تو اس کے بعد شیطان نے مذکورہ الفاظ آپ پر القاء کردیے۔ آپ نے قرآن کی آیت کے ساتھ اس کو ملا کر مجمع میں پڑھ دیا۔ بعد کو آپ کو غلطی کا احساس ہوا تو آپ نے اعلان کیا کہ مذکورہ کلام خدا کا کلام نہیں تھا۔ وہ شیطان کا کلام تھا۔ یہ کہہ کر اس کو

قرآن سے حذف کر دیا۔

یہ ساری کہانی، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، بالکل لغو ہے، اور اس سے بھی زیادہ لغو بات یہ ہے کہ اس کو تاریخی حیثیت دے کر اس کی روشنی میں ایک پورا افسانہ بنایا جائے اور اس کی بنیاد پر پورے قرآن کو کلامِ خداوندی کے بجائے، نعوذ باللہ، کلامِ شیطانی قرار دینے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کی صداقت کا بذات خود یہ کافی ثبوت ہے کہ معاندین اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی حقیقی دلیل نہیں پاتے۔ ان کے پاس اپنے معاندانہ جذبہ کی تسکین کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ بطور خود ایک جھوٹی کہانی بنائیں اور اس کو قرآن کی طرف منسوب کر کے قرآن کی سچائی کو ناکام طور پر داغدار کرنے کی کوشش کریں۔

غلط بیانی

انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (19 اکتوبر 1988) میں اس کے ایڈیٹر مسٹر ارن شوری کے قلم سے ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کی سنسنی خیز سرخی یہ تھی — مگر خود آیات کے بارے میں کیا:

"But what about the verses themselves?"

اس مضمون میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ تاہم دوسری باتوں کو چھوڑتے ہوئے ہم اس کے صرف اس حصہ کے بارے میں کچھ عرض کریں گے جس کا تعلق براہ راست طور پر قرآن سے ہے۔ اس حصۂ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (Satanic Verses) پر حکومت نے جو پابندی لگائی ہے وہ اس لیے لگائی ہے کہ وہ اس سے ایک فرقہ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس منطق سے خود قرآن پر بھی پابندی لگائی جانی چاہیے کیوں کہ اس میں بھی ایسی آیتیں موجود ہیں جن سے دوسرے فرقوں کے لوگوں کے جذبات مجروح ہو رہے ہیں یا مجروح ہو سکتے ہیں۔

یہ آیتیں کیا ہیں۔ یہ آیتیں وہ ہیں جو جنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ارن شوری نے اس قسم کی کچھ آیتوں کو نقل کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ کافروں کو مارو، انھیں قتل کرو۔ اس طرح کی آیتیں واضح طور پر غیر مسلموں کے جذبات کو مجروح کرنے والی ہیں۔ اس لیے ان کے خیال کے مطابق، خود قرآن پر بھی پابندی لگنا ضروری ہے۔

ارن شوری نے یہ بات آزادانہ تحقیق اور عقلی اظہار خیال (rationaldiscourse) کے نام پر کی ہے۔ مگر زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ اس بات کو خود ساختہ الزام یا غلط بیانی (rational falsification) کا نام دیتے۔ کیونکہ انھوں نے قرآن کی جو چند آیتیں پیش

کی ہیں وہ سب سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کی ہیں۔ اور اس طرح ان سے ایک ایسا خود ساختہ مفہوم نکالنے کی کوشش کی ہے جو خود آیتوں کے اندر موجود نہیں۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر ان کے پیش کردہ حوالوں میں سے دو بنیادی حوالوں کا ذکر کریں گے۔

سورہ البقرہ کی دو آیتوں کے جزئی حصہ کا ترجمہ (انگریزی میں) انھوں نے اس طرح نقل کیا ہے: اور ان کو نکالو جس طرح انھوں نے تم کو نکالا ہے، اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے (2:191) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے (2:193)۔

اس طرح جنگ سے متعلق چند آیتیں نقل کرنے کے بعد انھوں نے سورہ الاحزاب کی ایک آیت کا ترجمہ (انگریزی میں) اس طرح دیا ہے: اور کسی مومن اور مومنہ کے لیے گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ پھر ان کو اس کام میں اختیار باقی رہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (33:36)۔

اس طرح کے کچھ اقتباسات نقل کر کے مضمون مین یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن غیر مسلموں کو مارنے اور انھیں قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور جب خدا کا حکم آجائے تو قرآن کے مطابق، مومنین قرآن پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بے چوں و چرا اس کی تعمیل کریں۔ یعنی تلوار لے کر اٹھیں اور غیر مسلموں کو ایک طرف سے مارنا شروع کر دیں۔

ارن شوری کی اس لغو تشریح کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سراسر ایک خود ساختہ تشریح ہے جو ناقص اقتباسات کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔ یہ بات اس وقت نہایت آسانی سے واضح ہو جاتی ہے جب کہ مذکورہ آیات کو ان کے سیاق (context) میں رکھ کر دیکھا جائے۔

1۔ سب سے پہلے سورۃ البقرہ کو لیجیے۔ اس کے جس حصہ سے مذکورہ الفاظ لیے گئے

ہیں، اس پورے حصے کا ترجمہ یہ ہے:

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑائی کرتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے، اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے جنگ نہ چھیڑیں، پس اگر تم سے جنگ چھیڑیں تو ان سے جنگ کرو، یہی سزا ہے انکار کرنے والوں کی۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (persecution) باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو اس کے بعد سختی نہیں ہے مگر ظالموں پر (2:190-193)۔

مذکورہ آیت میں "ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں" (وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ) کے الفاظ ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں دفاع (defence) کا حکم دیا گیا ہے، نہ کہ جنگ کا۔ یعنی یہ کوئی مطلق یا عمومی ہدایت نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق اس ہنگامی صورت حال سے ہے جب کہ کچھ لوگوں نے جارحیت کا آغاز کر کے اہل ایمان کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہو۔ گویا کہ یہ دفاع کی آیت ہے، نہ کہ قتال کی آیت۔ آیت کے اس ٹکڑے کا صحیح انگریزی ترجمہ یہ ہوگا:

"And fight in the way of God those who fight you." (2:190)

اب مسٹر ارن شوری یا ان کے ہم خیال لوگ بتائیں کہ دنیا کا کون سا قانون یا کون سا بین الاقوامی رواج ہے جو دفاع کو قابل اعتراض قرار دیتا ہے۔ مسٹر ارن شوری کو اگر ہندوستان کا پرائم منسٹر بنا دیا جائے تو کیا وہ ایسا کریں گے کہ وزارت دفاع کا شعبہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ کیا وہ بری، بحری اور ہوائی افواج کے تمام لوگوں کو ریٹائر کر کے گھر بھیج دیں

گے۔ ملک کے بچاؤ کے لیے جو ہتھیار جمع کیے گئے ہیں ان کو وہ بحر ہند میں پھنکوا دیں گے اور ملک میں فوجی سامان تیار کرنے کے جتنے کارخانے ہیں ان سب کو تبدیل کر کے انھیں کھیل اور تفریح کا کلب بنا دیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے اور یقیناً نہیں کریں گے تو انھیں کیا حق ہے کہ قرآن کے ایک ایسے حکم پر اعتراض کریں جو دنیا کے تمام قوانین اور تمام اقوامی رواج کے مطابق عین درست ہے اور مسلمہ طور پر ایک جائز حق ہے۔ یعنی جارحانہ کاروائی کے خلاف دفاع کا حق۔

2۔ اب دوسری سورہ (الاحزاب) کے اقتباس کو لیجیے۔ اس آیات کا پورا ترجمہ یہ ہے:

اور کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اختیار باقی رہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (33:36)۔

سورۃ الاحزاب کی یہ آیت جس سلسلۂ بیان میں آئی ہے، اس کا قطعاً کوئی تعلق جنگ سے نہیں ہے۔ یہ آیت دراصل ایک معاشرتی اصلاح کے ذیل میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

مدینہ میں ایک خاتوں تھیں جن کا نام زینب بنت جحش تھا۔ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 4ھ میں ان کے یہاں زید بن حارثہ کے لیے نکاح کا پیغام دیا جو ایک آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ بظاہر ایک نابرابری کا رشتہ تھا۔ چنانچہ زینب بنت جحش اور ان کے گھر والوں نے اس کو نامنظور کر دیا، خود زینب نے کہا کہ میں زید سے نسب میں بہتر ہوں: **أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ حَسَبًا** (تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 375)۔

زینب اور ان کے گھر والے سب کے سب مسلمان تھے۔ انھوں نے حسب نسب

کے فرق کی بنیاد پر اس رشتہ کو ماننے سے انکار کیا تھا جو قرآنی اسکیم کے سراسر خلاف تھا۔ اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کی شریعت خدا کے احکام پر مبنی ہے، نہ کہ قومی اور خاندانی رواج پر۔ اگر تم واقعۃً اللہ اور رسول کے مومن ہو تو تمہیں وہی کرنا چاہیے جس کا حکم خدائی شریعت میں دیا گیا ہے۔ روایات بتاتی ہیں کہ اس آیت کے اترتے ہی زینب اور ان کے گھر والوں نے نخوت کو ترک کر دیا اور خدا کے حکم کے مطابق زید بن حارثہ سے نکاح پر راضی ہو گئے: فَامْتَنَعَتْ ثُمَّ أَجَابَتْ (تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 375)۔

اصل پس منظر کے اعتبار سے دیکھیے تو مذکورہ آیت ایک عظیم سماجی انقلاب کا عنوان ہے جب کہ تاریخ میں پہلی بار مصنوعی اونچ نیچ کو ختم کر کے حقیقی انسانی مساوات کو قائم کیا گیا۔ قرآن کی یہ آیت نہ صرف مومنین قرآن کے لیے بلکہ تمام قوموں کے لیے فخر کی آیت ہے۔ یہ آیت اس دن کو یاد دلاتی ہے جب کہ ہزاروں سال سے جکڑی ہوئی انسانیت کو جھوٹے بندھنوں سے آزادی حاصل ہوئی اور تاریخ میں نیا عمل شروع ہوا جو موجودہ زمانہ میں مساوات انسانی کے عمومی اعتراف کے مرحلہ تک پہنچا۔

آدمی کے اندر اگر اعتراف کا حوصلہ ہو اور اس کو دیکھنے والی آنکھ حاصل ہو تو وہ اس آیت میں سچی انسانیت کی روشنی دیکھے گا، مگر جو لوگ بصیرت سے محروم ہوں، ان کے لیے تو اجالا بھی ویسا ہی تاریک ہے جیسا کہ اندھیرا:

گر نہ بیند بروز شپرۂ چشم — تکمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

ایک مثال

انڈین پینل کوڈ کی دفعہ 92 سے لے کر دفعہ 106 تک ذاتی دفاع کے بارے میں ہیں۔ اس کی دفعہ 96 آدمی کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنے دفاع (بچاؤ) میں لڑے۔ اگر کسی شخص پر

جارحیت کی جائے اور وہ اپنے دفاع میں دوسرے شخص پر حملہ کرے تو یہ قانونی اعتبار سے اس کے لیے جرم نہیں ہوگا:

"Nothing is an offence which is done in the exercise of the right of private defence."

اب اگر کوئی شخص ان دفعات کو لے کر یہ کہنے لگے کہ ہندوستان کا قانون ہر آدمی کو کھلی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف جس کو چاہے مارنا شروع کر دے۔ تو ایسا شخص یقیناً غلطی کرے گا۔ کیوں کہ وہ خصوصی حکم کو عمومی حکم بنا رہا ہے۔ وہ دفاع کے حکم سے آزادیِ مذہب کا حکم نکال رہا ہے۔

ہندستان کا قانون مذہبی آزادی کے معاملہ میں کیا ہے، اس کو پینل کوڈ (قانون فوجداری) سے اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے دستور ہند کی وہ دفع دیکھنی ہوگی جو بنیادی حقوق (fundamental rights) سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ ہندوستان کے قانون نے مذہب کے معاملہ میں ہر آدمی کو پوری آزادی عطا کی ہے۔ اس کے مطابق، نہ کسی سے اپنی پسند کا عقیدہ رکھنے کا حق چھینا جاسکتا اور نہ اس معاملہ میں اس کو مجبور کیا جاسکتا۔

مسٹر ارن شوری نے یہی غلطی قرآن کو سمجھنے میں کی۔ وہ قانونِ دفاع اور قانونِ مذہب کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر رہے ہیں۔ انھوں نے قرآن سے "قتال" کی جو آیتیں نقل کی ہیں وہ سب دفاع کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی یہ کہ جارحیت کے وقت مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ جہاں تک اس دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ مذہب کی آزادی کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر کیا ہے، اس سلسلہ میں مسٹر ارن شوری کو چاہیے کہ وہ قرآن کی آیتوں کا مطالعہ کریں جو خاص طور پر اس دوسرے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً:

1۔ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہوچکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت (شیطان) کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو اس نے مضبوط حلقہ کو پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے (2:256)۔

2۔ پس تم لوگوں کو نصیحت کرو، تم صرف نصیحت کرنے والے ہو۔ تم ان کے اوپر داروغہ نہیں ہو (88:21-22)۔

قرآن میں اس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں جو واضح طور پر بتاتی ہیں کہ عقیدہ یا مذہب کا معاملہ تمام تر ذاتی ضمیر کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ جس عقیدہ یا مذہب کو چاہے مانے اور جب چاہے اپنے ذاتی فیصلہ سے اس کو بدل دے۔ مذہب کے معاملہ میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں۔ مذہب کے معاملہ میں صرف تبلیغ ہے، نہ کہ جبر۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی قانون جارحیت کے موقع پر ہر شخص یا قوم کو اپنے دفاع (بچاؤ) کا حق دیتا ہے۔ مگر جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے، وہ ہر ایک کے لیے مذہبی آزادی کا حق تسلیم کرتا ہے، "قتال" کے قرآنی حکم کا تعلق صرف پہلے معاملہ سے ہے، دوسرے معاملہ سے جنگ وقتال کا کوئی تعلق نہیں۔

اطاعت یا سرکشی

سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) میں نے خود پڑھی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک لغو کتاب ہے۔اس کتاب کی لغویت کے بارے میں میری وہی رائے ہے جو دوسروں کی رائے ہے۔مگر اس کتاب کے بارے میں مسلمانوں کا ردّعمل کیا ہونا چاہیے، اس سلسلہ میں میری رائے ان لوگوں سے مختلف ہے جو یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ رشدی کو قتل کر کے اسے جہنم رسید کرو۔

سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں جو کچھ کہا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تمام باتیں نہ صرف پچھلے ہزار سال سے کسی نہ کسی شکل میں کہی جاتی رہی ہیں، بلکہ یہ خود اس زمانہ میں بھی کہی گئی تھیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں موجود تھے۔اس وقت آپ نے ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، اس کو معلوم کر کے ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ اسی قسم کے موجودہ واقعہ میں ہم کیا طرزِعمل اختیار کریں۔اس معاملہ میں کسی اجتہاد یا قیاس کی ضرورت نہیں۔کیونکہ پیغمبر اسلام کا اسوہ (نمونہ) واضح طور پر ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔

چند مثالیں

1۔سلمان رشدی کی کتاب میں ایک بات نعوذ باللہ یہ کہی گئی ہے کہ قرآن میں جبریل علیہ السلام کی لائی ہوئی آیتوں کے ساتھ شیطان کی القاء کی ہوئی آیتیں بھی شامل تھیں۔اسی بنا پر اس نے اپنی کتاب کا نام "شیطانی آیات" رکھا ہے۔ یہ نام زیادہ صحیح طور پر خود رشدی کی کتاب پر صادق آتا ہے۔تاہم اس نے اپنے خیال کے مطابق، یہ نام قرآن کو دینا چاہا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنا یہ نظریہ اس قصہ کی بنیاد پر کھڑا کیا ہے جس کو غرانیق کا قصہ کہا جاتا ہے۔ یہ قصہ، جس کی تفصیل دوسرے مضمون میں بتائی گئی ہے، اس وقت گھڑا گیا جب کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے اس لغو قصہ کے ابتدائی مصنف مکہ کے مشرکین تھے۔ 8ھ میں مکہ فتح ہوا تو ان مشرکوں کے اوپر آپ کو مکمل قابو حاصل ہو گیا۔ مگر آپ نے یہ اعلان نہیں فرمایا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے غرانیق کا جھوٹا قصہ گھڑا تھا، انہیں قتل کر کے اس سب کو جہنم رسید کر دو۔ اس کے برعکس، آپ نے ان سے فرمایا کہ: **اذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ** (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 18275)۔ یعنی، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں اسلام کی نظریاتی طاقت پر بھروسہ کیا، نہ کہ اسلام کی شمشیری طاقت پر۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ اگرچہ آپ نے ان پر تلوار استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اسلام کی نظریاتی طاقت نے ان کو مسخر کرلیا۔ ان کو آزادی دینے کے جلد ہی بعد وہ اسلام کے عقیدہ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق سے اتنا متاثر ہوئے کہ کلمۂ اسلام کا اقرار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خدا کی غلامی میں دے دیا۔

2۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محاونڈ (Mahound) لکھا ہے۔ یہ ایک استہزائی نام ہے۔ جس طرح بعض لوگ وہابی کو وہابڑا اور دیوبند کو دیو کے بندے وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں۔ اس طرح سلمان رشدی نے آپ کے لیے اس بگڑے ہوئے نام کو استعمال کیا ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کے عیسائیوں نے پیغمبر اسلام کے لیے گھڑا تھا۔

اس مجرمانہ حرکت کی مثال بھی زمانۂ نبوت میں موجود ہے۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اگرچہ آپ کے دادا عبد المطلب نے محمد رکھا تھا، مگر مکہ کے قریش نے استہزائی طور پر آپ کا نام مذمّم رکھ دیا۔ محمد کے معنی ہیں تعریف کیا ہوا۔ جبکہ مذمّم کے معنی ہیں مذمت کیا ہوا۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل شاعرہ تھی۔ اس نے مذمّم کے لفظ کو لے کر شعر کہا تھا اور اس کو اس طرح پڑھا کرتی تھی:

مُذَمَّمًا عَصَيْنَا ... وَأَمْرَهُ أَبَيْنَا ... وَدِينَهُ قَلَيْنَا

(سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 356)۔

یعنی ہم نے ایک قابلِ مذمّت شخص کی نافرمانی کی۔ اس کی بات کا انکار کیا اور اس کے دین سے نفرت کی۔

اس معاملہ میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے یہ فرمایا ہو کہ دیکھو فلاں لوگ میرا نام بگاڑ کر مجھ کو مذّمم کہتے ہیں، ان سب کو قتل کر دو۔ اس کے برعکس جو ہوا، وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ ہے:

> ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ کا نام مذّمم رکھتے ہیں۔ اور پھر اسی نام سے آپ کو گالی دیتے تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ کیا تم لوگوں کو اس بات سے تعجب نہیں ہوتا جو اللہ نے قریش کی ایذا رسانی کو مجھ سے پھیر دیا۔ وہ مجھ کو گالی دیتے ہیں اور مذّمم کہہ کر میری ہجو کرتے ہیں۔ حالانکہ میں محمد (تعریف کیا ہوا) ہوں۔ قَالَ ابْنُ إِسْحَاقَ: وَكَانَتْ قُرَيْشٌ إِنَّمَا تُسَمِّي رَسُولَ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم مُذَمَّمًا، ثُمَّ يَسُبُّونَهُ، فَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ: أَلَا تَعْجَبُونَ لِمَا يَصْرِفُ اللَّهُ عَنِّي مِنْ أَذَى قُرَيْشٍ، يَسُبُّونَ وَيَهْجُونَ مُذَمَّمًا، وَأَنَا مُحَمَّدٌ (سیرۃ ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 356)۔

یہاں دوبارہ دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ کو اذیت پہنچائی جاتی ہے۔ مگر آپ اپنے اصحاب سے یہ نہیں کہتے کہ یہ لوگ ناقابل معافی جرم کے مجرم ہیں، ان سب کو ایک ایک کر کے قتل کر دو۔ اس کے برعکس آپ اپنے اصحاب کی توجہ قولِ انسانی سے ہٹا کر قولِ خداوندی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ انسان اگر میری مذمت

کرتے ہیں اور میرا سب وشتم کر رہے ہیں تو اس سے کیا ہوا۔ تمام انسانوں کے رب اور ساری کائنات کے مالک نے ابدی طور پر مجھے محمد کے مقامِ اعلیٰ پر فائز کر دیا ہے۔ پھر ان کی بےہودہ گوئی کی پروا کرنے کی مجھے کیا ضرورت۔

3۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں ایک اور نہایت بےہودہ حرکت یہ کی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ کو نعوذ باللہ ایک بدکردار خاتون کے روپ میں دکھایا ہے۔ یہ بلاشبہ اشتعال انگیز حد تک ایک بےہودہ بات ہے۔ کوئی مسلمان کتاب کے اس حصہ کو ٹھنڈے دماغ کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔

مگر یہاں بھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ امہات المومنین کی کردار کشی کا یہ جرم پہلی بار رشدی کی کتاب میں نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ شنیع جرم اس سے پہلے خود زمانۂ رسالت میں کیا جا چکا ہے۔ دوسرے مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کس طرح صفوان ابن معطّل کے ایک واقعہ کو شوشہ بنا کر مدینہ کے کچھ منافقین نے یہ جھوٹا افسانہ گھڑا۔ اور اس کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسائی کی۔

یہ افسانہ اس وقت اتنا زیادہ پھیلایا گیا کہ کئی مخلص مسلمان تک اس سے متاثر ہو گئے۔ ایک مہینہ تک مدینہ کی پوری فضا شرمناک افواہوں سے بھری رہی۔ یہ تکلیف دہ صورت حال صرف اس وقت ختم ہوئی جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے مداخلت فرمائی۔ اور قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے۔ محض جھوٹا پروپیگنڈا ہے، نہ کہ کوئی واقعی حقیقت۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2661)

مگر اس وقت بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام لوگوں کے قتل کا حکم دے دیں جو کردار کشی کی اس جھوٹی مہم میں ملوث تھے۔ کچھ صحابہ نے ایسے افراد کو قتل کرنے کی پیش کش کی۔ مگر آپ نے اس پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ امہات المومنین کی

کردارکشی کے ان مجرمین کو زندہ چھوڑ دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ میں اپنے طبعی موت مرے۔اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے آخری حساب کے لیے پہنچا دیے گئے۔

اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علی وسلم کا جو اسوہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مضبوط انداز میں الزام کی تردید کر کے مجرمین کو چھوڑ دیا جائے تا کہ لوگ ساری عمر ان کی لعنت کریں، اور پھر مر کر وہ اللہ کی عدالت میں پہنچا دیے جائیں تا کہ وہ اپنے خلاف ابدی لعنت کا فیصلہ سنیں اور ہمیشہ کے لیے رسوائی کے گڑھے میں پڑے رہیں۔

یہ ہے اس طرح کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ۔اب اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ سلمان رشدی کی کتاب سے ہمارے جذبات مجروح ہوئے ہیں، اور ہم تو اس کو قتل کر کے رہیں گے،تو میں کہوں گا کہ "مسلمانوں کے جذبات کا مجروح ہونا" اسلام کے قانونِ جرائم کی کوئی دفعہ نہیں ہے۔مسلمان اگر اس قسم کی کاروائی کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کو اپنی قومی سرکشی کے نام پر کر سکتے ہیں۔مگر اسلام کے نام پر اس قسم کا فعل کریں تو انہیں ڈرنا چاہیے کہ ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش میں خود اپنے آپ کو اللہ کی نظر میں زیادہ مجرم نہ بنا لیں۔موجودہ حالات میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان صرف اپنے نفس کی پیروی کر رہے ہیں، نہ کہ خدا اور رسول کی پیروی۔

تعمیل حکم یا سرکشی

سلمان رشدی کے قتل کے نعرہ پر مسلمانوں نے جو دھوم مچائی، وہ حقیقۃً نفسانیت اور سرکشی تھی، نہ کہ شریعت خداوندی کی تعمیل۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ فقہ کی قائم کردہ حد کے اندر نہیں رہے۔بلکہ عقل اور قانون اور شریعت ہر چیز سے آزاد ہو کر اپنے زبان اور قلم کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔

مثال کے طور پر مسلمانوں کے ایک نمائندہ عالم کا مضمون انگریزی اخبار ٹائمس آف

انڈیا (یکم مارچ 1989) میں چھپا۔ پھر یہی مضمون اردو اخبارات میں نمایا طور پر شائع ہوا۔ اس مضمون میں عبدالقادر عودہ (وفات 1954) کی کتاب **التشريع الجنائي الاسلامي** (دارالکاتب العربی، بیروت) کے حوالہ سے حسب ذیل باتیں کہی گئی تھیں:

> ہم مسلمان بین الاقوامیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ہمارا قانون، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ہر مسلمان پر لاگو ہوتا ہے، چاہے وہ جہاں بھی اقامت پذیر ہو۔ یہ جمہور فقہاء (شافعی، مالکی، حنبلی) کا مسلک ہے۔ البتہ حنفیوں کا خیال ہے کہ دیار اسلام سے باہر رہنے والے مسلمان پر اسلامی سزاؤں کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ اسلامی حکومت وہاں احکام نافذ کرنے کے قابل نہیں ہے (**التشريع الجنائي الاسلامي**، جلد 1، صفحہ 278)۔

اس حوالہ کے ذریعہ مضمون نگار نے یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک اسلامی سزا انفاذ کے لیے "قومی سرحدوں" کی کوئی اہمیت نہیں۔ سلمان رشدی اگر مسلم ملک سے باہر (برطانیہ کا باشندہ) ہے، تب بھی اس کو وہاں جا کر قتل کیا جائے گا تو ایسا کرنا عین اسلامی ہوگا۔

مگر یہ ایک لغو بات ہے جس کا کوئی بھی فقیہ قائل نہیں۔ مذکورہ حوالہ جس کو اپنی تائید کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس کا "بین الاقوامی نفاذِ سزا" کے نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس حوالہ کا تعلق دار اسلام اور دار الحرب کی فقہی بحث سے ہے۔ اس میں اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ مسلمان کی جان و مال کی عصمت کا تعلق دار سے ہے یا اسلام سے۔ کتاب کے متعلقہ حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

> اور مسلمان جو کہ دار الحرب میں رہتا ہے اور اس نے دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی ہے تو مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک وہ دار الاسلام کے دوسرے

مسلمانوں کی طرح ہے۔ اپنے اسلام کے ذریعہ وہ اپنے خون اور مال کو محفوظ کر لے گا، خواہ وہ دارالحرب میں مقیم ہو اور کتنی ہی لمبی مدت تک مقیم رہے۔ وہ جب دارالاسلام میں داخل ہونا چاہے تو اس سے روکا نہیں جائے گا۔ جب کہ ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ جو مسلمان دارالحرب میں مقیم ہو اور اس نے دارالسلام کی طرف ہجرت نہ کی ہو وہ اسلام کے باوجود غیر معصوم ہے۔ کیونکہ ابوحنیفہ کے نزدیک عصمت کا تعلق صرف اسلام نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق دار سے ہے۔ (جلد 1، صفحہ 278)

اس محولہ عبارت کا سب وشتم کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق تمام تر دارالاسلام اوردارالحرب کے ایک خاص مسئلہ سے ہے جس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔

دو ملک جب ایک دوسرے سے برسرِ جنگ (at war) ہوں تو دونوں کے لیے ایک دوسرے کا جان و مال مباح ہو جاتا ہے۔ عبدالقادر عودہ نے اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ حربی کا خون اس وقت جائز سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ دارالاسلام میں اجازت کے بغیر داخل ہو جائے۔ اسی طرح مسلم اور ذمّی دونوں کا خون حربیوں کے لیے جائز ہو جائے گا جب کہ وہ دارالحرب میں اجازت اور امان کے بغیر داخل ہو جائیں۔ اگر وہ اجازت یا امان کے ذریعہ داخل ہوں تو دونوں مستامن قرار پائیں گے (التشریع الجنائی الاسلامی، جلد 1، صفحہ 278)۔

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ وہ ملک جو دارلحرب ہو، یعنی جس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حالت جنگ قائم ہو۔ وہاں اگر مسلم اور غیر مسلم دونوں بستے ہیں تو کیا یہ دونوں مباح الدم قرار پائیں، یا ان میں سے کوئی ایک مباح الدم ہو گا۔ اس معاملہ میں فقہاء کی دو رائے ہے۔ ایک کے نزدیک دونوں ہی مباح الدم ہوں گے۔ کیونکہ عصمت (حفاظت جان و مال) کا تعلق "دار"

سے ہے۔ جس ملک سے حالت جنگ قائم ہے، اس کا ہر باشندہ، خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، جنگی قانون کے ماتحت سمجھا جائے، الّا یہ کہ وہ ہجرت کر کے دارالاسلام میں آجائے۔

فقہاء کا دوسرا گروہ دارالحرب کے مسلم آبادی اور غیر مسلم آبادی میں فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک غیر مسلم مباح الدم ہیں، مگر مسلمان مباح الدم نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک عصمت (حفاظت جان و مال) کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ جو شخص مومن و مسلم ہے وہ اپنے عقیدہ کی بنا پر معصوم (محفوظ) ہے، خواہ وہ دارالاسلام میں مقیم ہو یا دارالحرب میں اقامت رکھتا ہو۔

یہ ہے وہ اصل مسئلہ جو مذکورہ کتاب (صفحہ 278) میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس مسئلہ کو غیر واقعی طور پر شتمِ رسول کے مسئلہ سے جوڑ کر یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ شاتم کو ہر حال میں قتل کیا جائے گا، خواہ وہ سرحد کے اُس پار ہو یا سرحد کے اس پار۔

2۔ دوسری بات مذکورہ کتاب کے حوالہ سے یہ کہی گئی ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے سلمان رشدی اسلامی قانون کی گرفت میں آتا ہے، جو کہ ارتداد سزا موت قرار دیتا ہے۔ مزید برآں اگر اسلامی حکومت یہ سزا نافذ نہ کر سکے تو کوئی بھی مسلمان اس کو مجرم کے اوپر نافذ کر سکتا ہے۔ (جلد 1، صفحہ 535)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ہندوستان یا پاکستان سے چل کر انگلینڈ جائے اور وہاں اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت گولی مار کر سلمان رشدی کو ہلاک کر دے تو اس کا یہ فعل عین شریعت (فقہ) کے مطابق ہوگا۔ مگر اس نظریہ کی تائید میں جو حوالہ نقل کیا گیا ہے، اس سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔

عبد القادر عودہ کی کتاب کا مذکورہ اقتباس سب وشتم کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ارتداد کے بارے میں ہے۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ: اصل یہ ہے کہ مرتد کا قتل اقتدار

اور حکومت کا معاملہ ہے۔ اب اگر کوئی فرد حکومت کی اجازت کے بغیر مرتد کو قتل کر دے تو اس پر اس کی گرفت کی جائے گی، بذات خود عمل قتل کی بنا پر نہیں۔ یہی رائے مذاہب اربعہ کے فقہاء کی ہے۔ البتہ مالکی مذہب ایک مختلف رائے رکھتا ہے۔ اس کے علماء کا خیال ہے کہ مرتد غیر معصوم ہے۔ مگر ان کی بھی اسی کے ساتھ یہ رائے ہے کہ قاتل کی تعزیر کی جائے گی اور اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی۔ (جلد 1، صفحہ 535)

عبدالقادر عودہ کی مذکورہ عبارت مرتد کے بارے میں ہے۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ وہ اصولاً اس کو درست نہیں قرار دیتے کہ کوئی شخص ذاتی طور پر کسی مرتد کے اوپر اسلامی سزا کا نفاذ کرے۔ البتہ اگر اتفاقاً کوئی شخص ایسا کر گزرے تو اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ قانوناً قاتل عمد نہیں قرار دیا جائے گا۔

اس مسئلہ کو ناقص اور غلط شکل میں پیش کر کے کہہ دیا گیا کہ کوئی شخص اگر انگلینڈ جا کر بطور خود سلمان رشدی کو قتل کر دے تو عین شرعی اور اسلامی فعل ہوگا۔ یہ بلاشبہ سرکشی ہے، نہ کہ اسلام۔

یہ صحیح ہے کہ فقہاء اسلام کی اکثریت اس رائے پر ہے کہ شاتم رسول کی سزا قتل ہے۔ مگر یہ کوئی استثنائی سزا نہیں ہے جس کی کوئی شرط نہ ہو۔ دوسری اسلامی سزاؤں کی طرح اس کے نفاذ کی بھی کچھ لازمی شرائط ہیں۔ ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر اس کا نفاذ ہرگز درست نہیں۔

عام اصول شریعت کے مطابق، سب سے پہلے یہ ثابت کیا جائے گا کہ واقعتاً شتم کا فعل سرزد ہوا ہے۔ اس ثبوت کی فراہمی کے بعد ایک بااختیار حکومتی ادارہ اس سزا کو مجرم کے اوپر نافذ کرے گا۔ مزید یہ کہ یہ نفاذ صرف اسلامی حکومت کے حدود میں کیا جائے گا، اسلامی حکومت کے حدود سے باہر ہرگز نہیں۔ اس معاملہ میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے پر جوش مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ تمام حدود و شروط سے آزاد ہو کر

جس طرح چاہیں سزا کا نفاذ کریں اور اگر عملی نفاذ نہ کرسکیں تو کم از کم بے قید الفاظ بول کر اس کی دھوم مچائیں۔ مگر یہ شریعت اسلامی کی تعمیل نہیں، یہ یقینی طور پر فکری سرکشی ہے۔ اور یہی فکری سرکشی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں کو متعلقہ فقہی مسئلہ میں وہ دھاندلی کرنی پڑی جس کی ایک مثال اوپر کے حوالہ میں نظر آتی ہے۔ راقم الحروف کو مذکورہ فقہی مسئلہ سے اتفاق نہیں، اس کی بحث ''قیاسی مسئلہ'' کے تحت اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

حکمت اعراض

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی (بری) خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی بابت تحقیق کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ پر نادانی سے جا پڑو۔ پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے (49:6)۔

آدمی کو جب کوئی ناموافق خبر ملتی ہے تو وہ فوراً بھڑک اٹھتا ہے اور فریقِ ثانی کے خلاف کاروائی کرنے کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ مگر ایسے موقع پر اس قسم کا ہنگامی ردِّعمل سراسر غیر اسلامی ہے۔ صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ خبر پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے اور اس بارے میں جو کاروائی کی جائے سمجھ بوجھ کر کی جائے، نہ کہ جذباتی ہیجان کے تحت۔ معاملہ جتنا زیادہ سنگین ہوا اتنا ہی غور وفکر کا محتاج ہوتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: **التَّثَبُّتُ مِنَ اللّٰهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ**۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2012) یعنی، جلدی نہ کرنا اللہ کی طرف سے ہے اور جلدی کرنا شیطان کی طرف سے۔

راقم الحروف کا عمل خدا کے فضل سے اسی شرعی حکم پر رہا ہے۔ چنانچہ جب میں نے سلمان رشدی کی کتاب کی بابت خبریں پڑھیں تو سب سے پہلے میں سلمان رشدی کی اصل انگریزی کتاب سٹینگ ورسز (The Satanic Verses) حاصل کی۔ اور 547 صفحات کی اس کتاب کو پڑھا۔ اسی کے ساتھ میں نے اس معاملہ میں شرعی حکم کی دوبارہ تحقیق کی۔ اس سلسلہ میں دوسری فقہی کتابوں کے علاوہ علامہ ابن تیمیہ کی عربی کتاب '**الصارم المسلول علی شاتم الرسول**' کو حاصل کر کے پڑھا جو 600 صفحات پر مشتمل ہے، اور اس موضوع پر اسلامی کتب خانہ کی واحد جامع اور مفصل کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس دوطرفہ تحقیق کے بعد میں اس موضوع پر لکھنے کا کام شروع کیا۔

مگر مسلم رہنماؤں نے جس طرح عاجلانہ اور ناقص انداز میں اپنے بیانات دیے۔ اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے غالباً اصل کتاب کو پڑھے بغیر محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرکے اس کے خلاف لفظی ہنگاموں کا جوش دکھانا شروع کر دیا۔ مجھے یہ بھی نظر نہیں آتا کہ ان میں سے کسی نے اس احساس ذمہ داری کا ثبوت دیا ہو کہ وہ اس معاملہ میں شرعی حکم کی ازسرنو پوری تحقیق کرے، یا علامہ ابن تیمیہ کی مذکورہ کتاب کو مکمل طور پر پڑھے، اور اس کے بعد اس مسئلہ پر اپنی زبان کھولے۔

اس عجلت پسندی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایران کے آیت اللہ خمینی نے جب سلمان رشدی کے قتل کا فرمان جاری کیا تو اس کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بیان اخبار قومی آواز (20 فروری 1989) میں چھپا۔ اس میں انھوں نے آیت اللہ خمینی کے فرمان کی تائید کرتے ہوئے اس کو حق بجانب قرار دیا۔ مگر کچھ دنوں بعد مولانا موصوف نے تعمیر حیات (10 مارچ 1989) میں دوسرا بیان شائع کیا۔ اس دوسرے بیان میں سابقہ بیان کی تعدیل کرتے ہوئے صرف یہ خبر دی گئی تھی کہ آیت اللہ خمینی کے فرمان سے مسلمانوں کو خوشی ہوئی۔ پہلے بیان میں آیت اللہ خمینی کے فتوے کی ذاتی تصدیق تھی، دوسرے بیان میں صرف مسلمانوں کے ردّ عمل کی ایک اطلاع۔

اسی طرح مولانا ابواللیث اصلاحی کا ایک بیان نئی دنیا (9-3 مارچ 1989) میں چھپا۔ اس میں انھوں نے شیطانی آیات کے مصنف سلمان رشدی کے بارے میں آیت اللہ خمینی کے قتل کے فرمان کو قابلِ تحسین قرار دیا۔ مگر اس کے بعد انھوں نے اخبار دعوت (28 مارچ 1989) میں دوسرا مفصل بیان شائع کیا تو اس میں ان کا انداز واضح طور پر بدلا ہوا تھا۔ پہلا بیان اگر آیت اللہ خمینی کی لائنوں پر تھا تو دوسرا بیان اس لائن پر جو ریاض میں 46 مسلم ملکوں کی کانفرنس میں متفقہ طور پر اختیار کی گئی۔

بظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے، میرا احساس یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب کے سلسلہ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنما مذکورہ حکم الٰہی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب لکھ کر خود اپنے آپ کو ننگا کیا تھا۔ مگر اس کتاب کی اشاعت نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ موجودہ مسلمان دوسروں کو "جہنم رسید" کرنے کے لیے اتنے زیادہ بیتاب ہیں کہ انھوں نے یہ بات بھی بھلا دی ہے کہ انہیں سب سے پہلے اپنے آپ کو "جنت رسید" کرنے کی فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی شخص نہیں جس کی جنت لازمی طور پر خدا کے یہاں رِزرو ہو چکی ہو۔

مذکورہ قرآنی حکم (49:6) کے مطابق، مسلم رہنماؤں پر لازم تھا کہ وہ پہلے اس معاملہ کی تحقیق کرتے اور پھر اس کے تمام پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر اس کے بارے میں مناسب کاروائی کا فیصلہ کرتے۔ مگر انھوں نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے عجلت کا طریقہ اختیار کیا۔ اور فوری ردعمل کے تحت اس کے خلاف تیز و تند بیانات دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کاروائیوں کا سارا فائدہ سلمان رشدی کے خانہ میں چلا گیا، اور اس کا سارا نقصان صرف اسلام کے حصہ میں آیا۔

مسلم رہنما اگر اس معاملہ کی تحقیق کرتے تو انہیں یہ معلوم ہوتا کہ سلمان رشدی کی کتاب اگرچہ نہایت بے ہودہ ہے، مگر اسی کے ساتھ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ کتاب ناقابل مطالعہ بھی ہے۔ وہ کوئی تخلیقی ناول (creative novel) نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فنی اعتبار سے وہ اتنی پست اور اتنی غیر دلچسپ ہے کہ وہ سرے سے اس لائق ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کو شروع سے آخر تک پڑھے۔ مسٹر خوشونت سنگھ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے کہ ناول کسی حیثیت سے بھی پڑھنے کے قابل نہیں۔ ایک اور انگلش جرنلسٹ مسٹر ارن شرما نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ تیسرے درجہ کا موضوع، دوسرے

درجہ کا مصنف، اور اول درجہ کا کاغذ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی موت آپ مرجاتی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی زندگی نہیں۔ یہ صرف مسلمانوں کا احمقانہ شوروغل ہے جس نے اس کو غیر ضروری طور پر زندہ کر دیا۔ اور نہ پڑھنے والے لوگ بھی اس کو خریدنے کی طرف مائل ہوگئے۔ اگرچہ ان خریدنے والے لوگوں کے ذوق کا یہ بہتر اندازہ ہوگا اگر ہم یقین کریں کہ وہ لوگ پوری کتاب کو پڑھنے کی مشقت بھی ضرور برداشت کریں گے۔

ٹائم میگزین کے ایک قاری (Margareta du Rietz) نے اس معاملہ پر بہترین تبصرہ کیا جو ٹائم (20 مارچ 1989) میں چھپا ہے۔ اس نے کہا کہ بہت ہی کم لوگوں نے اس ناول پر دھیان دیا تھا، خمینی کا شکریہ کہ آج وہ عالمی شہرت کی کتاب بنی ہوئی ہے:

"Very few took note of this novel. Now, thanks to Khomeini, it is world famous."

نیویارک ٹائمس کی رپورٹ کے مطابق سلمان رشدی کی یہ کتاب امریکا میں اس وقت سب سے زیادہ بکنے والی کتاب (best seller) بنی ہوئی ہے۔ کتاب کے پبلشر نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ہم امام خمینی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، کیونکہ وہ ہمارے سب سے بڑے سیلس مین (salesman) ثابت ہوئے ہیں۔

سلمان رشدی کے سلسلہ میں بے شمار چیزیں اخبارات ورسائل میں چھپ چکی ہیں، ایک خط جو ڈبلیو ایم شیخ کے قلم سے تھا، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے، یہ خط ٹائمس آف انڈیا (9 نومبر 1988) میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا — رشدی کو نظر انداز کرو:

Ignore Rushdie

"I have read various comments on Salman Rushdie's

controversial novel, 'The Satanic Verses,' including his letter to our Prime Minister, and I believe that the decision to ban the book is both unfortunate and unnecessary. Some years ago, Mr. Rushdie wrote a novel called 'Midnight's Children,' published in 1981, which brought him fame but not substantial wealth. Following this novel, Mr. Rushdie embarked on a lecture tour in India. I had the opportunity to attend two of his lectures, one at the University Hall and the other at the President Hotel. On both occasions, I found Mr. Rushdie to be a delightful intellectual.

However, over the years, Mr. Rushdie has become a shrewd businessman. He strategically revolves his novels around controversial themes. Immediately after 'Midnight's Children,' he wrote the novel 'Shame' about Pakistan, which was promptly banned in the country. This was precisely Mr. Rushdie's intention. Every literate individual in Pakistan likely paid exorbitant prices to purchase and read this novel.

This time, he has employed the same tactic in writing 'The Satanic Verses.' I am sure that every bookseller in India must be secretly selling or will sell this book to the Indian public at inflated prices, ensuring Mr. Rushdie's financial success. Therefore, I urge my Muslim brethren in India and Pakistan not to be deceived by Mr. Rushdie's cunning tricks and strategies.

His comments on the Prophet of Islam appear lukewarm compared to those written by men like Edward Gibbon. The writings of Christian authors about the Prophet of

Islam, particularly during the aftermath of the Crusades, are filled with lies and clear defamation. Compared to those works, Mr. Rushdie's writings should not deceive us. He can be considered a mediocre writer and, at worst, an unremarkable wordsmith. If we ignore his book, I am confident it will disappear naturally."

مسلم رہنما اگر اس معاملہ میں قرآنی حکم پر عمل کرتے، اور اقدام سے پہلے اس کے بارے میں غور وفکر کرتے تو یقینا انھیں معلوم ہوجاتا کہ اس کتاب کے بارے میں صحیح ترین ردّعمل وہ ہے جس کی رہنمائی خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے ایک قول میں ملتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ باطل کو ہلاک کرو، اس کے بارے میں چپ رہ کر: **أَمِيتُوا الباطِلَ بِالصَّمْتِ عَنْهُ** (دیکھیے، حلیۃ الاولیاء للاصفہانی، جلد 1، صفحہ 55)۔

حضرت عمر کا قول

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مذکورہ قول بہت بامعنی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز بظاہر یقینی طور پر "باطل" ہو، تب بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے خلاف جنگ وقتال چھیڑ دیا جائے، اور اس کو ہلاک کرنے کے نام پر ہنگامہ کیا جانے لگے۔ باطل کو باطل جانتے ہوئے بھی بعض اوقات ضروری ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے خاموشی اختیار کرلی جائے۔

باطل کو باطل ثابت کرنا اس کے حق میں زیادہ بڑا قتل ہے۔ باطل کو نظر انداز کرنے کا خاص فائدہ یہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کبھی ہلاک نہ کرنے ہی کا نام ہلاک کرنا ہوتا ہے۔ کبھی نظر انداز کرنا زیادہ بڑی سزا دینے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ مگر نادان لوگ اس راز کو نہیں جانتے۔ شور کی زبان کو سمجھنے والے چپ کی زبان کو نہیں سمجھتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ اس وقت

آپ کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جو شخص تم کو توہین کرتا ہوا نظر آئے، اس کو فوراً قتل کردو۔ قرآن میں کثرت سے ایذا رسانی کا ذکر ہے، مگر اس قسم کا حکم کہیں بھی نہیں دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں کہا گیا ہے کہ ان کی ایذا رسانی کو نظر انداز کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو: وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (33:48)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہانت اور ایذا رسائی کا جواب صرف یہی نہیں ہے کہ مجرم کو سزا دی جائے۔ اس کا ایک کامیاب جواب یہ بھی ہے کہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اس کو قانون قدرت کے حوالہ کر دیا جائے۔

یہ اسلام کی عظیم الشان حکمت ہے، یہی وہ خاص حکمت ہے جس کو امیر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ نے اس طرح بیان کیا— جہاں میری زبانی تنبیہ کافی ہو، وہاں میں اپنی تلوار نہیں اٹھاتا، اور جہاں میری خاموشی کافی ہو وہاں میں کلام نہیں کرتا: لَا أَضَع سَيفي حَيثُ يَكْفِينِي سَوْطِي وَلَا أَضَع سَوْطِي حَيثُ يَكْفِينِي لساني ۔ (غریب الحدیث لابن قتیبہ الدینوری، جلد 2، صفحہ 413)

پرنٹ میڈیا، الکٹرانک میڈیا

مسلم رہنماؤں کو یہ جاننا چاہیے تھا کہ اس معاملہ میں ان کا اقدام کوئی سادہ اقدام نہیں ہے۔ یہ پوری مغربی دنیا کے "مذہب" پر براہ راست حملہ ہے۔ مسٹر ایڈورڈ مارٹیمر (Edward Mortimer) نے بجا طور پر کہا ہے کہ جس طرح مسلمانوں کا مذہب اسلام ہے، اسی طرح ہمارا مذہب آزادی (Freedom) ہے۔ مسلمان اپنے مذہب کی توہین یا اس پر حملہ سے جس طرح بپھر اٹھتے ہیں، ہم کو بھی اسی طرح سخت تکلیف پہنچتی ہے جب کہ ہمارے مذہب (آزادی) پر حملہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے نزدیک اگر رسول کی بے حرمتی کلمۂ کفر (Blasphemy) ہے تو ہمارے نزدیک آزادی کی بے حرمتی اتنی شدت سے کلمۂ

کفر کی حیثیت رکھتی ہے (ٹائمس آف انڈیا، 28 فروری 1989)۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح مسلم دنیا سلمان رشدی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے، اسی طرح مغربی دنیا سلمان رشدی کے معاملہ کو اپنا معاملہ بنا کر اس کی حمایت پر کمر بستہ ہے۔ مغربی دنیا کی طرف سے سلمان رشدی کی حمایت کا سبب "اسلامی دشمنی" نہیں ہے، جیسا کہ مسلم رہنما سطحی طور پر اس کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ بلکہ یہ اپنے "مذہب" کا دفاع ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح مسلمان اپنے مذہب کے دفاع کے لیے متحرک ہیں۔

اس طرح یہ لڑائی، مسلمان بمقابلہ رشدی نہیں رہی، بلکہ مسلمان بمقابلہ مغرب بن گئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں پوری مغربی دنیا ازسرنو اسلام کے خلاف نفرت اور حقارت سے بھر گئی ہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد پورے یورپ میں اسلام کے خلاف شدید نفرت کا طوفان آیا تھا جو صدیوں تک پوری طاقت سے جاری رہا۔ تاہم موجودہ زمانہ کے سائنسی انقلاب نے اس مذہبی نفرت کو بڑی حد تک ختم کر دیا تھا۔ اور دوبارہ وہ معتدل ماحول پیدا ہو گیا تھا جس میں اہل یورپ کو اسلام کی دعوت دی جائے اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔

یہ حالات اس درجہ موافق تھے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد، یورپ اور امریکا میں اسلامی دعوت کا کام اپنے آپ ہونے لگا۔ اس عمل کو 1979 میں پہلا جھٹکا لگا جب ایران میں نام نہاد اسلامی انقلاب آیا۔ اس کے بعد انقلابیوں کے ہاتھوں پیش آنے والے وحشیانہ واقعات نے ساری دنیا میں لوگوں کو اسلام سے بیزار کر دیا۔ ایران کا انقلاب صرف اینٹی شاہ انقلاب تھا، نہ کہ کوئی اسلامی انقلاب۔ اس کے رہنما اس کو اینٹی شاہ انقلاب بتاتے تو اسلام بدنامی سے بچ جاتا۔ مگر خلاف واقعہ طور پر اسلامی انقلاب اس کو اسلامی انقلاب کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام بدنام ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد 1989 میں مسلمانوں نے سلمان رشدی کے خلاف (عملاً پورے مغرب

کے خلاف) جو نا قابل فہم حد تک غیر عاقلانہ تحریک چلائی اس نے سارے مغرب میں اسلام کے خلاف سوئی ہوئی نفرتوں کو دوبارہ نئے عنوان سے جگا دیا۔ مسلمان سلمان رشدی کو قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے البتہ انھوں نے اپنی بے معنی سرکشی کے ذریعہ اسلام کے دعوتی امکانات کو یقیناً قتل کر دیا۔

موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت اسلام کے حق میں جو دعوتی فضا بنی، اس کو بنانے میں مسلم رہنماؤں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ یہ تمام تر اللہ تعالیٰ کا معاملہ تھا جو براہ راست قانونِ قدرت کے تحت پیش آیا۔ مسلم رہنماؤں کی یہ غلطی (صحیح تر لفظ میں سرکشی) بلاشبہ آخری حد تک نا قابل معافی ہے۔ یہ جرم یقیناً سلمان رشدی کے جرم سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ سلمان رشدی کو مجرم کے کٹھرے میں کھڑا کرنے کی کوشش میں مسلم رہنماؤں نے خود اپنے آپ کو شدید تر قسم کے مجرمانہ کٹھرے میں کھڑا کرالیا۔

ٹائمس آف انڈیا (9 مارچ 1989)، سیکشن 2) کے صفحہ اوّل پر پہلی خبر کی سرخی یہ ہے — رشدی کی کتاب اسلام اور مغرب کے ٹکراؤ کو دوبارہ جگاتی ہے:

'Verses' rekindle Islam-West conflict

رائٹر کی اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان 13 صدیوں سے جو سیاسی اور فوجی رقابت قائم تھی، جس نے دونوں کے درمیان تعصب اور غلط فہمی کی تلخیاں پیدا کر رکھی تھیں، وہ سلمان رشدی کے ناول ''شیطانی آیات'' کے ذریعہ از سر نو زندہ ہو گئی ہیں۔ 1979 میں ایران کے نام نہاد انقلاب کے ذریعہ اسلام اور مغرب کے درمیان تعصب کی جو فضا پیدا ہوئی تھی اس کے بعد یہ دوسرا شدید ترین واقعہ ہے جو رشدی کی کتاب کے ذریعہ سامنے آیا ہے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان یہ کشمکش اسپین اور فرانس میں مسلمانوں کے حملہ سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد قرون وسطی میں صلیبی جنگوں اور اس کے بعد 19 ویں صدی میں

مسلم دنیا پر یورپ کی فتح کی بنا پر دونوں ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھتے رہے (صفحہ 1) ۔اس طرح کی مختلف تفصیلات دیتے ہوئے رپورٹر نے بتایا کہ کس طرح اسلام اور مغرب کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات چھپے ہوئے ہیں۔

یہ رپورٹ بطور واقعہ صحیح ہے۔اس نفرت نے ایک ہزار سال سے مغرب کے درمیان اسلام کی وسیع اشاعت کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔جدید سائنسی انقلاب نے مذہب کو غیر موثر بنا کر اس میں بہت زیادہ کمی کی ہے تاہم سطح کے نیچے اب بھی یہ منفی جذبات اہلِ مغرب کے درمیان موجود ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔قرآن وسنّت کی رہنمائی میں ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ یک طرفہ ”صبر“ کے ذریعہ ہم حالات کو خوشگوار بنائیں تا کہ وہ معتدل فضا قائم ہو جس میں موثر طور پر اہلِ مغرب کے درمیان اسلام کی دعوت واشاعت کا کام کیا جا سکے۔

دعوت کے حق میں موافق فضا بنانے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل ہر قسم کی توہین اور اذیت کو برداشت کیا۔حتی کہ دعوتی امکان کو کھولنے کے لیے معاہدہ حدیبیہ کے موقع پر آپ نے لفظ ”رسول اللہ“ کو خود مٹا دیا، حالانکہ یہی آپ کی اصل حیثیت تھی اور اسی کے اعلان کے لیے آپ دنیا میں تشریف لائے۔

اس سنّت رسول کے مطابق مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ سلمان رشدی کی کتاب کے بارے میں مکمل طور پر نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کرتے۔اس طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کے مطابق، رشدی کی کتاب اپنی موت ہی مر جاتی۔دوسری طرف اس طرزِ عمل کا یہ فائدہ ہوتا کہ مختلف اسباب کے تحت مغرب میں اسلامی دعوت کے جو امکانات کُھل رہے ہیں، ان کا عمل بدستور جاری رہتا۔یہاں تک ک وہ وقت آجاتا کہ مغربی دنیا

غیر متعصّبانہ ذہن کے تحت اسلام کا مطالعہ کرنے لگے، اور بالآخر وہ خدا کی رحمتوں کے سائے میں آجائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف اسباب کے تحت موجودہ مغربی دنیا میں اسلامی دعوت کے نئے امکانات کھلے ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ مسلم رہنماؤں نے نہ ان جدید امکانات کو دیکھا اور نہ وہ ان کو استعمال کر سکے۔ کچھ لوگ رنگ کے اندھے (colour-blind) ہوتے ہیں انہیں ایک رنگ دکھائی دیتا ہے اور دوسرا رنگ بالکل نظر نہیں آتا۔ اسی طرح موجودہ مسلم رہنما دعوت کے اندھے (dawah-blind) ثابت ہوئے ہیں۔ انہیں ہر دوسری چیز دکھائی دیتی ہے، مگر دعوت کا معاملہ انھیں نظر نہیں آتا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم رہنما دعوت کے امکانات سے بالکل بے خبر ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص ایسی حرکت کر دے جس سے ان کے قومی وقار کو ٹھیس پہنچے تو اس کو وہ مبالغہ آمیز شدت کے ساتھ فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔ دعوتی امکانات کے بارے میں اپنے اندھے پن کی وجہ سے وہ ایک بار بھی دعوت کے لیے سرگرم نہ ہو سکے۔ دوسری طرف وہ اپنی قومی توہین کے معاملہ میں اپنی بے جا سرگرمیوں کے ذریعہ پوری دنیا کو گرد آلود بنا رہے ہیں۔

اگر خدا کا دین وہی ہے جو قرآن اور حدیث میں بتایا گیا ہے، تو یقینی طور پر مسلم رہنماؤں کی یہ سرگرمیاں صرف مجرمانہ سرگرمیاں ہیں، وہ کسی بھی درجہ میں خدا اور رسول کا مطلوب کام نہیں ۔ ان جھوٹی سرگرمیوں کے نتیجہ میں موجودہ مسلم رہنماؤں کو جو شہرت اور قیادت مل رہی ہے، اس نے انہیں اس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ نصیحت کی کوئی بات سن سکیں ۔مگر عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب کہ فرشتے کی چنگھاڑ کے ذریعہ یہ حقیقت زمین اور آسمان کے اندر گونجے گی، اس وقت وہ اس کو مان لیں گے۔ اگرچہ اس وقت کا ماننا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔

دورِ آزادی

انڈیا کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (28 فروری 1989، سیکشن 2) کے صفحہ 3 پر ایک برطانی صحافی ایڈورڈ مارٹیمر (Edward Mortimer) کا مضمون چھپا ہے جس کا عنوان یہ ہے — رشدی معاملہ آزاد دنیا کے لیے براہِ راست خطرہ۔

THE RUSHDIE AFFAIR DIRECTLY THREATENS THE 'FREE WORLD'

"We find ourselves caught up in a religious War, a war of ideas... Their (British people) reaction arouses no less passionate feelings of outrage in us because it is equally offensive to our religion. By "our religion", I do not mean Christianity. The Christian establishment is, in fact, very awkwardly placed in this affair: it disapproves strongly of incitement to murder but feels some sympathy with the Muslim demand for censorship of "blasphemy". However, Christianity is no longer the religion of Britain in the sense that Islam is the religion of Iran. It is not Christianity that binds us together as a community because we have long since given up trying to impose religious uniformity on ourselves or to exclude unbelievers and members of other faiths from full participation in our national life. The religion of this country and of the "Free World" to which it belongs is, precisely, freedom. Its founding fathers are Locke, Voltaire, Burke, Wilkes, and Tom Paine, the authors of the American Constitution and the La Déclaration des droits de l'Homme. Unlike Iranians, we are

brought up to think it primitive to fight over metaphysical beliefs but to think of fighting for freedom as something admirable. Of course, like other peoples, we practise this religion imperfectly, and not everyone takes it as seriously as journalists, the self-appointed priests or mullahs of the cult. But the idea of sentencing a writer to death for what he wrote is just as offensive to modern Western sensibilities as the idea that Christ might have liked to make love to Mary Magdalene or that the Prophet might occasionally have listened to Satan is to traditional Christian or Muslim ones." (By arrangement with the Financial Times)

مضمون نگار نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

ہم اپنے آپ کو ایک مذہبی جنگ میں گھیرا ہوا پاتے ہیں، نظریات کی جنگ — برطانی لوگوں کے ردعمل سے ہمارے اندر بھی ہتک کا اتنا ہی احساس پیدا ہوتا ہے جتنا مسلمانوں کو "شیطانی آیات" نامی کتاب سے۔ کیونکہ اس کتاب کے خلاف ردعمل یکساں طور پر ہمارے مذہب پر حملہ ہے۔ "ہمارے مذہب" سے میری مراد عیسائیت نہیں ہے۔ عیسائیت اس معنی میں اب برطانیہ کا مذہب نہیں جس معنی میں اسلام ایران کا مذہب ہے۔ یہ مسیحیت نہیں جو کہ ہم کو ایک قوم کی حیثیت سے مجتمع کرتی ہو، کیونکہ عرصہ ہوا ہم اس کو اس اعتبار سے چھوڑ چکے ہیں۔ اس وقت برطانیہ کا مذہب، صحیح لفظ میں، آزادی ہے۔ اس مذہب کے بانی لاک، والٹیر، برک، ولکیز اور ٹام پین ہیں۔ امریکی دستور کے مصنفین اور حقوق انسانی کے منشور نے اس کی تشکیل کی ہے۔ ہماری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ ہم آزادی کی لڑائی کو ایک قابل تعریف کام سمجھیں۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح، ہم اس مذہب آزادی پر غیر معیاری انداز میں عمل کرتے ہیں۔

اگرچہ صحافی جو گویا اس مذہب کے پادری اور ملّا ہیں، ان کے سوا کوئی اس انحراف کو بہت سنجیدہ معنوں میں نہیں لیتا۔ مگر یہ تصور کہ ایک ادیب کو اس کی لکھی ہوئی چیز کی بنا پر قتل کر دیا جائے، یہ جدید مغربی حساسیت کے لیے ویسا ہی تصور ہے جیسا کہ مسیحیوں کے لیے یہ تصور کہ مسیح، مریم کے ساتھ جنسی تعلق قائم کریں یا مسلمانوں کے لیے یہ تصور کہ پیغمبر کے الہام میں کبھی کبھی شیطان کا القاء بھی شامل رہتا تھا۔

ایڈورڈ مارٹیمر کی بات جو اوپر نقل کی گئی، وہ باعتبار واقعہ صدفی صد درست ہے۔ سلمان رشدی کے معاملہ میں نادان مسلمانوں نے جو ہنگامے کیے، اس کے خلاف مغرب کے شدید ردعمل کی وجہ یقیناً یہی ہے۔ جو لوگ اس معاملہ میں مغرب کے رویہ کو اسلام دشمنی یا اسلام کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں۔ وہ صرف اپنی جاہلانہ بے بصیرتی کی خبر دے رہے ہیں، نہ کہ کسی حقیقت واقعہ کا اعلان کر رہے ہیں۔ جو لوگ حقیقتوں کو اتنا کم جانیں، ان کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان بند رکھیں، نہ کہ سطحی الفاظ بول کر غیر ضروری طور پر عوام کا ذہن خراب کریں۔

اس طرح کے معاملات کو مغرب کی "اسلام دشمنی" بتا کر لفظی شور کرنے کا فائدہ کچھ نہیں ، البتہ اس کا نقصان یقینی ہے۔ اگر بالفرض یہ دشمنی کا معاملہ ہو تو اخباروں اور جلسوں میں الفاظ کی چیخ پکار کرنے سے اس میں ایک فی صد بھی کمی آنے والی نہیں۔ البتہ اس کا یقینی نقصان ہے کہ مسلمانوں کا دل بغض و انتقام سے بھر جائے۔ مدعو قوموں کے بارے میں ان کے اندر وہ ناصحانہ جذبہ باقی نہ رہے جو داعی کی حیثیت سے ان سے مطلوب ہے۔ دعوت کا تقاضا ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان کشیدگی کی فضا نہ ہو۔ مگر اس قسم کے ہنگاموں نے مسلمانوں اور دوسری قوموں کے تعلق کو دعوت کے بجائے عداوت کی بنیاد پر قائم کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے، جس طرح بولنا ایک کام ہے۔ بولنے کے موقع پر نہ بولنے والا اگر گونگا شیطان ہے، تو نہ بولنے کے موقع پر بولنے والا ناطق

شیطان۔ اور باعتبار نتیجہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

آزادی کا مذکورہ مطلق تصور بظاہر اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن اگر اس کو گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو عین اسلام کے حق میں نظر آئے گا، کیونکہ آزادی کے اس جدید انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار عالمی سطح پر ایسی صورت حال پیدا کی ہے کہ دعوت کے دروازے بے اندازہ حد تک کھل گئے ہیں۔ آزادی جتنی زیادہ عام ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ مسلمانوں کے لیے دعوت کے زیادہ وسیع مواقع کھولنے کا سبب بنے گی۔ اور دعوت کے مواقع کھلنا، قرآن کے الفاظ میں، فتح مبین کا دروازہ کھلنا ہے۔

قدیم زمانہ میں اظہارِ خیال کی آزادی کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں دینِ حق کی آزادانہ تبلیغ ممکن نہیں ہوتی تھی، توحید کا نام لیتے ہی داعیان توحید کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ توحید کی طرف لوگوں کو بلانے میں کوئی سیاسی رکاوٹ حائل نہیں رہی۔

یہ جدید انقلاب تمام تر اسی تصور آزادی کی دین ہے جس کا ذکر ایڈورڈ ماٹمیر نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ اس آزادی نے تاریخ میں پہلی بار ہر ایک کے لیے اپنے فکر وخیال کے اظہار کے تمام دروازے کھول دیے ہیں۔ آزادیِ فکر آج ایسا مسلّمہ حق بن چکا ہے جس سے انکار نہ کیا جاسکے۔

مگر یہ آزادی لازمی طور پر سب کے لیے ہوگی، نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے۔ اپنے لیے آزادیِ کامل کا حق پانے کے لیے دوسروں کو بھی آزادیِ کامل کا حق دینا پڑتا ہے، یہ دنیا دوطرفہ ٹریفک کی جگہ ہے۔ یہاں یک طرفہ ٹریفک کا طریقہ ہرگز ممکن نہیں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ سڑک کے اوپر اپنی گاڑی تیز دوڑائیں تو آپ کو دوسروں کے لیے بھی اس کا موقع دینا ہوگا۔ دوسروں کو موقع دیے بغیر اپنے لیے موقع پانا ہرگز ممکن نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ’’ٹریفک‘‘ کے لیے کچھ اخلاقی ضابطہ ہونا چاہیے۔ مگر ضابطہ صرف مشترک امور میں قابل عمل ہے، وہ انفرادی اور گروہی امور میں قابل عمل نہیں۔ یعنی وہ اصول جس کا تعلق تمام لوگوں سے ہو، جو ہر ایک کی عمومی ضرورت ہو، اس کی بندش تو قائم کی جاسکتی ہے۔ مگر کسی شخص یا گروہی دلچسپی کی بات پر عمومی ضابطہ بندی ممکن نہیں۔ اور اگر جوش اصلاح میں کوئی حکمراں ایسی ضابطہ بندی نافذ کرے جو ایک کے موافق اور دوسرے کے خلاف ہو تو وہ عملی طور پر کبھی نافذ نہیں ہو سکے گی۔ وہ صرف ایک کاغذی کارروائی بن کر رہ جائے گی۔

اس کی ایک مثال خود سلمان رشدی کی کتاب ہے۔ اس نزاعی کتاب پر ہندوستان اور پاکستان میں پابندی لگائی گئی۔ مگر دونوں ملکوں میں اس کے غیر قانونی ایڈیشن فروخت ہو رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے یہ کتاب کھلے بازار میں ملتی، اب وہ بلیک مارکیٹ کے ذریعہ لوگوں تک پہنچ رہی ہے۔ قانونی پابندی کے باوجود کتاب پر حقیقی پابندی لگانا ممکن نہ ہو سکا۔

جمہوری ملکوں میں آزادانہ تجارت کا حق ہے۔ اس آزادی نے اگر کپڑے اور جوتے اور غلہ کے تاجروں کو موقع دیا ہے کہ وہ تجارتی ادارے کھول کر بڑے بڑے نفع کمائیں تو اسی کے ساتھ شراب جیسی ناجائز چیزوں کی دکانیں بھی کھلی ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود کڑوروں مسلمان آزادانہ تجارت کے اس ماحول سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ تجارت کے ذریعہ دولت کما کر اپنے خاندان کے لیے اور ملّی اداروں کے لیے نفع پہنچانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ کسی مسلمان نے ایسا نہیں کیا کہ وہ اس آزادی سے صرف اس لیے فائدہ نہ اٹھائے کہ اس کی وجہ سے شراب فروشوں کو بھی آزادانہ تجارت کا موقع حاصل ہو گیا ہے۔

ذاتی انٹرسٹ کے معاملہ میں تمام مسلمان اسی حکمت کو عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں، مگر جب ملّت کا سوال سامنے آئے تو فوراً یہ جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ’’پہلے شراب کی دکان‘‘ بند کرو، اس کے بعد ہم بازار میں ’’کپڑے کی دکان‘‘ کھولیں گے۔ دوسروں پر

پابندی قائم کرنے سے پہلے ہم آزادی سے فائدہ اٹھانے والے نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدۂ حدیبیہ کے موقع پر فریق مخالف کو اس کا پابند کرنا چاہتے تھے کہ وہ آپ پر یا آپ کے حلیف قبائل پر حملہ نہ کریں۔ اس کی خاطر آپ کو خود اپنے آپ کو بھی اس کا پابند کرنا پڑا کہ آپ فریق مخالف کے اوپر یا اس کے حلیف قبائل کے اوپر حملہ نہیں کریں گے۔ حالانکہ خود خدا کی گواہی کے مطابق، یہ یقینی تھا کہ آپ پوری طرح انصاف پر ہیں اور فریق ثانی پوری طرح ناانصافی پر۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کی طرف سے یہ حق اس وقت ملا جب کہ آپ دوسروں کو بھی اپنی طرف سے یہ حق دینے پر راضی ہو گئے۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ عمومی آزادی کے نتیجہ میں کچھ بے اعتدالیاں پیدا ہوں گی۔ مثلاً کچھ لوگ اسلام پر بے جا تنقید کریں گے۔ یا ایسی کتابیں چھاپیں گے جو مسلمانوں کو اسلام کی اہانت معلوم ہوں۔ مگر یہاں مسلمانوں کو جس چیز پر اعتماد کرنا چاہیے وہ اسلام کی ناقابلِ شکست صداقت ہے، نہ کہ قانون کی پشتہ بندی۔ کیونکہ جس شخص کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے پستول اور بندوق اور رائفل ہو وہ کبھی غلیل حاصل کرنے کے لیے نہیں دوڑتا۔ جب اسلام ایک کامل صداقت ہے تو ہمیں اس قسم کی باتوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔

اگر مسلمانوں کو اس حقیقت کا صحیح احساس ہو تو وہ مخالفین کے الفاظ کو مزید طاقتور الفاظ سے رد کریں گے۔ وہ ان کی تحقیر و اہانت کو دلائل کے سیلاب سے ہباءً منثوراً بنا دیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس اپنے مذہب کے حق میں فخر و ناز کا ذخیرہ تو ضرورت سے زیادہ ہے، مگر دلائل و براہین کا ذخیرہ ضرورت سے بھی کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہانت کا کوئی لفظ دیکھ کر بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو اپنی کمی کو دور کرنا، نہ کہ دوسروں کے خلاف مشتعل ہو کر اسلام کی جگ ہنسائی کا سامان کریں۔

رشدی یا اس جیسے دوسرے افراد کے خلاف مسلمان جو شور وغل کرتے ہیں، اس کو وہ بطور خود "ناموسِ رسول کی حفاظت" کا نام دیتے ہیں۔ اگر ان ہنگاموں کا مقصد واقعۃً "ناموسِ رسول کی حفاظت" ہو تو ان کی یہ سرگرمیاں سراسر بے فائدہ ہیں۔ کیونکہ وہ ناموسِ رسول کی مفروضہ حفاظت میں سراسر ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

سوامی شردھانند ہندوستان میں شدھی تحریک کے بانی تھے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "رنگیلا رسول" تھا۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں نے اس کتاب کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ کتاب پیغمبر اسلام کی "شان اور عظمت کے خلاف نہایت توہین آمیز تھی"۔ آخر کار یہ واقعہ پیش آیا کہ دسمبر 1926 کی آخری تاریخوں میں ایک مسلم نوجوان نے سوامی شردھانند کو قتل کر دیا۔ اس نوجوان کا نام عبدالرشید تھا۔ اس کی بیوہ ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو خوشی خوشی اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ ناموس رسول کی حفاظت کے لیے قربان ہو جائے۔

لیکن اگر ناموس رسول کی حفاظت کا طریقہ یہی ہو تو یقیناً یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ اس قتل کے بعد شردھانند نے اس ملک کی اکثریت کے درمیان قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر لی۔ ملک کی تاریخ میں ان کو "شہید" کا مقام دیا گیا۔ 1947 میں ہندوستان آزاد ہوا تو راجدھانی دہلی کے ممتاز مقام (چاندنی چوک) پر ان کا بلند وبالا مجسمہ عین شاہرہ پر نصب کر دیا گیا، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے کسی عمل کو ناموس رسول کے نام پر بے فائدہ جان دے دینا تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کو ناموس رسول کی حفاظت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ قربانی نہیں ہے بلکہ نادانی ہے، جس کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔

مسلمان دوسروں کی جن باتوں پر بھڑکتے ہیں، خود بھی وہ دوسروں کے لیے اسی قسم کے

الفاظ بولتے ہیں۔ مگر موجودہ مسلمانوں کی خوش قسمتی یہ ہے کہ دوسرے لوگ اپنے مذہب کے بارے میں اتنے حساس نہیں ہیں۔ جتنا کہ مسلمان، اپنی شکست خوردگی کی بنا پر حساس ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے کوئی مسلمان جب دوسروں کے مذہب کے بارے میں سخت الفاظ بولتا ہے تو اس کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب دوسرے فرقوں کا کوئی شخص اسلام کے خلاف سخت الفاظ استعمال کرتا ہے تو مسلمان فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مسلمان غیر شعوری طور پر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم دوسروں کے خلاف کچھ نہیں کہتے، البتہ دوسرے لوگ ہمارے خلاف بولتے رہتے ہیں، حالانکہ یہ خوش فہمی واقع کے مطابق نہیں۔

ایک مثال لیجیے۔ جنوبی افریقہ کے احمد دیدات صاحب دوسرے مذاہب کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں اور لٹریچر چھاپتے ہیں۔ وہ جس قسم کی زبان بولتے ہیں، اس کا نمونہ یہ ہے کہ ان کے انگریزی بلیٹن البرہان (دسمبر 1988) میں ان کا انٹرویو چھاپتے ہے۔ اس میں انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مختلف مذاہب کا ذکر کیا اور کہا کہ ان سب پر بلڈوزر چلادو:

"Bulldoze them all." (p.3).

احمد دیدات صاحب یا دوسرے مقرروں کے اس قسم کے الفاظ مسلمانوں کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ ان پر تالیاں بجاتے ہیں۔ لیکن اگر یہی لفظ دوسرا شخص بولے تو وہ غصہ ہو جائیں گے۔ مثلاً ہندوستان میں بال ٹھاکرے اگر یہ کہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بلڈوزر کر دو تو تمام مسلمان مشتعل ہو کر ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔ اس قسم کا دوطرفہ معیار موجودہ امتحان کی دنیا میں ہرگز چلنے والا نہیں۔

مسلمانوں کو یہ جاننا چاہیے کہ جو آزادی انھوں نے خود اپنے لیے لے رکھی ہے، وہ

انھیں دوسروں کو بھی دینی پڑے گی۔ دوسروں کے لیے آزادی کا حق تسلیم نہ کرنے سے وہ دوسروں کو اس آزادی سے محروم تو نہ کرسکیں گے جو انھیں خود زمانہ کی طاقت سے ملی ہوئی ہے۔ البتہ جھوٹے ردعمل کا مظاہرہ کر کے مسلمان اپنی اور بالواسطہ طور پر اسلام کی تضحیک کا سامان ضرور کرتے رہیں گے۔ اور موجودہ حالت میں وہ اپنی روش سے یہی کام انجام دے رہے ہیں۔

مسلمان کو آزادیِ خیال کا سب سے بڑا حامی اور وکیل ہونا چاہیے۔ کیونکہ آزادانہ مباحثہ میں بالآخر جو چیز باقی رہے گی وہ سچائی ہے، اور کامل اور بے داغ سچائی اسلام کے سوا کسی اور کے پاس موجود نہیں۔

زیادہ بڑی سزا

قدیم عرب میں شاعری کا وہی مقام تھا جو موجودہ زمانہ میں صحافت کا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کسی بات کو پھیلانا ہو تو اس کو اخبار میں چھاپ کر پھیلایا جاتا ہے۔ قدیم عرب میں یہی کام اشعار کے ذریعہ لیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مکہ میں چند بڑے بڑے شاعر تھے، مثلاً کعب بن زُہیر، عبداللہ بن الزّبعریٰ اور ہبیرہ بن ابی وہب۔ یہ لوگ اشعار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے اور آپ کو اذیت پہنچاتے تھے۔ 8ھ میں مکہ فتح ہوا تو یہ لوگ سزا کے ڈر سے مکہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہُبیرہ کفر کی حالت میں مر گیا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 420)۔ بقیہ دونوں نے بعد کو اسلام قبول کرلیا۔ اس دونوں کی تفصیل آگے ذکر کی جارہی ہے۔

جب یہ لوگ مکہ چھوڑ کر بھاگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ ان کے پیچھے اپنے آدمی دوڑائیں۔ یا یہ اعلان کریں کہ جو شخص ان کو قتل کرے گا اس کو اتنا انعام دیا جائے گا۔ اس کے برعکس، آپ نے ان کو ہدایت کے لیے دعا کی اور ایسے حالات پیدا کرتے رہے جس سے ان کا ضمیر جاگ اٹھے اور وہ توبہ کرکے اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں تفصیلی واقعات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ وہاں انہیں دیکھا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دونوں شاعروں نے بالآخر اسلام قبول کرلیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی شاعری کا رخ ہجو کے بجائے مدح کی طرف پھیر دیا۔ ان کا اسلام قبول کرنا ایک طرف خود ان کی اپنی زبان سے ان کی ماضی کی تردید تھی، دوسری طرف یہ ہوا کہ ان کی

اعلیٰ صلاحیتیں جو اس سے پہلے مخالف اسلام محاذ پر استعمال ہو رہی تھیں وہ اب حمایتِ اسلام محاذ پر استعمال ہونے لگیں۔

1۔ کعب بن زُہیر آخر وقت میں اپنے بھائی بجیر بن زہیر کی ترغیب پر مدینہ آئے تو انصار میں سے ایک شخص ان پر ٹوٹ پڑا اور کہا کہ اے خدا کے رسول مجھے اور اس دشمن خدا کو چھوڑ دیجیے کہ میں اس کی گردن ماردوں (يَارَسُولَ اللّٰهِ دَعْنِي وَعَدُوَّ اللّٰهِ أَضْرِبُ عُنُقَه)۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ انصاری کو خاموش کر کے بٹھا دیا۔ اور کعب بن زُہیر کو قتل کرنے کے بجائے ان کے لیے دعا فرمائی۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 503)

واقعات بتاتے ہیں کہ اس کے بعد کعب بن زہیر نے اسلام قبول کرلیا۔ کعب بن زُہیر اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین ہجو گو شعراء میں سے تھے۔ مگر قبول اسلام کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح خواں بن گئے۔ انھوں نے آپ کی مدح میں ایک شاندار قصیدہ لکھا جو قصیدہ بانت سعاد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قصیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں ایک انتہائی ممتاز قصیدہ سمجھا جاتا ہے۔ ابن ہشام نے اپنی کتاب میں اس کے 59 شعر نقل کیے ہیں (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 513)۔

اس قصیدہ کا ایک مصرعہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ایک نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے: إِنَّ الرَّسَولَ لَنُورٌ يُسْتَضَاءُ بِهِ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 512)۔

ایک شخص جو پیغمبر اسلام پر عیب لگا رہا تھا، اگر پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی فاتحانہ طاقت اس طرح ظاہر ہو کہ وہ اس کو آپ پر ایمان لانے پر مجبور کر دے اور جو شخص اب تک آپ کی ہجو کر رہا تھا، وہ اپنی زبان سے یہ اعلان کرنے لگے کہ پیغمبر اسلام ہدایت کی روشنی

ہیں، ان سے زندگی کے راستے روشن ہوتے ہیں، تو یہ بلا شبہ مذکورہ شخص کے قتل سے ہزار گنا زیادہ بڑا واقعہ ہے۔ یہ دشمن کی زبان سے پیغمبر اسلام کی صداقت کا اقرار ہے، اور بلا شبہ اس زمین پر اس سے بڑا کوئی واقعہ نہیں کہ دشمن اپنی زبان سے اپنے حریف کی صداقت کا اقرار کرے۔

2۔ عبداللہ بن الزبعری مکہ کے ممتاز شعراء میں سے تھا۔ وہ نہایت ذہین ہونے کے ساتھ نہایت گستاخ بھی تھا۔ مکی دور کا واقعہ ہے۔ قرآن میں یہ آیت اتری کہ تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، سب کے سب جہنّم کا ایندھن بنیں گے (21:98)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ والوں کے سامنے یہ آیت پڑھ کر سنائی تو عبداللہ بن الزبعری نے کہا کہ اے محمد، کیا جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے، وہ سب اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنم میں ہوں گے۔ تو ہم لوگ فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہود عزیر پیغمبر کی عبادت کرتے ہیں اور نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کی عبادت کرتے ہیں۔

یہ بلا شبہ نہایت گستاخی کا فعل تھا۔ اپنے کلام کے ذریعہ اس نے خدا اور فرشتوں اور رسولوں کا مذاق اڑایا تھا۔ اور ان کی توہین کی تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سن کر مشتعل نہیں ہوئے، اور نہ ہی اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ اس آدمی نے ناقابل معافی جرم کیا ہے، اس کو قتل کر ڈالو۔ اس کے بجائے آپ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

> جو کوئی یہ پسند کرے کہ اللہ کے سوا اس کی عبادت کی جائے تو وہ اسی کے ساتھ ہوگا جس نے عبادت کی: كُلُّ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَعْبُدَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَهُوَ مَعَ مَنْ عَبَدَهُ (تفسیر الطبری، جلد 16، صفحہ 418)۔

ابن الزبعری نے واضح طور پر استہزاء اور اہانت کا جرم کیا تھا۔ مگر اس کے بعد آپ

نے صرف یہ کیا کہ اس کو ایک ایسا معقول اور مدلّل جواب دیا کہ اس کی بات بالکل بے وزن ہو کر رہ گئی۔ قتل صرف معترض کو ختم کرتا، مگر جوابی کلام نے معترض کا بھی خاتمہ کر دیا اور اسی کے ساتھ اس کے اعتراض کا بھی۔

8ھ میں مکہ فتح ہوا تو عبداللہ بن الزبعری بھاگ کر نجران چلا گیا۔ کیونکہ اس کا ضمیر اس سے کہہ رہا تھا کہ تم نے ایسا جرم کیا ہے کہ اندیشہ ہے کہ تم کو قتل کر دیے جاؤ۔ تاہم اس کا فرار اس کے لیے اطمینان کا سبب نہ بن سکا۔ اب وہ ایک ایسا انسان تھا جس نے یقین کھو دیا ہو اور شک اور تردد کے دلدل میں کھڑا ہوا ہو۔

عبداللہ بن الزبعری کے سلسلہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ اس کے سر پر انعام مقرر کریں اور اپنے اصحاب سے کہیں کہ تم لوگ تلوار لے کر جاؤ اور جہاں بھی اس کو پاؤ، اسے قتل کر دو۔

اس کے برعکس، مسلمانوں کی طرف سے کوشش جاری رہی کہ اس کی سوئی ہوئی فطرت کو جگایا جائے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے شاعر حسّان بن ثابت الانصاری نے عبداللہ بن الزبعری کے بارے میں کچھ تنبیہی اشعار کہے۔ یہ اشعار ابن الزبعری تک پہنچائے گئے۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا کہ تم ایسے آدمی (رسول) کو نہ کھوؤ جس کے بغض نے تم کو لے جا کر دور نجران میں ڈال دیا ہے، جہاں تم اپنوں سے الگ ہو کر غیر شریفانہ زندگی گزار رہے ہو:

لَاتَعْدَمَنْ رَجُلاً أَحَلَّكَ بُغْضُه   نَجْرَانَ فِي عَيْشٍ أَحَذِّ لَئِيمِ

ابن الزبعری کو یہ شعر تیر کی طرح لگا۔ اس کے بعد وہ نجران سے چل کر مدینہ آیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 1، صفحہ 391) قبولِ اسلام کے بعد اس نے بہت سے اشعار کہے۔ ان اشعار میں اس

نے کھلے طور پر اپنی ماضی کی غلطی کا اعتراف کیا۔ پہلے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی تھی۔ اب وہ آپ کی اور آپ کے پیغام کی تعریف میں اشعار کہنے لگا۔ اس کے کچھ اشعار ابن ہشام نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 418)

حقیقت یہ ہے کہ ہجو گو انسان کے اندر بھی ایک مدح گو انسان سویا ہوا ہوتا ہے۔ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ اس مدح گو انسان کو جگائیں، جیسا کہ دور اوّل کے اہل ایمان نے جگایا۔ ہجو گو انسان کو قتل کرنا اگر ایک انتقامی عمل ہے، تو مدح گو انسان کو جگانا ایک داعیانہ عمل۔ اور اس میں شک نہیں کہ انتقامی عمل کے مقابلہ میں داعیانہ عمل کہیں زیادہ اعلیٰ اور افضل ہے۔

ایک شخص جو پیغمبر اسلام کا مذاق اڑائے یا آپ پر اعتراض کرے، اس کی یہ سزا بالکل بے فائدہ ہے کہ اس کو پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کا قتل مقتول کی بات کو رد نہیں کرتا۔ بلکہ لوگوں کا تاثر یہ ہوجاتا ہے کہ اس نے ایک طاقتور بات کہی تھی۔ چونکہ اس کی بات کا علمی رد ممکن نہ تھا، اس لیے مجنونوں نے اس کو مار کر اس کے وجود کو ختم کر دیا۔

مزید یہ کہ تاریخ میں بہت سے سچّے اور بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں جن کو وقت کے ظالموں نے قتل کیا ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مقتول کا رشتہ ان گزرے ہوئے لوگوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ وہ اس کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ پیش آیا ہے جو اس سے پہلے بے شمار سچے انسانوں کے ساتھ پیش آیا۔ اس طرح مخالفین کے ہاتھوں سے قتل ہونا اس کو ''شہیدانِ حق'' کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے۔

یہ کوئی فرضی بات نہیں۔ سلمان رشدی کے اعلان قتل کے بعد عملاً یہی بات پیش آئی ہے۔ مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (5 مارچ 1989) میں ایک مضمون نمایاں طور پر

شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے — مذہبی احتساب:

"Censored by Religion"

اس مضمون میں سلمان رشدی کو تاریخ کے ان بڑے بڑے لوگوں کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے جن کو ان کے مخالفوں نے قتل کر دیا، یا قتل کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سقراط، مسیح، گلیلیو، مارٹن لوتھر، وغیرہ۔ حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، جن کو مکہ کے لوگوں نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مشہور سائنس داں گلیلیو کے انجام کا تذکرہ کرتے ہوئے اس مضمون میں یہ الفاظ درج کیے گئے ہیں کہ گلیلیو کو اپنی آخر عمر تک اپنے گھر کے اندر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی مقدر رشدی کا آج ایک نئی صورت میں ہوسکتا ہے:

"Gallileo was confined to his villa under strict house arrest for the rest of his life, a fate the could well be Rushdie's in a different sort of way today."

واقعہ یہ ہے کہ سب وشتم اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام اور پیغمبر اسلام پر ایک اعتراض ہے۔ اور جو شخص اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراض کرے، اس کی زیادہ بڑی سزا یہ ہے کہ اس کی بات دلیل کے ذریعہ ردّ کر دی جائے۔ اس کو گولی مارنا اگر اس کا جسمانی قتل ہے تو اس کے اعتراض کو ردّ کرنا اس کا ذہنی قتل۔ اور جسمانی قتل کے مقابلہ میں ذہنی قتل بلاشبہ زیادہ سخت ہے، اور زیادہ کارگر بھی۔

تیسرا باب

شتم وارتداد

اسلام میں شاتم کی سزا قتل ہے — یہ ایک بے بنیاد مسئلہ ہے۔ کیوں کہ یہ حکم نہ قرآن سے ثابت ہے، اور نہ حدیث سے۔ البتہ فقہا نے بطور خود ایسے مسائل وضع کر لیے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں، شاتم کی سزا قتل، مرتد کی سزا قتل، وغیرہ۔

اس قسم کے مسائل اسلام کی اسپرٹ کے خلاف ہیں۔ اسلام کے نزدیک ایسے ایمان کی کوئی حقیقت نہیں، جو قانونی جبر کے تحت کسی نے اختیار کیا ہو۔ اسلام وہ ہے، جو قانونی جبر کے تحت نہیں، بلکہ آزادانہ طور پر اختیار کیا گیا ہو۔ اسلام کی اصل ذاتی دریافت ہے۔ مومن وہ ہے جو سیلف ڈسکوری (self discovery) کی بنیاد پر کھڑا ہو۔

اسلام کے مطابق، جہاں کوئی شخص "شتم" یا "ارتداد" میں مبتلا پایا جائے، تو خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے دعا کی جائے، اس سے ڈسکشن کیا جائے۔ اگر اس کے اندر کچھ شک پیدا ہوا ہے، تو اس کے شک کو علمی ڈسکشن کے ذریعے دور کیا جائے۔ اس کو ایک مجرم کی طرح نہ دیکھا جائے، بلکہ اس طرح دیکھا جائے، جس طرح کوئی ڈاکٹر مریض کو دیکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مقصد لوگوں کو فتویٰ دے کر قتل کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو خیر خواہی کے جذبے کے تحت اللہ کی رحمت کے سائے میں لانے کی کوشش کرنا ہے۔ قرآن میں ہے:

فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (88:21-22)۔ یعنی، پس تم یاد دہانی کر دو، تم بس یاد دہانی کرنے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں۔

اصل حقیقت کے اعتبار سے ایسے افراد کا کیس بے خبری (unawareness) کا کیس ہوتا ہے۔ داعی یا مصلح کا کام یہ ہے کہ اس کی بے خبری کو توڑا جائے، اس کی فطرت کو بیدار کیا جائے۔ اس کو اپنے خالق سے قریب ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس کے اندر توبہ کی نفسیات جاگے۔ تاکہ وہ اپنی اصلاح کرکے دوبارہ صراطِ مستقیم پر قائم ہوجائے۔ اسلام میں سماجی جرم (social crime) پر قتل کی سزا ہے، جب کہ اعتقادی جرم (thought crime) پر قتل کی سزا نہیں۔

فقہی مسئلہ، شرعی مسئلہ

تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شتم کرے، خواہ وہ اشارتاً ہی کیوں نہ ہو، اس کی لازمی سزا قتل ہے۔ شاتم رسول کو بطور حد قتل کیا جائے گا اس معاملہ میں بہت کم کسی قابل ذکر فقیہ کا استثنا پایا جاسکتا ہے۔ اس حکم کی تفصیل کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

1۔ الصارم المسلول علی شاتم الرسول، ابن تیمیہ

2۔ السیف المسلول علی من سب الرسول، تقی الدین ابو الحسن علی السبکی

3۔ تنبیہ الولاۃ والحکام علی أحکام شاتم خیر الانام أو أحد أصحابہ الکرام، ابن عابدین الشامی

اس مسئلہ پر جب بھی کوئی شخص کوئی مضمون یا کتاب لکھتا ہے تو وہ ہمیشہ یہی کرتا ہے کہ ان فقہاء کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرتا ہے کہ شتم رسول کی سزا اسلام میں قتل ہے، اور یہ کہ یہ ایک ایسا متفق علیہ مسئلہ ہے جس پر شاہد کسی فقیہ کا کوئی اختلاف نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شریعت کا مسئلہ یہی ہے کہ شاتم رسول کو لازماً بطور حد قتل کیا جائے تو یہ مسئلہ دورِ اول کے اسلام میں کیوں موجود نہ تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے ایسے افراد موجود تھے جو شتم رسول کا فعل کر رہے تھے، مگر انہیں قتل نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک انتہائی واضح مثال مدینہ کے عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی ہے۔ وہ ایک کھلا ہوا شاتم رسول تھا۔ پھر بھی لوگوں کے اصرار کے باوجود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مرا۔

اس عدم قتل کا سبب کیا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — یعنی رسول اللہ صرف اس لیے اس کے قتل سے باز رہے کیوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ اس کے قتل سے لوگ اسلام سے برگشتہ ہوجائیں گے، کیونکہ اس وقت اسلام ضعیف تھا۔ دور اول کے زمانہ میں اور عباسی خلافت کے زمانہ میں بننے والی فقہ کے درمیان یہ فرق کیوں۔

جیسا کہ معلوم ہے فروری 1979ء میں ایران کے آیت اللہ خمینی نے یہ فتوی دیا کہ سلمان رشدی نے اپنی کتاب سیٹینک ورسز (Satanic Verses) کے ذریعہ پیغمبر اسلام کی توہین کی ہے۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کو قتل کردیں۔ یہ فتوی جب چھپا تو غالباً راقم الحروف کے واحد استثنا کو چھوڑ کر دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس فتوی کی تائید کی۔ اس کی حمایت میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ مگر مسلمانوں کی عالمی تائید کے باوجود سلمان رشدی کو قتل کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ مزید یہ کہ قتل کے اس فتوی اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی حمایت کے نتیجہ میں اسلام ساری دنیا میں بدنام ہوگیا۔ اور اس کی تصویر یہ بن گئی کہ اسلام خدانخواستہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔

موجودہ زمانہ میں آزادی رائے کو انسان کا سب سے بڑا حق سمجھا جاتا ہے۔ یہ گویا ان کا مذہب ہے۔ اس بنا پر پوری جدید دنیا نے اس فتوی کو اپنے مذہب (آزادی) پر براہ راست حملہ سمجھا۔ یہ لوگ پوری طاقت کے ساتھ رشدی کے دفاع پر آگئے۔ اسی کے ساتھ جدید میڈیا نے اس معاملہ کو اتنا پھیلایا کہ اس کی خبر ساری دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اندیشہ کی بنا پر مدینہ کے عبداللہ بن ابی کے قتل سے پرہیز کیا، وہ اندیشہ سلمان رشدی کے خلاف قتل کے فتوی کی نتیجہ میں ہزار گنا زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل اسلام کے لیے پیش آگیا۔

اب ان دو متقابل نظیروں پر غور کیجیے۔ پیغمبر اسلام کی نظیر بتاتی ہے کہ شتم رسول کے

معاملہ میں خواہ وہ کتنے ہی زیادہ بڑے پیمانہ پر ہو، یہ دیکھا جائے گا کہ شاتم کو اگر قتل کیا جائے تو اس کا عملی نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر حالات پر اہل اسلام کا اتنا کنٹرول نہ ہو کہ وہ قتل کے منفی نتائج کو روک سکیں تو اہل اسلام قتل کا اقدام نہیں کریں گے۔ وہ اس معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیں گے۔ اس کے برعکس، فقہاء کی مثال بتاتی ہے کہ جب کوئی شخص شتم کا فعل کرے تو اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیوں ایسا ہوا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر سے اپنے لیے ہدایت نہیں لی۔ ان کی نظر فقہاء کی مسلک پر اٹک کر رہ گئی۔ فقہاء کی پیروی میں متحد ہو کر وہ قتلِ شاتم کے علم بردار بن گئے۔

اس سوال کا جواب تقلید ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان متفقہ طور پر یہ رائے بنا چکے تھے کہ اب امت کے لیے براہ راست قرآن وسنت سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اب صرف اجتہاد مقید ہی کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ دوسری لفظوں میں یہ کہ اب مسلمان براہ راست قرآن اور سنت سے مسائل اخذ نہیں کر سکتے۔ اب ان کے لیے صرف ایک ہی صورت ممکن ہے، اور وہ یہ کہ فقہاء کے فتووں کو جانیں اور پوری تقلیدی جذبہ کے ساتھ اس پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے رشدی کے معاملہ میں یہی کیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، موجودہ فقہ کی تدوین اس وقت ہوئی جب کہ اہل اسلام کو مکمل اقتدار حاصل تھا۔ ان کو حالات پر اتنا زیادہ کنٹرول تھا کہ کسی قوم کی طرف سے باغیانہ روش کا اندیشہ ہوتا تو خلیفہ صرف دھمکی کا ایک خط لکھتا اور باغی گروہ پست ہمت ہو کر خاموش ہو جاتا۔

مگر موجودہ زمانہ میں حالات بدل چکے تھے۔ اب اہل اسلام کو پہلے کی طرح حالات پر کنٹرول حاصل نہ تھا۔ مزید یہ کہ ان کے لیے بہت سے ناموافق حالات پیدا ہو چکے تھے۔ مثلاً آزادی کا موجودہ زمانہ میں خیر اعلیٰ (summum bonum) کی حیثیت اختیار کر لینا اور

اظہار رائے کی آزادی کو مقدس حق کے طور پر مان لیا جانا۔ اسی طرح جدید میڈیا کا ظہور میں آنا جو گویا گرم خبر (hot-news) کی عالمی ایجنسی ہے، وغیرہ۔

انھی نئے حالات کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی عالمی حمایت کے باوجود سلمان رشدی کو قتل کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ مزید یہ ناقابل تلافی نقصان ہوا کہ اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو گیا۔ جدید انسان کی نظر میں اسلام کی یہ تصویر بن گئی کہ اسلام خدانخواستہ دہشت گردی کا مذہب ہے، وہ اپنے پیروؤں کو مذہبی جنون (fanaticism) کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ نتیجہ تھا بدلے ہوئے زمانہ میں حاکمانہ دور کی فقہ کو نافذ کرنے کا۔

سلمان رشدی کے معاملہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمان اگر اجتہاد مطلق کا طریقہ اختیار کرتے تو وہ اس معاملہ میں براہ راست قرآن وسنت سے روشنی حاصل کرتے اور پھر انہیں معلوم ہوجاتا کہ اس مسئلہ کا حل قتل کا فتوی نہیں ہے بلکہ ردعمل سے بچتے ہوئے پرامن دائرہ میں اپنی دعوتی کوشش کرنا ہے۔ مگر چونکہ وہ اپنے مقلدانہ ذہن کے بنا پر دورِ اقتدار میں بننے والی فقہ کے اندر اٹکے ہوئے تھے اس لیے ان کو وہی حاکمانہ مسئلہ نظر آیا جو فقہ کی ان کتابوں میں لکھا ہوا تھا: الشَّاتِمُ يُقْتَلُ حَدًّا۔ یعنی شاتم کو بطور حد قتل کیا جائے گا۔

قول بلا فعل

18اپریل 1989 کو میری ملاقات ڈاکٹر عبدالسلام صاحب (پیدائش 1929) سے ہوئی۔ ان کا مضمون میتھمٹکس ہے اور وہ نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی، شگاگو میں پروفیسر ہیں۔ وہ تقریباً 25 سال سے امریکا میں رہ رہے ہیں:

Dr. Abdus Salam Ansari, 5647 N. Bernard Street, Chicago, IL, 60659, U.S.A. Tel. (312)267-4740

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بتایا کہ مارچ 1989 میں ان کی یونیورسٹی میں "رشدی افیئر" پر ایک سیمینار کیا گیا۔ یونیورسٹی کے مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے اس سیمینار کا نظم کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کہا وہ انہیں کے الفاظ میں یہ تھا:

"A student in the metting exclaimed that Rushdie should be killed for his crime. I reminded him that everybody should be serious when speaking. If he really believed that it is his duty to kill Rushdie, by now he would have been in London, and not here talking about it."

ایک طالب علم نے اس میٹنگ میں پر جوش طور پر کہا کہ رشدی کو اس کے جرم کی بنا پر ضرور قتل کر دینا چاہیے۔ میں نے اس طالب علم کو یاد دلایا کہ ہر آدمی کو اپنے بولنے میں سنجیدہ ہونا چاہیے۔ اگر فی الواقع وہ یقین رکھتا ہے کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ رشدی کو قتل کر دے تو اس وقت اس کو لندن میں ہونا چاہیے، نہ کہ یہاں رہ کر وہ صرف قتل کرنے کی بات کر رہا ہو۔

یہ واقعہ علامتی طور پر ان تمام لوگوں کی تصویر ہے جو رشدی کی کتاب کی اشاعت کے بعد

جوش وخروش کے ساتھ اس کو مارنے کی باتیں کررہے تھے۔ یہ لوگ اگر واقعتاً اپنے کلام میں سنجیدہ ہوتے تو ان میں سے کم از کم چند آدمی کتاب کی اشاعت کے بعد خاموشی سے لندن جاتے اور رشدی کا خاتمہ کردیتے۔

سلمان رشدی کی کتاب ستمبر 1988 میں شائع ہوئی۔ اس کے بارے میں آیت اللہ خمینی کا قتل کا فتویٰ فروری 1989 میں لوگوں کے سامنے آیا اس کے بعد وہ شوروغل شروع ہوا جس کے نتیجہ میں برطانوی حکومت نے سلمان رشدی کو خفیہ مقام پر منتقل کردیا اور اس کے اوپر خصوصی پہرہ بٹھادیا۔ اس کا مطلب یہ کہ کتاب کی اشاعت کے تقریباً 6 مہینے ایسے گزرے ہیں جب کہ سلمان رشدی ایک عام آدمی کی طرح تھا اور ہر شخص اس کے اوپر قابو پاسکتا تھا۔ مگر اس پوری مدّت میں لفظی بیان کے سوا کسی مسلمان نے کچھ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سلمان رشدی روپوش ہوکر پولیس کے خصوصی پہرہ میں چلا گیا۔

خود ایران کے آیت اللہ خمینی کو اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر وہ سنجیدہ ہوتے تو یقیناً وہ وہی کرتے جو اس طرح کے مواقع میں دوسرے لوگ ہمیشہ کرتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقع سنجیدہ ہوتے تو اخباری اعلان کے بجائے وہ ایسا کرتے کہ ایک یا چند آدمی کو نہایت خاموشی کے ساتھ انگلینڈ روانہ کرتے اور اسی کے ساتھ ان کے گھر والوں کو اتنی رقم دے دیتے کہ بحالت ضرورت وہ اپنی آئندہ معاش کے لیے مطمئن ہوجائیں۔ مگر آیت اللہ خمینی نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بجائے وہ اخبار اور ریڈیو پر اپنے قتل کے فرمان کو نشر کرنے لگے۔ گویا ان کی اصل دلچسپی اپنے فرمانِ قتل کی پبلسٹی سے تھی، نہ کہ خود رشدی کے قتل سے۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت اللہ خمینی سمیت، ان جیسی بولی بولنے والے تمام مسلمان اس معاملہ میں سخت غیر سنجیدہ ثابت ہوئے ہیں۔ ان مسلمانوں کی حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ انھیں مارنا نہیں ہے، بلکہ صرف مارنے کی باتیں کرنا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو مارتے ہیں وہ شور نہیں کرتے، اور جو شور کرتے ہیں وہ کبھی مارتے نہیں۔

سلمان رشدی کی روپوشی یا اس کا پولیس کی حفاظت میں ہونا اس کے خلاف اقدام کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ صہیونی یہودی بہت سے فلسطینی لیڈروں یا فلسطین نوازوں کو ٹھیک اسی قسم کی رکاوٹوں کے باوجود ہلاک کر چکے ہیں۔ پھر رشدی کے خلاف شوروغل کرنے والے مسلمان اپنے اعلان کے باوجود ایسا کیوں نہ کر سکے۔

راقم الحروف قتل کے نعرہ کو ایک لغو اور غیر سنجیدہ فعل سمجھتا ہے۔ اسلام تو درکنار، عقل و دانش سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ تاہم جو لوگ اس کو عین دین وایمان سمجھتے ہیں وہ آخر کس لیے صرف للکارنے پر قانع ہیں۔ وہ خود آگے بڑھ کر اس کے لیے اقدام کیوں نہیں کرتے، یا اپنے صاحبزادوں کو اس مہم پر کیوں نہیں روانہ کرتے۔

یہ مسلمان اگر رشدی کو قتل نہیں کر سکتے تھے تو اس کوشش میں وہ اپنے آپ کو شہید تو کر سکتے تھے۔ مگر وہ نہ قاتل بن سکے اور نہ شہید۔ کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ ”رشدی کو قتل کرو“ کا نعرہ لگانے والوں میں سے کسی ایک شخص کے بارے میں بھی یہ خبر نہیں آئی کہ وہ رشدی کو قتل کرنے کے لیے خفیہ طور پر لندن پہنچا تھا، لیکن وہاں کی پولیس نے اس کا سراغ لگا کر اس کو گرفتار کر لیا۔ اگر برطانیہ کی پولیس رشدی کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے تو قتل کا نعرہ لگانے والے مسلمانوں یا ان مسلمانوں کی اولاد میں سے کچھ ایسے لوگ کیوں نہیں نکلے جو مجاہدانہ عزم کے ساتھ لندن پہنچتے۔ وہاں وہ رشدی کی قیام گاہ کو تلاش کرتے، اور جان پر کھیل کر رشدی کو قتل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس کے بعد وہ یا تو غازی بنتے یا اسی راہ میں شہید ہو جاتے۔

اس کے برعکس، ہم دیکھتے ہیں کہ قتل کے لیے للکارنے والے تمام لوگ، خواہ وہ آیت

اللہ خمینی کا خاندان ہو یا اخباروں میں خطوط اور مضامین شائع کرنے والے عام مسلمانوں کا خاندان، سب کے سب اطمینان وسکون کے ساتھ گھروں اور اپنے دفتروں میں بیٹھے رہے، ان میں سے ایک شخص نے بھی اس سنجیدگی کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ خود ہوائی جہاز کا ٹکٹ لے کر لندن پہنچے یا اپنے صاحبزادے کو اس مہم پر روانہ کرے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے امریکا کے مسلم نوجوان کے بارے میں جو بات کہی، وہی ان تمام مسلمانوں کے بارے میں صحیح ہے جو رشدی کے قتل کی وکالت کررہے تھے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے یہ تمام کے تمام مسلمان صرف لفظوں کے بادشاہ ہیں، ان میں سے کوئی بھی شخص عمل کا بادشاہ نہیں۔ یہ بلاشبہ بے حد تشویش ناک بات ہے۔ کیونکہ یہ عین وہی اخلاقی کمزوری ہے جس کو قرآن میں قول بلافعل کہا گیا ہے۔ اور قول بلافعل کے متعلق قرآن کا اعلان ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک سخت ناراضگی کی بات ہے، وہ اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کی بات نہیں (61:3)۔

سورہ الصّف کی اس آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں: بندہ کولاف زنی اور دعوے کی بات سے ڈرنا چاہیے کہ پیچھے مشکل پڑتی ہے، زبان سے ایک بات کہہ دینا آسان ہے، لیکن اس کا نباہنا آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے ناراض اور بیزار ہوتا ہے جو زبان سے کہے بہت کچھ اور کرے کچھ نہیں (صفحہ 715)۔

کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ مسلمانوں میں سے بے شمار لوگوں نے ”رشدی کو قتل کرو“ کے نعرے لگائے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک شخص نہ تھا جو بذاتِ خود جان پر کھیل کر رشدی کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔ کیا اس کے بعد کوئی شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ یہ سب جھوٹے الفاظ بولنے والے لوگ تھے۔ ان میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو سچا لفظ بولنے والا ہو۔ کیونکہ سچے لفظ اور عمل کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جھوٹے الفاظ پر اسلام کا مینار کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جھوٹے الفاظ پر تو کفر کو بھی کھڑا نہیں کیا جا سکتا، اسلام کو کھڑا کرنا درکنار۔

سامان تضحیک

انگلینڈ میں قدیم زمانہ سے ایک قانون ہے جو مذہبی بے حرمتی (Blasphemy) سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ قانون سترہویں صدی میں بنایا گیا۔ عیسائیت (انیگلیسکن چرچ کی تشریح کے مطابق) انگلینڈ کا سرکاری مذہب ہے۔ اس قانون سازی کی وجہ، بنیادی طور پر، یہ تھی کہ یہ سمجھا گیا کہ مذہب پر حملہ لازمی طور پر خود ریاست پر حملہ ہے:

"An attack on religion is neccessarily an attack on the state." (*Encyclopaedia Britannica*, Vol 2, p. 75)

موجودہ حالت میں اس قانون کا تعلق صرف عیسائی مذہب سے ہے۔ برطانیہ کے مسلمان (زیادہ صحیح الفاظ میں، برطانیہ میں مقیم کچھ ہندوستانی مسلمان) وہاں یہ مہم چلا رہے ہیں کہ مذکورہ قانون میں وسعت پیدا کر کے اس کو مسلم مذہب تک وسیع کیا جائے، تاکہ اس کے تحت سلمان رشدی کی کتاب کی خلاف عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکے۔

میرے نزدیک یہ مطالبہ بالکل لغو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف جھوٹی لیڈری ہے، ورنہ خود مطالبہ کرنے والے بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اس طرح کے قوانین کا عملی طور پر مطلق کوئی فائدہ نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ انتہائی سطحیت بھی ہے۔ مسلم ملکوں میں اسلام یا اسلامی شخصیتوں کی بے حرمتی کے خلاف قوانین موجود ہیں۔ کیا مسلمان اس کے لیے راضی ہوں گے کہ ان قوانین کو عیسائیت، ہندوازم اور یہودیت تک وسیع کیا جائے۔ خواہ اس کے تحت

دوسرے مذاہب کے لوگوں کو موقع ملے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف مقدمات قائم کرسکیں کہ انھوں نے ان کے مذہب کی بے حرمتی کی ہے۔ مسلمان جو حق اپنے ملک میں دوسروں کو نہیں دے سکتے۔ اس حق کو دوسروں کے ملک میں اپنے لیے مانگنا بلاشبہ صرف سطحی لیڈری ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اس احمقانہ مہم نے اسلام کے خلاف بے حرمتی کا تحفظ تو نہیں کیا۔ البتہ اس نے اسلام کی بے حرمتی کے اسباب ضرور فراہم کردیے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ برطانیہ کے کچھ نام نہاد مسلم لیڈروں نے حکومت برطانیہ کو خط لکھ کر مطالبہ کیا تھا کہ حکومت مذکورہ قانون کو اسلام کی بے حرمتی تک وسیع کرے۔

اس کے جواب میں برطانیہ کے ہوم آفس کے منسٹر آف اسٹیٹ مسٹر جان پیٹن (John Patten) نے انھیں ایک خط بھیجا ہے۔ یہ خط ٹائمس آف انڈیا (6جولائی 1989) کے آخری صفحہ پر چھپا ہے۔

یہ رپورٹ جو پی ٹی آئی نے لندن سے روانہ کی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ برطانیہ کے مسلم لیڈروں کے نام ایک خط میں مسٹر پٹن نے کہا کہ قانونی میکانزم مذہب اور انفرادی عقیدہ کے معاملات سے نمٹنے کے لیے غیر موزوں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود عیسائی مذہب اب اس قانون پر اعتماد نہیں کرتا۔ عیسائی لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کے مذہب کی اپنی طاقت اس قسم کے حملوں کے مقابلہ میں بچاؤ کا بہترین ذریعہ ہے:

In a letter to prominent British Muslim Leaders, Mr. Patten said "Legal mechanisms were inappropriate for dealing with matters of faith and individual beliefs. Indeed, the Christian faith no longer relies on it, preferring to

recognise that the strength of their own belief is the best armour (p.10).

برطانیہ کے عیسائی ہوم سکریٹری کے الفاظ مسلمانوں کے اوپر گہرا طنز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا مذہب اتنا طاقتور ہے کہ بے حرمتی کے خلاف قانون کے ہوتے ہوئے بھی ہم اس کے استعمال کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ دوسری طرف تمہارا یہ حال ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے مذہب کی حرمت اسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے جب کہ اس کی پشت پر قانون اپنا ڈنڈا لیے ہوئے اس کی چوکیداری کر رہا ہو۔

متفرقات

سلمان رشدی اور شتم رسول کے موضوع پر کچھ متفرق چیزیں جو راقم الحروف نے مختلف مواقع پر کہیں یا لکھیں، ان کی اگلے صفحات میں الگ الگ عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ اختصار کے پیش نظر یہاں صرف کچھ منتخب چیزیں ہی نقل کی جا رہی ہیں۔

اخباری بیان

17 فروری 1989 کے اخبارات میں یہ سنسنی خیز خبر تھی کہ ایران کے آیات اللہ خمینی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ "شیطانی آیات" کے مصنف سلمان رشدی کو قتل کر دیں۔ اسی کے ساتھ ایرانی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ قاتل کو اس کے معاوضہ میں بڑا انعام ادا کرے گی۔ قومی آواز (20 فروری 1989) کے مطابق، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے امام خمینی کی تائید کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ امام خمینی اس اعلان میں حق بجانب ہیں۔ اسلام میں پیغمبر اسلام کی توہین کے مجرم کی سزا یہی ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔

سلمان رشدی نے اگر پیغمبر اسلام کی توہین کی تھی تو میرے نزدیک امام خمینی اور مولانا ندوی جیسے لوگ اسلامی قانون کی توہین کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح کسی کو قتل کروانا ہرگز اسلام کا طریقہ نہیں۔

اسلام میں ہر قانونی سزا عدالتی معاملہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی شخص اگر ایسا جرم کرتا ہے جو اسلامی شریعت میں قابل سزا ہے تو کسی شخص یا اشخاص کو ہرگز یہ حق نہیں کہ وہ بطور خود اس پر سزا کا نفاذ کرنے لگے۔ ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ مجرم کو پکڑا جائے اور عدالتی کارروائی کے بعد قاضی کے فیصلہ کے مطابق اس کو سزا دی جائے جو شریعت میں ایسے مجرم کے لیے مقرر ہے۔

دوسری بات یہ کہ سلمان رشدی برطانیہ کا باشندہ ہے۔ اس پر برطانیہ کے قوانین نافذ

ہوتے ہیں، نہ کہ ایران یا پاکستان کے۔ انعام دے کر یا جذباتی اپیل کرکے اس طرح ایک غیرملکی کو مروانا گویا انٹرنیشنل بدامنی کو جواز فراہم کرنا ہے۔ اسلام بلاشبہ اس سے بَری ہے۔

سلمان رشدی کی کتاب نے تو اسلام کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ مگر شیعہ اور سنّی علماء جو کچھ کررہے ہیں وہ بلاشبہ اسلام کو زبردست نقصان پہنچانے کا سبب بنا ہے۔ اس نے اسلام کے دعوتی امکانات کو ناقابل تلافی حد تک برباد کردیا ہے۔ ان حضرات نے اپنی حرکتوں سے دنیا کو یہ بتایا ہے کہ اسلام وحشت و بربریت کا مذہب ہے۔ اور جس مذہب کی تصویر وحشت و بربریت کی تصویر بنادی جائے، اس کو کون اپنے لیے پسند کرسکتا ہے۔

اسلام میں دعوت کی مصلحت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ دعوت کی مصلحت اہم ترین مصلحت کی حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ بار بار ایسے اقدامات کرتے ہیں جس سے انہیں ذاتی طور پر قیادتی فائدہ تو ضرور ملتا ہے، مگر اسلام کے دعوتی امکانات برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑا المیہ ہے جس سے اسلام کی جدید تاریخ دوچار ہے۔ (شائع شدہ ہفت روزہ نئی دنیا، 9-3 مارچ 1989)

ایک ملاقات

25 فروری 1989 کو دو امریکی پروفیسر (ایک مرد، ایک عورت) اسلامی مرکز میں آئے۔ انھوں نے اسلامی مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات حاصل کیں اور راقم الحروف سے اسلام کے بارے میں تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Dr. Peggy Starkey, Dr. Archie L. Nations
12228, Old Creedmoor Road, Raleigh, North Carolina
27613, Telephone: (919)846-8377 (U.S.A)

اس ملاقات کے آخر میں انھوں نے رشدی۔ خمینی معاملہ میں بھی راقم الحروف کی رائے دریافت کی۔ میں نے کہا کہ سلمان رشدی کے قتل کا "فتویٰ" اگرچہ شیعہ امام آیت اللہ خمینی

نے دیا ہے۔مگر سنّی علماء بھی اس میں شریک ہیں۔ کچھ علماء (مولانا ابوالحسن علی ندوی) نے براہ راست اخباری بیان کے ذریعہ اس سے اتفاق کیا ہے۔ دوسرے علماء جو خاموش ہیں، وہ بھی عملاً اس فتوی میں شریک قرار دیے جائیں گے۔ کیونکہ اس طرح کے معاملات میں خاموشی بالواسطہ تائید کے ہم معنی ہوتی ہیں۔

میں نے کہا کہ مجھے ذاتی طور پر اس فتوی سے صدفی صد اختلاف ہے۔ میں اس کو بالکل ناجائز اور غیر اسلامی سمجھتا ہوں۔ اس سلسلہ میں میَں نے ان سے جو باتیں کہیں، ان کا اردو ترجمہ خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

آیت اللہ خمینی نے کہا ہے کہ سیٹینگ ورسز کے مصنف سلمان رشدی کو قتل کر دیا جائے۔ بہت سے سنی علماء نے بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس کی تائید کی ہے۔مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ صدفی صد غلط ہے۔

1۔سلمان رشدی کیوں اس قابل ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ عام طور پر اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ توہین رسول یا توہین اسلام کے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔سلمان رشدی کی کتاب میں کچھ "واقعات" کو افسانہ کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔مثلاً "**تِلْكَ الغَرَانِيقُ العُلَى**" کا قصہ، یا حضرت عائشہ (زوجہ رسول) کو صفوان بن معطل کے ساتھ ملوث کرنے کا قصہ۔ یہ سب قصے پرانے ہیں۔سلمان رشدی ان کا خالق نہیں ہے۔سلمان رشدی نے ان واقعات کو دوبارہ ناول کے پیرایہ میں بیان کر دیا ہے۔ پھر جن قصوں کے مصنف اول کو قتل کی سزا نہیں دی گئی، ان کے مصنف ثانی کو کیوں قتل کی سزا دی جائے گی۔

2۔اسلام میں کسی جرم کی جو سزا مقرر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اٹھے اور بطور خود اس کو لوگوں کے اوپر نافذ کرنا شروع کر دے۔اسلام میں سزا کا نفاذ عدالتی کاروائی کے ذریعہ کیا جاتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے زیرِ نظر کتاب کا موضوع: جہاد یا

سرکشی)۔ اگر سلمان رشدی نے ایسا جرم کیا ہو جو اسلامی شریعت میں موجب قتل ہے، تب بھی اس کا نفاذ اس طرح نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص بندوق لے کر اس کے پاس جائے اور خود اپنے فیصلہ کے تحت اس کو گولی مار دے۔ شرعی جرم کے ارتکاب کے بعد بھی ضروری عدالتی کارروائی کرنا لازمی ہے۔ ضروری عدالتی کارروائی کا بغیر کسی شخص کو قتل کرنا سراسر ناجائز اور غیر اسلامی فعل ہوگا۔

3۔ اسلامی میں مختلف جرموں کی جو سزائیں مقرر ہیں، ان کا نفاذ صرف مملکت اسلامی میں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اسلام میں چوری کرنے والے کے لیے ایک سزا مقرر کی گئی ہے۔ مگر عملی نفاذ کے اعتبار سے اس کا تعلق صرف اسلامی حکومت کے دائرہ سے ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلمان دوسری ملکوں جائیں اور وہاں جس کو چور سمجھیں اور اس پر بطور خود اسلامی سزا کا نفاذ شروع کر دیں۔ اب چونکہ سلمان رشدی ایک غیر مسلم ملک (برطانیہ) کا شہری ہے، وہ اسلامی سزا کے دائرہ سے باہر ہے۔ یہ سراسر غیر اسلامی فعل ہوگا کہ کوئی شخص ایران یا پاکستان سے برطانیہ جائے اور وہاں سلمان رشدی کو گولی مار کر یہ کہے کہ اس نے اس کے اوپر اسلامی قانون کا نفاذ کیا ہے اس قسم کا ہر فعل سرکشی ہے، نہ کہ اسلامی قانون کا نفاذ۔

4۔ سلمان رشدی کے خلاف مسلمان اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کو لازماً پُرامن دائرہ تک محدود رہنا چاہیے۔ مثلاً مضمون یا کتاب کی صورت میں اس کی تردید کرنا۔ مسلم ملکوں میں اس کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی لگانا۔ دوسری حکومتوں سے پرامن قانونی دائرہ میں مطالبہ کرنا، وغیرہ۔ اس سے آگے کسی بھی قسم کی جارحیت اسلامی اعتبار سے جائز نہیں۔ اس معاملہ میں مسلمان اگر جارحانہ انداز اختیار کریں تو یقینی طور پر وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے کے ہم معنی ہوگا۔

اگلے صفحہ پر اس خط کی نقل دی جا رہی ہے، جو مذکورہ امریکی پروفیسر نے اپنے وطن واپس پہنچنے کے بعد راقم الحروف کے نام روانہ کیا تھا:

Dr. Peggy Starkey
Dr. Archie L. Nations
12228 Old Creedmoor Road
Raleigh, N.C. 27613
March 27, 1989

To:
Wahiduddin Khan,
President The Islamic Centre,
C-29, Nizamuddin West,
New Delhi-110 013, India

Dear Mr. Khan,

When we think of our time in Delhi, our minds immediately reflect on our visit with you and your son, Dr. Khan, who so graciously assisted us while we were there. We are profoundly indebted to you for granting us time to talk with you and to learn about the Muslim faith in India.

Most of all, we are encouraged by the fact that there are Muslim religious leaders like you whose wise counsel needs to be taken very seriously, not only by the Muslim people but also by persons of other religious traditions as well. We think that the hope for intercultural and international understanding and peace lies in the directions charted by such wisdom. We are, therefore, most grateful for the opportunity to meet you and to talk with you. You have strengthened our resolve to continue our efforts in Muslim-Christian Dialogue in the U.S. with a view toward the dissemination of an accurate knowledge of Islam and better relations with Muslims.

We appreciate your sharing with us your thoughts concerning the Rushdie controversy, and we thank you for giving us the articles and pamphlets which you have written. If there is some way that we might receive information about your future publications and how we might obtain them, we would be most grateful.

Sincerely Yours,
Peggy Starkey
Archie L. Nations

غلط ترجمانی

سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (Satanic Verses) پر موجودہ لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں نے جس شدت کے ساتھ غصہ کا اظہار کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال غالباً جدید دور میں نہیں ملے گی۔ اردو، انگریزی، عربی اور دوسری زبانوں میں اس کے خلاف کثرت سے بیانات اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ان سب کا خلاصہ وہ ہے جو مسلمانوں کے ایک ترجمان نے ٹائمس آف انڈیا میں ان الفاظ میں بتایا ہے۔ دوسرے کسی بھی انسان کی طرح، ہم مسلمانوں کے جذبات کو اس وقت ٹھیس لگتی ہے جب کہ ہماری محبوب شخصیتوں کو طوائف کے روپ میں دکھایا جائے:

> "We, Muslims, like any human being, should be entitled to feel offended when our dearest ones are depicted as prostitutes." (*Times of India*, 1 March 1989)

اس عبارت میں ایک واضح غلطی موجود ہے۔ وہ یہ کہ اس میں مسلمانوں کے ردعمل کے لیے عام انسانوں کے ردعمل کو نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کے لیے نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ہے، نہ کہ عام انسانوں کی روش میں۔

رسول کی ایذا رسانی پر مسلمانوں کا ردعمل کیا ہو، یہ ایک خالص دینی معاملہ ہے۔ اس کا تعین قرآن وسنّت کی روشنی میں کیا جائے گا، نہ کہ عام انسانوں کے سلوک کی روشنی میں۔ اس کے لیے نمونۂ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک ہے، نہ کہ عام انسانوں کا سلوک۔

سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئی بیویاں ہونے کا مذاق اڑایا ہے اور آپ کے گھر کو، نعوذ باللہ، قحبہ خانہ (Brothel) کا نام دیا ہے۔ (صفحہ 376) اسی طرح مصنف نے صفوان ابن معطل کی جھوٹی کہانی کو دہرایا ہے جس میں

نعوذ باللہ، حضرت عائشہ کے کردار کو داغدار بتاتا گیا تھا (صفحہ 387)۔

امّ المومنین کے بارے میں یہ فرضی کہانی کوئی نئی کہانی نہیں۔ یہ اولاً 1400 سال پہلے مدینہ میں گھڑی گئی۔ اس کا مصنف اول عبداللہ بن ابی تھا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔ اس کے مجرم ہونے کا ذکر خود قرآن (24:11) میں موجود ہے۔ سلمان رشدی نے اسی کہانی کو بلا تردید لے لیا ہے، کیونکہ وہ اس کے مجرمانہ مقصد کے لیے بہت زیادہ مفید مطلب تھی۔

اس سے واضح ہے کہ ام المومنین کے بارے میں سلمان رشدی نے جو مجرمانہ فعل کیا ہے، اس جرم کا ارتکاب خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ یہ ارتکاب جرم اس وقت ہوا جب کہ پیغمبر اسلام کو مجرم کے اوپر پوری طرح حاکمانہ اختیار حاصل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے ہر اعتبار سے نمونہ ہے، اس لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آپ نے اس وقت مذکورہ جرم کے مجرم کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا۔

تاریخ واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس مجرم اول (عبداللہ بن ابی) کو اس جرم پر کوئی سزا نہیں دی گئی۔ حضرت عمر فاروق نے، حتی کہ خود مجرم کے بیٹے عبداللہ نے، اس کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ترین اذیت کے باوجود، اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایک ثابت شدہ مجرم ہے، اس کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ آپ اس کو چھوڑے رہے، یہاں تک کہ اپنی طبعی موت سے اس کا انتقال ہو گیا۔

یہ ہے نمونہ جو اس طرح کے معاملات میں پیغمبر اسلام نے ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ ہمیں اسی نمونہ کو اختیار کرنا ہے۔ عام انسانوں کی روش کا حوالہ دے کر ہنگامہ آرائی کرنا سرکشی کی بات ہے، نہ کہ ایمان واسلام کی بات۔

سلمان رشدی کی کتاب کی اشاعت کے بعد مسلمانوں نے لایعنی ہنگامے کیے اس کو

دوسرے انسانوں کی روش کو حوالہ دے کر صحیح بتانا لغویت کی حد تک غیر اسلامی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے لیے رسول خدا کے عمل میں نمونہ ہے، نہ کہ دوسرے انسانوں کے عمل میں۔

اشتعال انگیزی نہیں

ایک عربی ادیب سلمان رشدی کے معاملہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب ایک مسلمان اس وقت بھڑک اٹھتا ہے اور غضب ناک ہوجاتا ہے جب کہ اس کے والد یا والدہ کی اہانت کی جائے تو اس ہستی کی اہانت پر کیوں نہ بھڑک اٹھے گا جو مرتبہ میں سب سے بڑا ہے اور محبت اور وفاداری کا سب سے زیادہ مستحق ہے: ''إذْ كانَ الرَّجُلُ المُسْلِمُ يَثُورُ ويَغْضَبُ إذا أُهينَتْ والِدَتُهُ أو والِدُهُ، فكَيْفَ لا يَثُورُ لِلَّذِي هو أَعْظَمُ مَنْزِلَةً وأَحَقُّ بالمَحَبَّةِ والوَفاءِ؟ أَيَدَّعِي المُسْلِمُ بَعْدَ ذَلِكَ وَفِيًّا لِلإسْلامِ؟'' (البعث الاسلامی، جون 1989، صفحہ 85)۔

اس کے بعد اس عربی مضمون میں کہا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں دینی غیرت ختم ہوگئی ہے۔ اس لیے ہم یہ افسوسناک منظر دیکھ رہے ہیں کہ سلمان رشدی نے اہانت رسول کا اتنا بڑا واقعہ کیا مگر مسلمان اس پر اتنا غضب ناک نہیں ہوئے جتنا غضب ناک اس طرح کے واقعہ پر ہونا چاہیے۔ کلام کا یہ انداز سراسر لغو ہے۔ اس قسم کے جذباتی انداز کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔ یہ صحیح ہے کہ اہانت کے واقعہ سے آدمی کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ مگر کوئی بھی شریف اور سنجیدہ آدمی ایسا نہیں کرتا کہ جب بھی کوئی اہانت کا واقعہ ہو تو وہ غضب ناک ہوکر ہنگامہ آرائی کرنے لگے یا اہانت کرنے والے شخص کے قتل کے درپے ہوجائے۔ ایک بے مقصد آدمی ہی اس قسم کی جذباتی طرز عمل اختیار کرسکتا ہے۔ بامقصد آدمی اس طرح کی جہالت کو ہمیشہ اعراض کے خانہ میں ڈالتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کو جاری نہیں رکھ سکتا۔

سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) کے معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں نے اسی قسم کا منفی اور جذباتی اندازِ بیان اختیار کیا ہے جس کی ایک مثال اوپر نقل کی گئی ہے۔ مگر یہ اندازِ کلام درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی کی ماں کے بارے میں توہین آمیز کلمات کہے جائیں تو اس کو سن کر فوری طور پر اس کو قلبی تکلیف ہوگی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی جب ایسا نازیبا کلام سنے تو اس کے بعد فوراً وہ کہنے والے سے لڑنے لگے، یا اس کے قتل کے درپے ہو جائے۔ ایسے مواقع پر آدمی کا متاثر ہونا بلا شبہ فطری ہے۔ مگر ایسے آدمی کو "جہنم رسید" کرنے کا منصوبہ بنانا بھی یقیناً غیر فطری اور نادرست ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام فلسطین کی ایک خاتون کے بطن سے باپ کے بغیر پیدا ہوئے۔ یعنی ان کی ایک ماں تھی، مگر ان کا کوئی انسانی باپ نہ تھا۔ اس پر فلسطین کے یہودیوں نے آپ کی والدہ پر، نعوذ باللہ، بدکاری کا الزام لگایا۔ اور حضرت مسیح کو ولد الزنا کہا۔ مگر حضرت مسیح نے ایسا نہیں کیا کہ ایسے لوگوں کے لیے قتل کا فرمان جاری کر دیں، حضرت مسیح کو خصوصی معجزاتی طاقتیں حاصل تھیں۔ وہ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا جن لوگوں نے آپ کی یا آپ کی والدہ محترمہ کی اہانت کی تھی، ان کو مارنے اور ہلاک کرنے کی مہم شروع کر دیں۔

اسی طرح اسلام کے دور اول میں مدینہ کے منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ پر نعوذ باللہ بدکاری کا الزام لگایا اور عوام کے درمیان خوب پھیلایا۔ حضرت عائشہ نہ صرف پیغمبر اسلام کی اہلیہ تھیں بلکہ ان کی حیثیت ام المومنین کی تھی، وہ تمام مسلمانوں کے لیے مقدس ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ مگر مدینہ میں، اقتدار و اختیار کے باوجود ایسا نہیں کیا گیا کہ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہی تمام مجرمین کو پکڑا جائے اور ان کا سر کاٹ کر شہر کی دیواروں پر لٹکا دیا جائے۔ پھر جب رسول اور اصحابِ رسول نے ایسا نہیں کیا تو بعد

کے مسلمان کس دلیل سے اس قسم کا فعل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

ملاحظات

اخبار میں مولانا میرٹھی کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے: ”رشدی کا شیطانی ناول“ اس مراسلہ کا ایک حصہ یہ ہے:

”بدنام زمانہ رشدی کا شیطانی ناول آج کل مذہبی دائروں سے نکل کر سیاسی حلقوں میں بھی بحث ومباحثہ اور ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جہاں تک اسلامی نقطہ نظر کا تعلق ہے، مسلمان حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کائنات کا بہترین شخصیت مانتے ہیں۔ وہ ہر بات برداشت کر سکتے ہیں، مگر حضور کی توہین اور آپ کی شان میں گستاخی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس سلسلہ میں علامہ خمینی کا اقدام قابل تعریف ہے۔ اور حضرت مولانا علی میاں کا بیان صداقت وحقیقت کا آئینہ دار ہے۔“ (قومی آزادی 27 فروری 1989)

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا اصل پہلو آپ کا ”اسوہ“ ہونا بتایا گیا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اپنی ذات کا اصل پہلو آپ کا ”اعظم“ ہونا قرار دے لیا ہے۔ یہی انحراف ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ رسول کو اگر آپ اسوہ اور نمونہ سمجھیں تو اس سے پیروی کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بجائے اگر آپ رسول کو اعظم واکبر سمجھیں تو اس سے فخر کا ذہن ابھرے گا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں یہ مظہر پوری طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے کا جذبہ تو بالکل مفقود ہے۔ حقیقی اتباع رسول سے ان کے اکابر بھی خالی ہیں اور ان کے اصاغر بھی۔ البتہ آپ شہنشاہِ کونین، سرور کائنات اور فخرِ موجودات کہہ کر اس پر فخر کرنے کا جذبہ اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کی

خاطر وہ ساری دنیا میں دھوم مچانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

حتی کہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے برتر قرار دینے میں بھی مسلمانوں کو کوئی باک نہیں ہے۔ عام مسلمان اس کو کسی قدر مخفی الفاظ میں کہتے ہیں۔ اور جو لوگ زیادہ بے باک ہیں وہ سیدھے سیدھے یہ اعلان کر رہے ہیں:

اللہ کے پلہ میں وحدت کے سوا کیا ہے   جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد سے

موجودہ مسلمانوں کے اسی مزاج کا نتیجہ ہے کہ خدا کے بارے میں خواہ کتنی ہی زیادہ مخالفانہ باتیں کہی جائیں، انہیں اس پر کبھی جوش نہیں آتا، اور نہ اس پر ان کے جذبات بھڑکتے۔ لیکن اگر ان کے پیغمبر کے بارے میں کوئی شخص گستاخی کا ایک کلمہ بول دے تو فوراً بھڑک کر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کے قدرت اللہ شہاب صاحب نے مسلمانوں کی نفسیات کو دو واقعے کی شکل میں بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ دونوں واقعات ان کی ابتدائی طالب علمی کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کو ہم ان کی کتاب سے یہاں نقل کرتے ہیں:

"آبادی سے دور ایک مخبوط الحواس، مجنون صفت، مجذوب نما شخص ویرانے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اور ہمہ وقت اِلّا اللہ، اِلّا اللہ کی ضربیں لگاتا رہتا تھا۔ میں اور میرا ایک ہم عمر ہندو دوست اکثر اس کے پاس جا کر اس کا منہ چڑایا کرتے اور اس کے ذکر کی نقلیں اتارا کرتے تھے۔ میرا ہندو دوست اِلّا اللہ کے وزن پر مہمل مضحکہ خیز اور کبھی کبھی فحش قافیے جوڑ کر مذاق بھی اڑایا کرتا تھا۔ مجذوب نے ہمیں بار بار ڈانٹا کہ ہم اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ کریں لیکن ہم باز نہ آئے۔ ایک روز ہم دونوں اسی مشغلے میں مصروف تھے کہ ایک شخص ادھر سے چند نعتیہ اشعار الاپتا ہوا گزرا، جس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

یہ مصرعہ سن کر میرا ہندو دوست زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور اس نے اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ گستاخیاں بھی کیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر ایک پتھر اٹھایا، اور اسے گھما کر ہندو لڑکے کے منہ پر ایسے زور سے دے مارا کہ اس کا سامنے کا آدھا دانت ٹوٹ گیا۔

لاشعوری کی وہ کون سی لہر تھی جو اللہ کے ساتھ مذاق پر تو خاموش رہتی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی پر آناً فاناً جوش میں آ گئی تھی؟۔

رسول خدا کے متعلق بدزبانی کرے تو اکثر لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ تو مرنے مارنے کی بازی تک لگا بیٹھے ہیں۔ اس میں اچھے، نیم اچھے یا برے مسلمان کی بالکل کوئی تخصیص نہیں۔ بلکہ تجربہ تو یہی شاہد ہے کہ جن لوگوں نے ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانِ عزیز کو قربان کر دیا، ظاہری طور پر نہ تو وہ علم وفضل میں نمایاں تھے اور نہ زہد وتقویٰ میں ممتاز تھے۔ ایک عامی مسلمان کا شعور اور لاشعور جس شدت اور دیوانگی کے ساتھ شانِ رسالت کے حق میں مضطرب ہوتا ہے، اس کی بنیاد عقیدے سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہے۔ خواص میں یہ عقیدت ایک جذبہ اور عوام میں ایک جنون کی صورت میں نمودار ہوتی ہے" (شہاب نامہ، قدرت اللہ شہاب، دہلی 2003، صفحہ 03-1202)۔

خدا کے بارے میں غیر حساس ہونا اور خدا کے پیغمبر کے بارے میں حساس ہونا بلاشبہ گمراہی ہے۔ اس کا ہدایت سے کوئی تعلق نہیں۔ جو لوگ اس قسم کی خوش عقیدگی میں جی رہے ہیں، وہ قیامت کا انتظار کریں۔ اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک نیا دین

تھا جو انھوں نے خود اپنی طرف سے گھڑ رکھا تھا، خدا کے بھیجے ہوئے دین سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ ایک اسلام کا دین ہے، دوسرا ہیرو پرستی کا دین۔ آدمی اگر صحیح معنوں میں اسلام کے دین پر ہو تو اس کے اندر خدا اور رسول دونوں کے ساتھ یکساں درجہ میں تعلق ابھرے گا۔ وہ خدا پر ایمان سے بھی سرشار ہوگا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان سے بھی۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا دین اسلام نہیں ہے بلکہ ہیرو پرستی ہے۔ انھوں نے خدا کو اپنا خدا نہیں بنایا۔ البتہ پیغمبر کو انھوں نے اپنا ہیرو بنالیا ہے۔ پیغمبر ان کا ہیرو ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں خدا کا رسول۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی توہین کی جائے تو غیر جانبدار بنے رہتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص رسول کے بارے میں توہین کا کلمہ بولے تو فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔

مسلمان اپنے اس خود ساختہ دین پر خوش ہیں۔ مگر انہیں جاننا چاہیے کہ قرآن نے اللہ اور اس کے رسول کے درمیان فرق کرنے والوں کے لیے عذاب کا اعلان کیا ہے، نہ کہ انعام کا اعلان (4:150)۔

جلوس کی سیاست

سلمان رشدی کے مسئلہ کو لے کر ہندستان کے مختلف مقامات مثلاً سری نگر، بمبئی (فروری 1989) وغیرہ میں مسلمانوں نے سلمان رشدی کے خلاف جلوس نکالا۔

ہر جگہ یہ قصہ پیش آیا کہ جلوس میں شرکت کرنے والے مسلمان کسی ایک یا دوسرے سبب سے مشتعل ہو کر تشدد پر اُتر آئے۔ انھوں نے قانون کی خلاف ورزی کی۔ حتی کہ پولیس کے اوپر پتھراؤ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس نے گولیاں چلائیں

جس میں مسلمانوں کی نہایت قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں۔

اس قسم کا اقدام ناقابلِ فہم حد تک لغو تھا۔ کیونکہ ہندستان وہ ملک ہے جس نے اس کتاب پر سب سے پہلے قانونی پابندی لگائی۔ حتی کہ پاکستان اور ایران سے بھی پہلے۔ پھر جب یہاں عملاً اس قابل اعتراض کتاب پر پابندی لگ چکی ہے، ایسی حالت میں ہندوستان میں کتاب کے خلاف جلوس نکالنے میں معقولیت کیا ہے۔

جلوس نکالنے والے لیڈر بظاہر معصوم بن کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا جلوس ہندستان کے خلاف نہیں بلکہ برطانیہ کے خلاف تھا۔ ہم برطانی سفارت خانہ یا برٹش کونسل کے دفتر تک جا کر وہاں تحریری احتجاج نامہ دینا چاہتے تھے۔

یہ عذر لیڈروں کے جرم میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات تدبر سے بالکل خالی ہیں اس کے باوجود وہ لیڈری کے میدان میں دھوم مچانا چاہتے ہیں۔ جلوس کے سلسلے میں بار بار کا یہ تجربہ ہے جو لوگ انسانی ہجوم کی صورت میں سڑکوں پر آتے ہیں وہ اس وقت بالکل غیر معتدل حالت میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی طاقت کا احمقانہ حد تک غلط اندازہ کرتے ہیں۔

اس بنا پر جو لوگ اس وقت انسانوں کے متحرک ہجوم میں ہوتے ہیں، وہ کم از کم اس وقتی نفسیات کی بنا پر، اپنے آپ کو ''سڑک کا بادشاہ'' سمجھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت وہ معمولی واقعہ پیش آنے پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ حتی کہ اس مصنوعی زعم کے تحت پولیس سے لڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ بظاہر ان کو اپنی تعداد کے مقابلہ میں کم تعداد میں دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلوس ہمیشہ تشدد اور خون خرابہ پر ختم ہوتا ہے۔

اس بنا پر سلمان رشدی کے مسئلہ پر جلوس نکالنا سراسر غلط تھا۔ اگر کچھ لوگ چاہتے تھے

کہ وہ اپنا احتجاج برطانی گورنمنٹ تک پہنچائیں تو وہ اس کو بذریعہ ڈاک یا بذریعہ تار بھیج سکتے تھے۔ اور اگر دستی طور پر دینا ضروری ہو تو چند آدمیوں کا وفد کسی برطانی دفتر جا کر اسے ان کے حوالے کر سکتا تھا۔

چند تبصرے

سعودی عرب کے شاہ فہد بن عبد العزیز نے (سلمان رشدی کا نام لیے بغیر) اس پر تبصرہ کیا۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ دعوت الی اللہ کا کام احسن طریقہ سے کرنا چاہیے۔ ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم دنیا کی دوسری قوموں کو یہ یقین دلائیں کہ اسلام محبت اور امن کا مذہب ہے۔ اسلام تشدد اور دہشت گردی کا مذہب نہیں: " أكّد خادمُ الحَرَمَيْنِ الشَّرِيفَيْنِ على أَهَمِّيَّةِ الدَّعْوَةِ إلى اللّٰهِ بِالحُسنى. وأنَّ عَلَيْنَا أنْ نُؤَكِّدَ لِلشُّعُوبِ الأُخْرَى أنَّ الإسْلامَ هُوَ دِينُ المَحَبَّةِ والسَّلامِ ولَيْسَ دِينَ العُنْفِ والإرْهَابِ"

(اخبار العالم الاسلامی، مکہ، 22 مئی 1989)۔

امیر کویت الشیخ جابر الاحمد الصباح نے کہا کہ ایک سلمان رشدی کیا، دنیا بھر کے ایسے سارے لوگ بھی اپنی اسلام دشمن تحریروں سے اللہ کے اس سچے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

یہی بات الہ آباد یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر سوشیل کمار سریواستو نے ان لفظوں میں کہی کہ "اسلام اتنا کمزور مذہب نہیں۔ شیطانی آیات جیسی ان گنت کتابیں بھی اس کو ہلا نہیں سکتی۔" (اخبار نو، 23-17 مارچ 1989)۔

اسلام کی ہزار سال سے زیادہ لمبی شاندار تاریخ ہے۔ اس تاریخ نے اسلام کو اس سے زیادہ مستحکم بنا دیا ہے کہ کوئی شخص یا کوئی بڑے سے بڑا گروہ اپنی باتوں سے اس کو ادنی

نقصان بھی پہنچا سکے۔ چنانچہ یہی بات برطانیہ کی موجودہ خاتون وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر نے ان لفظوں میں کہی:

"Great religions should be strong enough to withstand such criticisms as were contained in the book."

یعنی عظیم مذاہب کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس قسم کی تنقید کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکیں جو کہ رشدی کی کتاب میں پائی جاتی ہیں (دی گارجین، لندن، 4 مارچ 1989)۔

پاکستان کی خاتون وزیر اعظم نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملہ کو طول دینے سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ توہینِ عقیدہ کو دہرانا بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسا بجائے خود توہین کرنا۔ انھوں نے کہا کہ اس بات کے مدنظر میرے خیال سے بنیاد پرست مذہبی لوگ بھی رشدی کے ناول اور اس کے قابل اعتراض موضوعات کی تشہیر کر کے اسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کا ارتکاب رشدی نے کیا ہے۔

دونوں یکساں

مرزا غلام احمد قادیانی (1839-1908) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (1868-1948) دونوں ہم عصر تھے۔ اس زمانہ میں جن علماء نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تحریری اور تقریری مقابلہ کیا، ان میں ایک مشہور نام مولانا ثناء اللہ امرتسری کا بھی ہے۔

تردید قادیانیت پر مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ ان کے مناظروں اور تحریروں اور تقریروں سے خود مرزا غلام احمد قادیانی تنگ آ گئے۔ انھوں نے 15 اپریل 1907 کو ایک تحریر لکھی۔ اس کا عنوان تھا "مولوی ثناء اللہ کے ساتھ آخری فیصلہ"۔ اس تحریر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے لکھا کہ: "مولوی ثناء اللہ نے مجھے بہت بدنام کیا۔

میرے قلعہ کو گرانا چاہا۔ اس لیے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہے، وہ سچے کی زندگی میں مرجائے۔"

اس تحریر کے ایک سال بعد 26 مئی 1908 کو مرزا غلام احمد قادیانی کا انتقال ہو گیا۔ دوسری طرف مولانا ثناء اللہ امرتسری مزید 40 سال تک زندہ رہے اور 15 مارچ 1948 کو سرگودھا (پاکستان) وفات پائی۔ اس طرح فیصلۂ خداوندی کے تحت ثابت ہو گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ جھوٹا تھا، اور مولانا ثناء اللہ امرتسری اس کے مقابلہ میں سچ پر کھڑے ہوئے تھے۔

یہ واقعہ مجھے 3 جون 1989 کو یاد آیا جب کہ ریڈیو نے اطلاع دی کہ ایرانی پیشوا آیت اللہ خمینی کا 86 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آیات اللہ خمینی نے 15 فروری 1989 کو یہ فرمان جاری کیا تھا کہ سلمان رشدی کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے فوراً ہی بعد حکومت ایران نے اپنے خزانے اور اپنے سرکاری ذرائع اس فرمان (یا فتویٰ) کی تعمیل کے لیے وقف کر دیے۔ اس کے بعد دنیا بھر میں خمینی اور رشدی کا معاملہ سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر کی حیثیت سے اخباروں میں چھپتا رہا۔ حکومت ایران نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ ایک خفیہ دستۂ موت (death squad) اس قاتلانہ مشن پر روانہ کیا جاچکا ہے۔

مگر حکومت ایران کے مکمل تعاون اور دنیا بھر میں بے شمار شیعہ اور سنّی مسلمانوں کی بھرپور تائید کے باوجود آیات اللہ خمینی اس میں کامیاب نہ ہو سکے کہ وہ سلمان رشدی کو قتل کرا دیں۔ یہاں تک کہ اپنے فرمان موت کے تقریباً چار مہینہ بعد خود آیت اللہ خمینی موت کا شکار ہو گئے۔

مذکورہ دونوں واقعات میں بعض فرق کے ساتھ ایک مشابہت ہے۔ اول الذکر واقعہ میں یہ ثابت ہوا تھا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری حق پر ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی باطل پر۔ ثانی الذکر کا واقعہ میں کسی قدر فرق کے ساتھ یہ ثابت ہوا ہے کہ اس کے دونوں ہی فریق

باطل پر ہیں۔ سلمان رشدی بھی، اور اسی کے ساتھ آیات اللہ خمینی بھی۔

سلمان رشدی کو تاریخی حقائق باطل ثابت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف آیت اللہ خمینی اس لیے باطل قرار پاتے ہیں کہ انھوں نے جھوٹے زعم کے تحت ایک ایسا فرمان جاری کیا جس کا انہیں خدا نے حق نہیں دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں خدا کی تائید حاصل نہیں ہوئی۔ وہ اپنی ساری مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور عوامی طاقت کے باوجود سلمان رشدی کو ختم کرنے میں ناکام رہے۔ قتل تو درکنار، اقدام قتل کے درجہ کا بھی کوئی واقعہ وہ ظہور میں نہ لا سکے۔ یہاں تک کہ موت نے خود ان کا خاتمہ کر دیا۔

ناقابل فہم

مسلمانوں میں جو لوگ سلمان رشدی کے قتل کی وکالت کر رہے ہیں وہ شتم رسول کے مسئلہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا کہ یہ کوئی عام اور مطلق حکم ہے۔ یعنی یہ کہ جب بھی کوئی شخص رسول پر سب وشتم کرے، اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ ازروئے مسئلہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص نہیں۔ اسی طرح اس کا تعلق کسی ایک پیغمبر سے بھی نہیں ہے بلکہ تمام پیغمبروں سے ہے۔ قرآن میں جن پیغمبروں کا ذکر ہے ان میں سے کسی ایک پیغمبر پر سب شتم کرنا فوراً آدمی کو گردن زدنی قرار دے دیتا ہے۔

اگر شتم کے اس مسئلہ کو صحیح مان لیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ صدیوں سے تمام علماء اور تمام مسلم حکمراں اس معاملہ میں مجرمانہ غلطی کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ بار بار سب وشتم کا واقعہ ہونے کے باوجود انھوں نے اس مسئلہ پر عمل نہیں کیا۔ نہ علماء نے قتل کے فتوے دیے، اور نہ حکمرانوں نے ایسے لوگوں کو قتل کرایا۔

جن علماء اور فقہاء کے یہاں یہ مسئلہ ہے کہ سب وشتم کرنے والا شخص واجب القتل ہے، وہ ان کے نزدیک صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں ہے بلکہ خدا کے تمام پیغمبروں کے لیے ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب میں ایک مستقل باب اس عنوان کے تحت قائم کیا ہے کہ:

فَصْلٌ□ الحُكْمُ فِي سَبِّ سَائِرِ الْأَنْبِيَاءِ كَالْحُكْمِ فِي سَبِّ نَبِيِّنَا

اس باب کے تحت ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ تمام پیغمبروں کو سب وشتم کرنے کا وہی حکم ہے جو ہمارے پیغمبر کو سب وشتم کرنے کا حکم ہے۔ پیغمبروں میں سے جس پیغمبر کو بھی کوئی شخص سب وشتم کرے وہ کافر ہے اور اس کا خون حلال ہے۔ ("الحُكْمُ في سَبِّ سائِرِ

الأَنبِياءِ كالحُكْمِ في سَبِّ نَبِيِّنا ...إِنَّ سابَّهُم كافِرٌ حَلالُ الدَّمِ" (الصارم المسلول علی شاتم الرسول، صفحہ 565)۔

ایک طرف اس مسئلہ کو سامنے رکھیے۔ دوسری طرف یہ دیکھیے کہ فقہاء کے یہاں سب و شتم کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ کسی نبی کی اشارہ سے بھی تحقیر کرنا شتم میں داخل ہے۔ ایک مثال اس کو واضح کرتی ہے۔ امام ابو یوسف نے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے میں کدو پسند کرتے تھے اور اس کو رغبت سے کھاتے تھے۔ اس پر جماعت میں سے ایک شخص اٹھا اور اونچی آواز سے کہنے لگا کہ مجھے کدو پسند نہیں۔ امام ابو یوسف نے اس کے اس کلام کو شتم قرار دیا اور اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ آخر کار اس شخص نے توبہ کی اور (حنفی مسلک کے مطابق) اس کی معافی ہوئی۔

اسی واقعہ پر علامہ انور شاہ کشمیری نے یہ شعر کہا ہے کہ ابو یوسف نے ایک شخص کو یہ کہنے پر قتل کردیے جانے کا حکم دے دیا کہ مجھے کدو پسند نہیں، اور وہ وقت معافی کا نہ تھا:

وقِصَّةُ دُبَّاءٍ رَأَى القَتْلَ عندها أبو يوسُفَ القاضي، ولاتَ أَوَانِ

(اکفار الملحدین فی ضروریات الدین، صفحہ 111)۔ اب اگر مسئلہ وہی ہو جو بظاہر اوپر کے بیان میں نظر آتا ہے تو علماء اسلام کو چاہیے تھا کہ ایسے تمام شاتمین کے بارے میں قتل کا فتویٰ دیں۔ اور پھر عام مسلمانوں سے یا مسلم حکومتوں سے یہ کہیں کہ وہ انھیں فوراً قتل کردیں۔ مگر حال یا ماضی کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں کیا گیا۔

ایک مثال لیجیے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے بتکرار حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں واضح گستاخیاں کی ہیں۔ مثلاً اس کا شعر یہ ہے:

ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے

مرزا غلام احمد قادیانی کے اسی قسم کے سب وشتم کی بنا پر اس کے بارے میں علامہ

انور شاہ کشمیری نے یہ شعر کہا ہے کہ (غلام احمد قادیانی کے ہاتھوں) ایک اولوالعزم پیغمبر کو تمہارے سامنے گالی دی جا رہی ہے۔ یہ ایسا جرم ہے کہ قریب ہے کہ آسمان اور زمین پھٹ پڑیں:

”یَسُبُّ رَسُولًا مِنْ أُولِي الْعَزْمِ فِيكُمْ، تَكَادُ السَّمَاءُ وَالأَرْضُ تَنفَطِرَانِ“

(اکفار الملحدین فی ضروریات الدین، صفحہ 108)۔ رسول پر اس سب و شتم کے باوجود مولانا کشمیری نے اور نہ دوسرے علماء نے یہ کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو قتل کردو۔ قادیانی اپنے کھلے ہوئے سب و شتم کے باوجود زندہ رہا۔ یہاں تک وہ اپنی طبعی موت سے مر کر خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

یہ صرف مرزا غلام احمد قادیانی کی بات نہیں بلکہ دنیا میں بسنے والے بیشتر انسانوں کی بات ہے۔ جب سب و شتم کے جرم کا تعلق یکساں طور پر تمام پیغمبروں سے ہے اور اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اشارہ اور کنایہ کے درجہ میں بھی اگر کسی کے کلام سے کسی پیغمبر کی تحقیر ظاہر ہو تو وہ شاتم رسول قرار پاتا ہے۔ اور قانون کی نظر میں واجب القتل ہو جاتا ہے تو نہ صرف معروف قسم کے بددین شتم رسول کے مجرم قرار پائیں گے بلکہ کتنے ہی صلحاء اور علماء کو بھی اس صف میں کھڑا کرنا پڑے گا۔

مثال کے طور پر علامہ اقبال کی ایک نظم نظام الدین اولیاء کے بارے میں ہے۔ اس کا عنوان ”التجائے مسافر“ ہے۔ اس نظم کے دو مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ اس میں پیغمبر کے اوپر غیر پیغمبر کو بلند مرتبہ بتایا گیا ہے جو ہر تعریف کے مطابق شتم رسول ہے:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

اسی طرح مشہور دیوبندی عالم مولانا محمود حسن صاحب کو بھی خدانخواستہ انہیں شاتمین کی صف میں کھڑا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کے فرمودات میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو حضرت مسیح

علیہ السلام کی تحقیر کو مستلزم ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر:

اس مسیحائی کو دیکھیں ذرا ابن مریم　　مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا

یہودی بحیثیت قوم حضرت مسیح کو نعوذ باللہ ولد الزنا کہتے ہیں، اس لیے وہ سب کے سب واجب القتل ہیں۔ عیسائی بحیثیت قوم پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ بناوٹی پیغمبر (false prophet) کہتے ہیں، اس لیے وہ بھی سب کے سب واجب القتل ہوئے۔ آج کل کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ، جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، وحی کو کوئی حقیقی چیز نہیں سمجھتا۔ اس کا عام خیال یہ ہے کہ پیغمبروں نے لوگوں کو نعوذ باللہ، بے وقوف بنانے کے لیے یہ کہہ دیا کہ ان پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔ انھوں نے ایسے کلام کو خدا کا کلام بتا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اسی طرح دنیا کی موجودہ آبادی کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی اعتبار سے اس جرم کا مرتکب ہو رہا ہے جس کو شتم رسول کہا جاتا ہے۔ پھر کیا یہ پُر جوش مسلمان ان تمام لوگوں کو ایک طرف سے بطورِ حد قتل نہ کرنے کی صورت میں خدا کے یہاں ناقابل معافی مجرم نہ قرار پائیں گے۔

قلم کا جواب قلم

ابن تیمیہ (661-728ھ) کے زمانے میں شام میں ایک واقعہ ہوا۔ یہ واقعہ مورخ ابن کثیر نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: عساف نصرانی کا واقعہ: یہ شخص (دمشق کے جنوب میں واقع ایک شہر) السویداء (As-Suwayda) کا باشندہ تھا۔ اس کے خلاف ایک جماعت نے گواہی دی کہ اس نے پیغمبر اسلام کو سبّ (گالی) دیا ہے، اس کے بعد عساف نے امیر آل علی، ابن احمد بن حجی کی پناہ لے لی، پس شیخ تقی الدین ابن تیمیہ، اور شیخ زین الدین الفارقی شیخ دار الحدیث اکٹھے ہوئے، اور دونوں نائب سلطنت امیر عز الدین ایبک الحموی کے پاس گئے، اور اُس تعلق سے نائب امیر سے گفتگو کی۔ انھوں نے ان دونوں کی بات مان لی، اور اسے حاضر ہونے کے لیے پیغام بھیجا۔ پس وہ دونوں نائب امیر کے ہاں سے نکلے، تو ان کے ساتھ بہت سے لوگ تھے، اور جب عساف سامنے آیا، تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک عربی شخص بھی ہے۔ لوگوں نے اس عرب کو برا بھلا کہا، اور ایک دیہاتی آدمی نے کہا: یہ تم سے بہتر ہے، یعنی نصرانی۔ اس کے بعد لوگوں نے دونوں کو پتھر مارے، جو عساف کو لگے، اور وہ بہت زور سے چلانے لگا۔ نائب امیر نے پیغام بھیج کر شیخ ابن تیمیہ اور الفارقی کو طلب کیا، اور اپنے سامنے دونوں کو مارا، اور ان دونوں کو العذراویہ میں قید کر دیا، اور اس نصرانی نے آ کر اسلام قبول کرلیا، جس کی وجہ سے مجلس منعقد کی گئی، اس مجلس میں اس نے ثابت کیا کہ اس کے اور گواہوں کے درمیان عداوت پائی جاتی ہے، پس وہ مباح الدم ہونے سے بچ گیا، پھر نائب امیر نے شیخین کو بلایا، اور انھیں راضی کیا، اور ان کو رہا کر دیا، اس کے بعد وہ نصرانی بلادِ حجاز چلا گیا، اور اتفاق سے وہ مدینۃ الرسول کے قریب قتل ہو گیا، اسے اس کے بھتیجے نے وہاں قتل کیا۔ اس واقعے کے بارے میں شیخ تقی الدین ابن

تیمیہ نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام الصارم المسلول علی ساب الرسول ہے۔ (البدایۃ و النہایۃ، جلد13، صفحہ396)۔

اس طرح کا واقعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینے کے دور میں پیش آیا تھا۔ اس زمانے میں اس کو ہجو (to abuse) کہتے تھے، یعنی بد گوئی کرنا۔ وہ روایت اس طرح ہے: **عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: اهْجُوا قُرَيْشًا، فَإِنَّهُ أَشَدُّ عَلَيْهَا مِنْ رَشْقٍ بِالنَّبْلِ** (صحیح مسلم، حدیث نمبر2490)۔ یعنی عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: قریش کی ہجو کرو۔ کیوں کہ ہجو کے اشعار قریش پر تیروں کی بارش سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں جواب کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ماخوذ شخص کو قتل کر دیا جائے، بلکہ سنت رسول کے مطابق، اس کا جواب یہ تھا کہ اس کے جواب میں ہجو کے اشعار کہے جائیں۔ ہجو کا مطلب اشعار کی زبان میں جواب دینا تھا۔

قدیم زمانہ، پرنٹنگ پریس سے پہلے کا زمانہ تھا، اس وقت لوگوں میں یہی طریقہ رائج تھا۔ اب زمانے کے لحاظ سے اس پر عمل کرنے کا نتیجہ خیز طریقہ یہ ہے کہ نثر کی زبان میں اس کا جواب لکھا جائے، اور اس کو چھاپ کر لوگوں میں شائع کیے جائیں۔ یہی اس معاملے میں ثابت شدہ مسنون طریقہ ہے۔

اس کے مقابلے میں احتجاج کرنا، قتل اور اقدامِ قتل جیسے منفی طرزِ عمل سنتِ رسول سے ثابت نہیں۔ برعکس طور پر ہجو کرنے والے کے لیے ہدایت کی دعا کرنا ثابت ہے۔ جیسا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ماں کے لیے دعا کی۔ حدیث کا متعلق جزء یہ ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: كُنْتُ أَدْعُو أُمِّي إِلَى الْإِسْلَامِ وَهِيَ مُشْرِكَةٌ، فَدَعَوْتُهَا

يَوْمًا فَأَسْمَعَتْنِي فِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَكْرَهُ، فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا أَبْكِي، قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي كُنْتُ أَدْعُو أُمِّي إِلَى الْإِسْلَامِ فَتَأْبَى عَلَيَّ، فَدَعَوْتُهَا الْيَوْمَ فَأَسْمَعَتْنِي فِيكَ مَا أَكْرَهُ، فَادْعُ اللَّهَ أَنْ يَهْدِيَ أُمَّ أَبِي هُرَيْرَةَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اللهُمَّ اهْدِ أُمَّ أَبِي هُرَيْرَةَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2491)۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں اپنی ماں کو اسلام کی دعوت دیتا تھا، جب کہ وہ مشرکہ تھیں، ایک دن میں نے ان کو دعوت دی، تو انھوں نے مجھے رسول اللہ کے بارے میں ایسی بات کہی، جس کو میں ناپسند کرتا ہوں۔ میں روتا ہوا رسول اللہ کے پاس گیا، اور سارا واقعہ سنایا، اور کہا کہ آپ میری ماں کے لیے دعا کر دیجیے، آپ نے یہ سن کر دعا کی۔ اے اللہ، ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے۔ حدیث کے مطابق، ابوہریرہ کی ماں نے اس کے بعد اسلام قبول کرلیا۔

شاتمِ رسول کی سزا

امام ابن تیمیہ (وفات 1328ء) اسلامی تاریخ کے انتہائی مشہور عالم ہیں۔ اُن کو ”شیخ الاسلام“ کہا جاتا ہے۔ شتمِ رسول کے موضوع پر ان کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کا نام یہ ہے: الصّارم المسلول علی شاتم الرسول۔ کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ جو آدمی شتمِ رسول کا مرتکب ہو، اُس کو حد کے طور پر قتل کردیا جائے۔ شتمِ رسول کی اِس سزا کو جائز ثابت کرنے کے لیے انھوں نے لمبی بحثیں کی ہیں، لیکن حقیقی طور پر اُن کے اِس موقف کے لیے نہ قرآن میں کوئی دلیل ہے اور نہ حدیث میں۔

کتاب کے مطابق، بظاہر صرف ایک ”روایت“ ہے جس سے صراحت کے ساتھ شاتمِ رسول کے لیے قتل کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ خود ابنِ تیمیہ اِس روایت کو منکر اور ضعیف بتاتے ہیں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اِس روایت کے راوی غیر ثقہ ہیں۔ اِس اعتراف کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ: ”فَإِنْ كَانَ مَحْفُوظًا فَهُوَ دَلِيلٌ عَلَى وُجُوبِ قَتْلِ مَنْ سَبَّ نَبِيًّا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ“ (صفحہ 93)۔ یعنی اگر یہ روایت درست ہو، تو وہ اِس کی ایک دلیل ہے کہ جو شخص نبیوں میں سے کسی نبی کا سبّ وشتم کرے، اُس کو قتل کردیا جائے۔

امام ابنِ تیمیہ حدیث کے بہت بڑے عالم مانے جاتے ہیں۔ اُن کے بارے میں ان کے ایک سوانح نگار نے یہ قول نقل کیا ہے کہ — ہر وہ حدیث جس کو ابن تیمیہ نہ جانتے ہوں، وہ حدیث نہیں (كُلُّ حَدِيثٍ لَا يَعْرِفُهُ ابنُ تَيمِيَّةَ فَلَيْسَ بِحَدِيثٍ) تاریخ ابن الوردی، جلد 2، صفحہ 277۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ جب خود حافظِ حدیث ابن تیمیہ اِس روایت کو غیر ثقہ مانتے ہوں تو پھر ایسی غیر ثابت شدہ روایت سے قتلِ شاتم کا استدلال کیسے درست ہوسکتا ہے۔ اِس قسم کا استدلال بلاشبہ غیر دینی بھی ہے اور غیر علمی بھی۔ حقیقت یہ

ہے کہ شاتم کو قتل کرنے کے بارے میں نہ قرآن میں کوئی حکم ہے اور نہ حدیث میں۔ اِس معاملے میں مسلمانوں نے اپنے قومی جذبات کو شرعی حکم کا درجہ دے دیا ہے۔ یہ بلاشبہ سرکشی کا فعل ہے۔ یہ خود ایک اہانتِ رسول ہے کہ رسول کے نام پر کسی انسان کو ناحق قتل کیا جائے۔ شتم اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ایک اختلافِ رائے ہے، اور اختلاف رائے کے مقابلے میں جو چیز مطلوب ہے، وہ علمی استدلال ہے، نہ کہ بندوق اور تلوار۔

ابن تیمیہ کی کتاب

علامہ ابن تیمیہ کی کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول کا وہ نسخہ میرے پاس ہے جو مجلس دائرۃ المعارف (حیدرآباد) سے 1322ھ میں چھپا تھا۔ اس کے 600 صفحات ہیں۔ اس کتاب میں شتم رسول کے مسئلہ پر نہایت تفصیلی بحث ہے۔ اس موضوع پر اسلامی کتب خانہ کی غالباً یہ سب سے زیادہ جامع کتاب ہے۔

ابن تیمیہ کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ ان کا ذہن گویا ایک زندہ قاموس تھا۔ ان کے بارے میں کہا ہے کہ کوئی حدیث جس کو ابن تیمیہ نہ جانتے ہوں وہ حدیث ہی نہیں: **کل حَدِیث لَا یعرفہُ ابن تَیمِیۃ فَلَیْسَ بِحَدِیث** (تاریخ ابن الوردی، جلد 2، صفحہ 277)۔ حافظہ کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی کتابیں معلومات کا خزانہ ہوتی ہیں۔ مگر راقم الحروف کا احساس ہے کہ ان کی کتابیں معلومات کے اعتبار سے جس معیار کی ہوتی ہیں، وہ تجزیہ اور استدلال کے اعتبار سے اسی اعلیٰ معیار کی نہیں ہوتیں۔

اس کا ایک نمونہ ابن تیمیہ کی موجودہ کتاب بھی ہے۔ بلاشبہ زیر بحث موضوع پر معلومات کے اعتبار سے ان کی یہ کتاب منفرد کہی جا سکتی ہے۔ مگر تجزیہ اور استدلال کے اعتبار سے وہ کوئی معیاری کتاب نہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں نے اس کے نوٹ تیار کر لیے ہیں جو کئی صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کی روشنی میں آئندہ، ان شاء اللہ، کسی وقت اس کتاب پر ایک مستقل مضمون لکھوں گا جس میں اس کے مباحث کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے گا۔ یہاں مختصر طور پر صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

زیر بحث موضوع پر ابن تیمیہ کا نظریہ یہ ہے کہ شتم رسول کی سزا لازمی طور پر قتل ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص سب وشتم کا جرم کرے وہ فوراً اس کو مار کر اس کا

خاتمہ کردیں۔ ایسے شخص کے لیے اسلام میں اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مگر اس نظریہ کے حق میں انھوں نے جو دلائل جمع کیے ہیں، وہ اس کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔

1۔ علامہ ابن تیمیہ نے ایک باب کے تحت اس اعرابی مسلمان کا ذکر کیا ہے جس نے حنین کی غنیمت کی تقسیم کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل پر الزام لگایا تھا اور کہا تھا کہ یہ تقسیم رضائے الٰہی کے مطابق نہیں کی گئی ہے۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیجیے کہ میں اُس منافق کو قتل کردوں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے اللہ کی پناہ کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کرتا ہوں (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1063؛ مسند احمد، حدیث نمبر 14804)۔

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صرف اس لیے قتل کرنے سے منع نہیں فرمایا کہ لوگ یہ چرچا کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ آپ نے اس لیے منع نہیں فرمایا کہ بجائے خود وہ شخص معصوم تھا: ”فَإِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَمْنَعْ عُمَرَ مِنْ قَتْلِهِ إِلَّا لِئَلَّا يَتَحَدَّثَ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ، وَلَمْ يَمْنَعْهُ لِكَوْنِهِ فِي نَفْسِهِ مَعْصُومًا“ (صفحہ 174)۔

ابن تیمیہ کی اس توجیہ پر غور کیجیے۔ وہ اپنی کتاب میں اس نظریہ کی وکالت کررہے ہیں کہ رسول کی شان میں گستاخی کرنے والا ہر حال میں مباح الدم ہے، اس کو ضرور قتل کردیا جائے۔ اب ان کے سامنے زمانۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے واقعات آتے ہیں جب کہ علی الاعلان گستاخی کرنے کے باوجود لوگوں کو قتل نہیں کیا گیا۔

مذکورہ سنت کے سامنے آنے کے بعد صحیح یہ تھا کہ ابن تیمیہ اپنے نظریہ کی تعدیل کریں، وہ یہ کہیں کہ شاتم رسول کے لیے قتل کی سزا مقید ہے، نہ کہ مطلق۔ مگر وہ ایسا نہیں کہتے۔ اس

کے برعکس، وہ جواب دیتے ہیں کہ ایسے افراد کو قتل نہ کرنے کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ مباح الدم نہ تھے۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اگر ایسے افراد کو قتل کیا جاتا تو لوگ اس واقعہ کو لے کر اسلام کو بدنام کرنا شروع کر دیتے۔ بالفاظ دیگر، میرا نظریہ بدستور صحیح ہے، وہ اس سے غلط ثابت نہیں ہوا۔

مگر سوال یہ ہے کہ ابن تیمیہ کی اس توجیہ سے ثابت کیا ہوا۔ کیونکہ جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے، وہ بدستور ان کے نظریہ کے خلاف ہے۔ ابن تیمیہ کی مذکورہ توجیہ اصل صورت واقعہ میں صرف اتنا فرق کرتی ہے کہ پہلے اگر یہ کہا گیا تھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو بدنامی سے بچانے کے لیے گستاخ کو قتل نہیں کیا"۔ تو اب ابن تیمیہ کے مطابق، بیان کے الفاظ یہ ہوں گے کہ "گستاخی کرنے والا اگرچہ مباح الدم تھا، اس کے باوجود اسلام کو بدنامی سے بچانے کی خاطر آپ نے اس کو قتل نہیں کیا"۔ دونوں حالتوں میں اصل مسئلہ بدستور یکساں حالت میں باقی رہتا ہے۔ اور وہ ہے — گستاخی کرنے والے کو قتل نہ کرنا۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے ایک متوازی مثال لیجیے۔ فتح مکہ کے بعد جو مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے گئے تھے، ان کے بارے میں ایک شخص کہتا ہے کہ وہ سب کے سب مباح الدم تھے۔ اب اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل آتا ہے کہ آپ نے ان مشرکین کو قتل نہیں کیا بلکہ انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ شخص دوبارہ کہتا ہے کہ مشرکین مکہ کو چھوڑنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ مباح الدم نہ تھے، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ آپ ان کی تالیف قلب کرنا چاہتے تھے۔

"محمد اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں" کو ابن تیمیہ نے شاید بالکل لفظی معنوں میں لے لیا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ اب دنیا میں نہ "محمد" باقی ہیں اور نہ "اصحابِ محمد"، اس لیے

اب اس مصلحتِ شرعی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو چکا۔ اب تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ گستاخی کرنے والا مباح الدم ہے۔ اس لیے ہر ایسے شخص کو پکڑ کر فوراً قتل کر دینا ہے۔

مگر یہ ایک طفلانہ بات ہوگی کہ قولِ رسول کا یہ مطلب لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ "محمد اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں" کا مطلب اپنے اصل معنی کے اعتبار سے یہ ہے کہ "اسلام اپنے ماننے والوں کو قتل کرتا ہے۔" اب چونکہ بعد کے دور میں اور آج بھی یہ اندیشہ مزید شدت کے ساتھ موجود ہے، اس لیے آج بھی اس سنت رسول پر عمل کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ آج بھی ہمیں یہی کرنا ہے کہ ایک شخص بالفرض اس معاملہ میں خالص قانونی اعتبار سے مباح الدم ثابت ہو جائے تب بھی ہمیں مصلحت کی بنا پر اس کے قتل سے باز رہنا ہے کہ اگر اس کو قتل کیا گیا تو لوگوں کو یہ موقع مل جائے گا کہ اس کو لے کر اسلام کو بدنام کریں اور اسلام کی وحشیانہ تصویر بنا کر خدا کے بندوں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں آنے سے روکنے لگیں۔

2۔ عبداللہ بن ابی نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مثلاً اس نے کہا کہ اگر ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا (المنافقون 63:8)۔ عزت والے سے اس نے اپنے آپ کو مراد لیا اور ذلت والے نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اسی طرح اس نے کہا کہ جو لوگ رسول اللہ کے ساتھ ہیں ان پر خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں (المنافقون 63:7)۔

عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس طرح کی اور بھی بہت سی گستاخیاں کیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ سے اس کے قتل کی اجازت مانگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ہم ایسا کریں تو مدینہ میں بہت سی ناک اس کے لیے کھڑی ہو جائیں گی۔ مزید آپ نے کہا کہ لوگوں کو یہ موقع نہ دو کہ وہ کہنے لگیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 291)۔

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ پس اسے معلوم ہوا کہ جو شخص اس طرح کے کلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچائے تو اس کو قتل کرنا جائز ہو جائے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ یہ اندیشہ تھا کہ اس کے قتل کی وجہ سے لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں گے: ''**فَعُلِمَ أَنَّ مَن آذَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِثْلِ هَذَا الكَلَامِ جَازَ قَتْلُهُ كَذَلِكَ مَعَ القُدْرَةِ، وَإِنَّمَاتَرَكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتْلَهُ لِمَا خِيفَ فِي قَتْلِهِ مِن نُفُورِ النَّاسِ عَنِ الإِسْلَامِ**'' (صفحہ 175)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ دعوت کی مصلحت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ آپ نے ایک بدترین گستاخ کو صرف اس لیے قتل نہیں کیا کہ اگر اس کو قتل کیا جاتا تو لوگ اسلام سے متنفر ہو جاتے۔

ابن تیمیہ اپنی کتاب میں اس واقعہ کو اور اس کے سبب کو نقل کرتے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ابن تیمیہ کے نظریہ کی تردید ہے۔ ابن تیمیہ بطور خود ایک شاتم کے قتل کو دین کی سب سے زیادہ بڑی قابلِ لحاظ مصلحت قرار دیتے ہیں جب کہ سنت رسول واضح طور پر ثابت کر رہی ہے کہ ایک اور مصلحت ہے جو شاتم کو قتل کرنے سے بھی زیادہ اہم اور قابلِ لحاظ ہے، اور وہ یہ کہ اسلام کو اس سے بچانا کہ لوگ اس سے متنفر ہو جائیں اور اس کی طرف راغب نہ ہو سکیں۔ اگر مصلحتِ دعوت کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو تو شاتم کے زندہ رہنے کو گوارہ کرلیا جائے گا۔ بجائے اس کے کہ اسلام کی بدنام کو گوارہ کیا جائے۔

مذکورہ واقعہ کا نتیجہ ابن تیمیہ کی رائے کے بالکل برعکس ثابت ہو رہا ہے۔ مگر انہوں نے عجیب وغریب تاویل سے اس کو اپنے موافق بنالیا۔

3۔ابن تیمیہ اپنی اس کتاب کے ایک حصہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو اپنے مالوں سے اور اپنے جانوں سے۔ اور جہاد بالنفس زبان سے بھی کیا جاتا ہے جس طرح وہ ہاتھ سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ زبان کا جہاد زیادہ قوی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرکین سے جہاد کرو، اپنے ہاتھوں سے اور اپنی زبانوں سے اور اپنے مالوں سے: جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ (سنن النسائی، حدیث نمبر 3096)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسّان بن ثابت سے کہا کرتے تھے کہ (اپنے اشعار سے) مشرکوں کے مقابلے میں جہاد کرو۔ مدینہ کی مسجد نبوی میں حسان بن ثابت کے لیے ایک منبر رکھا جاتا تھا۔ وہ اس پر بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اشعار میں آپ کی مدافعت کرتے تھے، اور مشرکین کے ہجو کا جواب دیتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اللہ تو روح القدوس سے حسّان کی مدد فرما۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسّان ثابت سے کہا کہ جبریل برابر تمہارے ساتھ ہوتے ہیں جبکہ تم خدا کے رسول کی طرف سے مدافعت کرتے ہو۔ اور آپ نے فرمایا کہ تمہارے اشعار مشرکین کو زیر کرنے کے لیے تیر سے بھی زیادہ سخت ہیں، اور مشرکین کی ایک تعداد مسلمانوں کو اذیت دینے والی چیزوں سے صرف اس لیے رکی رہتی تھی کہ ان کو اپنے بارے میں حسّان بن ثابت کی ہجو کا اندیشہ رہتا تھا۔ کعب بن اشرف جب مدینہ سے مکہ گیا تو اس کا حال یہ ہوا کہ جب بھی وہ کسی ایسے گھر میں ٹھہرنا چاہتا جس کی حسّان نے اپنے اشعار میں ہجو کی ہو تو وہ کعب بن اشرف کو اپنے گھر سے نکال دیتا تھا۔ یہاں تک کہ مکہ میں کعب کو کوئی گھر نہ ملا جو اس کو اپنے یہاں ٹھہرائے۔ اور حدیث میں ہے کہ سب سے افضل جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے ایک سچی بات کہنا ہے (صفحہ 200)۔

اوپر کی سطریں ابن تیمیہ کی عبارت کا ترجمہ ہیں۔ ان باتوں کے تذکرہ کے بعد ابن تیمیہ نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ عجیب وغریب طور پر بالکل غیر منطقی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب مشرکین کے شتم اور ہجو گوئی اور دین خداوندی کے اظہار اور اس کی طرف دعوت دینے کی بابت زبان سے جہاد کرنے کا معاملہ ایسا معاملہ ہے تو معلوم ہوا کہ جس (معاہد) شخص نے دین خدا اور رسولِ خدا پر شتم کیا اور اس کا اظہار کیا اور کتاب الٰہی کا ذکر کھلم کھلا برائی کے ساتھ کیا، تو اس نے مسلمانوں سے جہاد کیا اور ان پر زیادتی کی، اور یہ نقض عہد ہے (اس لیے وہ مباح الدم ہے) صفحہ 200۔

ابن تیمیہ کا مطلب یہ ہے کہ لفظی ہجو تیر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس لیے اگر کوئی معاہد رسول کے خلاف گستاخی کرے تو اس نے تیر اور تلوار سے بھی شدید حملہ کیا۔ اس لیے اس کا عہد ٹوٹ گیا، اور اسی نقض عہد کی بنا پر وہ واجب القتل ہو گیا۔

ابن تیمیہ کو یہاں یہ کہنا چاہیے تھا کہ "الفاظ" کا حملہ "تلوار" کے حملہ سے بھی زیادہ سخت اور زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ الفاظ کا جواب الفاظ سے دیں۔ جو لوگ اسلام یا پیغمبر اسلام پر طعن کریں، نظم ونثر میں طاقتور جواب کے ذریعہ ان کے اٹھائے ہوئے فتنہ کو منہدم کر دیا جائے۔ ہمارا ایسا کرنا سنتِ رسول کے عین مطابق ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اسی اصول پر عمل فرمایا۔ اور اپنے زمانہ کے ہم عصر شاتمین کا جواب حسّان بن ثابت سے شعر کی زبان میں دلوایا، جو گویا کہ اس زمانہ کی صحافت تھی۔

مگر ابن تیمیہ اس کے برعکس، عجیب وغریب طور اس سے یہ مسئلہ نکال لیتے ہیں کہ جس شخص نے اسلام پر الفاظ کے ذریعہ حملہ کیا، اس نے اسلام پر ایسا حملہ کیا جو تیر اور تلوار سے بھی زیادہ شدید تھا۔ اس لیے اس کی واحد سزا یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

مذکورہ سنتِ رسول سے کم از کم جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ شتم رسول کی صرف ایک سزا

نہیں ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ اس سے زیادہ سخت اور کارگر سزا یہ ہے کہ اس کے الفاظ کا جواب طاقتور الفاظ سے دیا جائے۔ اس کے اشعار کو اشعار سے اور اس کی نثر کو نثر سے کاٹا جائے۔ اس کے سب وشتم کو دلائل کے ذریعہ "هَبَاءً مَنْثُورًا" (بے قیمت) بنا دیا جائے۔

ابن تیمیہ کا مذکورہ انداز کلام بڑا عجیب ہے۔ جس سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مخالفین اسلام کے الفاظ کا جواب الفاظ میں دینا چاہیے، کیونکہ جواب کا زیادہ موثر طریقہ ہے۔ اسی سنت سے ابن تیمیہ یہ نکال رہے ہیں کہ شاتم کو قتل کردو۔ کیونکہ اس نے اسلام پر تلوار کے حملہ سے بھی زیادہ بڑا حملہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب الفاظ کا جواب تیر و تلوار سے بھی زیادہ مؤثر ہے تو ہم بھی اپنے دفاع کے لیے اس زیادہ مؤثر ہتھیار کو کیوں نہ استعمال کریں۔ اس کے بجائے ہم اس ہتھیار کو استعمال کرنے کی طرف کیوں دوڑیں جو نسبتاً کم مؤثر ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو تم پر سخت وار کرے، تم اس پر ہلکا وار کرو۔

4۔ عبد اللہ بن ابی مدینہ کے منافقین کا سردار تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بدترین گستاخیاں کرتا تھا اور آپ کو اذیت پہنچاتا تھا۔ وہ اپنی آخری عمر تک ایذا رسائی کا کام کرتا رہا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قتل نہیں کرایا۔ یہاں تک کہ ذوالقعدہ 9ھ میں وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت مر گیا۔

عبد اللہ بن ابی کو قتل نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس لیے اس کے قتل سے باز رہے کہ آپ کو اندیشہ تھا کہ اس کو قتل کرنے کے بعد لوگ اسلام سے دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ اسلام اس وقت کمزور تھا:

"فَعُلِمَ أَنَّ مَنْ آذَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِثْلِ هَذَا الكَلَامِ جَازَ قَتْلُهُ كَذَلِكَ مَعَ الْقُدْرَةِ، وَإِنَّمَا تَرَكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتْلَهُ لِمَا خِيفَ فِي قَتْلِهِ مِنْ نُفُورِ النَّاسِ

عَنِ الإِسْلَامِ لَمَّا كَانَ ضَعِيفًا" (صفحہ 175)۔

ابن تیمیہ کے نزدیک عبداللہ بن ابی کے زمانہ میں اسلام کمزور تھا، اور قتل سے پیدا ہونے والے حالات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس ضعف کی بنا پر اس کھلے ہوئے شاتم رسول کو قتل نہیں کیا گیا۔ مگر ابن تیمیہ کی یہ توجیہ مضحکہ خیز حد تک بے معنی ہے۔

صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے پہلے سال مدینہ میں اسلام کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہوا۔ ہجرت کے نویں سال پورے عرب میں اسلام کا غلبہ قائم ہو گیا۔ اس وقت کم از کم ایک لاکھ جاں نثار صحابہ اسلام کی حمایت پر جمع ہو چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بجسدہ الشریف ابھی دنیا میں موجود تھے۔ آپ وہ پیغمبر تھے جن کی بابت قرآن کی گواہی ہے کہ اپنے مخالفین پر غلبہ ان کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے (58:21)۔ اور یہ کہ ان کا مولیٰ اللہ ہے۔ اور جبریل اور صالح اہل ایمان اور تمام فرشتے ان کے مددگار ہیں (66:4)۔

اب سوال یہ ہے کہ دورِ اوّل میں، مذکورہ تمام موافق حالات کے باوجود، آپ مستہزئین کو قتل کرنے سے باز رہے۔ تو آج وہ کیسے ممکن ہو جائے گا۔ جب پیغمبر خدا کی موجودگی میں اسلام کا حال یہ تھا کہ وہ ضعیف اور کمزور تھا اور اس بنا پر کھلے ہوئے گستاخ اور شاتم کو قتل نہ کیا جا سکا تو بعد کے زمانوں میں تو اسلام یقینی طور پر اس سے بھی زیادہ ضعیف اور کمزور ہوگا۔ ایسی حالت میں تو شاتم رسول کو قتل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ پھر تو اس سزا کو ابدی طور پر منسوخ فرض کر لینا چاہیے۔

کیسا عجیب ہے علامہ ابن تیمیہ کا مذکورہ استدلال۔ اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اس قسم کے دلائل کو دلائل سمجھتے ہیں۔ اور ان کی بنیاد پر اس نظریہ کی وکالت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ شاتم رسول کو لازمی طور پر قتل کر دیں۔ خواہ یہ شاتم مسلم ہو یا غیر مسلم،

خواہ وہ اسلامی حکومت کے تحت ہو یا غیر اسلامی حکومت کے تحت، خواہ وہ ساتویں صدی عیسویں کا انسان ہو یا بیسویں صدی عیسویں کا انسان۔

شاید موجودہ مسلمان اور ان کے رہنما اپنے آپ کو خدا اور ملائکہ سے بھی زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں ۔شاید ان کا خیال ہے کہ ان کی ذمّہ داریاں اس سے بھی زیادہ ہیں جو معلوم طور پر رسول اور اصحاب رسول کی ذمہ داریاں تھیں۔ یہ مسلمان جن کو ان کے نام نہاد رہنماؤں نے "محتسب کائنات" کے منصب بلند پر بٹھا رکھا ہے، ان کے احتساب کا اگلا مرحلہ شاید وہ آسمانی اقدام ہوگا جس کو ان کے محبوب شاعر نے ان شاندار لفظوں میں بیان کیا ہے:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

یعنی، میری دیوانگی کے صحرا میں جبریل ایک گرا پڑا شکار ہے۔ اے ہمت مرداں، یزداں (خدا) پر کمند ڈال۔

ذاتی حق کا معاملہ نہیں

سیرت اور حدیث کے موجودہ ریکارڈ میں بہت سے واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں واضح طور پر آپ کے خلاف سب وشتم کا معاملہ کیا گیا۔مگر آپ نے ایسے لوگوں کو معاف کر دیا۔ آپ نے ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی قانونی کاروائی نہیں کی۔

اس قسم کے واقعات صریح طور پر ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال لوگوں کے نظریہ کی تردید ہیں۔ یہاں ان لوگوں نے اپنے حق میں ایک جواب تلاش کرلیا ہے۔ابن تیمیہ اور دوسرے لوگ (مثلاً ابن قیم) نے لکھا ہے کہ شتم رسول کا مسئلہ حرمتِ رسول کا مسئلہ ہے (الصارم المسلول علی شاتم الرسول، جلد 1، صفحہ 385)۔اس طرح وہ سب وشتم کے معاملہ کو حرمت رسول کا معاملہ قرار دے کر اس کو حقوق العباد کے تحت لائے ہیں۔مگر یہ ان حضرات کی محض ذاتی توجیہ

ہے۔قرآن وحدیث میں اس کے حق میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں۔ اور جب تک قرآن و حدیث کی واضح دلیل نہ ہو۔ اس کو حقوق العباد، بالفاظ دیگر، ذاتی حق کے تحت نہیں لایا جاسکتا (صفحہ 219)۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام پر حملہ سادہ معنوں میں ان کی ذات پر حملہ نہیں، وہ براہ راست اسلام پر حملہ ہے اس طرح وہ ذاتی حق کے بجائے دفاع کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص اگر کہے کہ پیغمبر اسلام عادل نہیں تھے تو یہ آپ کے اوپر محض ایک شخصی حملہ نہیں ہوا۔ ایسا حملہ پورے قرآن اور پورے اسلام کو مشتبہ قرار دینے کے ہم معنی ہے۔ ایسی حالت میں وہ اس طرح ختم نہیں ہوسکتا کہ پیغمبر ذاتی طور پر اس کو معاف کردیں۔ وہ معافی کے بعد بھی پوری طرح باقی رہے گا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا طریقہ اس بارے میں یہ تھا کہ وہ ایسے شخص کو فکری اور نظریاتی طور پر قتل کرنے کی کوشش کرتے تھے، نہ یہ کہ اس کو جسمانی طور پر قتل کرکے یہ سمجھیں کہ اس کا چھیڑا ہوا فتنہ ختم ہوگیا۔

دفاع نہ کہ حد

اس معاملہ میں ابن تیمیہ اوران کے جیسے دوسرے لوگوں کی رائے قائم کرنے میں جو غلطی کی ہے، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انھوں نے شتم رسول کے مسئلہ کو صرف حد یا نفاذ حد کا مسئلہ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ دفاع کا مسئلہ ہے۔ شاتم دراصل اپنی شتم کے ذریعہ اسلام کی صداقت پر ایک قسم کا فکری حملہ کرتا ہے۔ اور جو حملہ فکری نوعیت رکھتا ہو، اس کا توڑ جوابی فکری یلغار ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ تلوار کے ذریعہ شاتم کی گردن کاٹ دینے سے اس کا دفعیہ نہیں ہوتا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ابن تیمیہ نے خود اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مشرکین جب پیغمبر اسلام پر ہجو کرتے تھے تو حسّان بن ثابت الانصاری جوابی ہجو کے ذریعہ آپ کی طرف

سے اس کا دفاع کرتے تھے (كان صلى الله عليه وسلم يقول لحسان بن ثابت: "اغْزُهُمْ وَغَازِهِمْ"، وكان يُنْصَبُ له مِنبَرٌ في المسجد يُنافِحُ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم بشِعْرِه وهجائه للمشركين. وقال النبي صلى الله عليه وسلم: "اللَّهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوحِ القُدُسِ". وقال: "إِنَّ جِبْرِيلَ مَعَكَ مَا دُمْتَ تُنَافِحُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ". وقال: "هي أَنْكَى فِيهِمْ مِنَ النَّبْلِ") صفحہ 206، مطبوعہ الریاض۔

مذکورہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ سب وشتم کا معاملہ اسلام پر ایک نظریاتی حملہ کا معاملہ ہے۔ اس کا صحیح اور کارگر توڑ یہی ہے کہ جوابی نظریہ سے اس کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر دیا جائے۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے منافحت یا مدافعت کا مسئلہ ہے، نہ کہ عام معنوں میں سزائے شرعی کے نفاذ کا مسئلہ۔

یہ حقیقت ہے کہ طعنِ اسلام اور شتم رسول عام معنوں میں ایک قانونی جرم کا معاملہ نہیں ہے کہ مجرم کو ہلاک کر دینے سے اس کا ازالہ ہو جائے شتم رسول، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اسلام پر ایک فکری اور نظریاتی وار ہے۔ اور ایک نظریاتی وار کو جوابی نظریاتی وار کے ذریعہ ہی رد کیا جا سکتا ہے۔

فکری اور نظریاتی فتنہ کو اس طرح ختم نہیں کیا جا سکتا کہ بندوق ہاتھ میں لی جائے اور متعلقہ شخص کو گولی مار کر اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ قاتل کو قتل کر کے قتل کا ازالہ ہو جاتا ہے مگر شاتم کے قتل سے شتم کا ازالہ نہیں ہوتا۔

شتم ایک ایسا مسئلہ ہے جو شاتم کے قتل کے بعد بھی بدستور باقی رہتا ہے۔ اور جب اصل مسئلہ بدستور باقی رہے تو ایک شخص کو قتل کر دینے سے کیا حاصل۔

قیاسی مسئلہ

عام طور پر مشہور ہے کہ اسلامی شریعت نے رسول پر شتم کرنے والے کے لیے قتل کی سزا بطور حد مقرر کی ہے۔ یعنی یہ ایسی سزا ہے جو لازماً جاری کی جائے گی، وہ توبہ سے بھی ساقط نہیں ہوتی۔ مگر یہ مسئلہ جتنا مشہور ہے، اتنا ہی وہ بے اصل اور غیر ثابت شدہ بھی ہے۔ اگلے صفحات میں ہم قرآن، حدیث اور فقہ تینوں اعتبار سے اس مسئلہ کا جائزہ لیں گے۔

اس موضوع پر غالباً سب سے زیادہ جامع کتاب علامہ ابن تیمیہ (728-661ھ) کی ہے۔ ان کی زندگی میں شتم کا ایک واقعہ ہوا۔ عساف نامی ایک نصرانی نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے۔ اس کے بعد شام و مصر میں بحث چل پڑی کہ جو شخص رسول پر سب و شتم کرے، اس کی سزا اسلامی شریعت میں کیا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر ابن تیمیہ نے ایک ضخیم کتاب لکھی جو بعد کو الصارم المسلو م علیٰ شاتم الرسول کے نام سے شائع ہوئی۔ یعنی رسول کو گالی دینے والے کے اوپر کھلی تلوار — راقم الحروف کے پاس جو نسخہ ہے وہ 600 صفحات پر مشتمل ہے۔

قرآن سے استدلال

ابن تیمیہ اپنی اس کتاب (**الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول**) کی ایک فصل (**''لمَسْأَلَةُ الأُولَى: أَنَّ مَنْ سَبَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مُسْلِمٍ أَوْ كَافِرٍ فَإِنَّهُ يَجِبُ قَتْلُهُ''**) میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک ایسی آیتوں کا تعلق ہے جو شاتم کے کفر اور اس کے قتل پر دلالت کرتی ہوں تو ایسی آیتیں قرآن میں بہت ہیں: **''وَأَمَّا الآيَاتُ الدَّالَّاتُ عَلَى كُفْرِ الشَّاتِمِ وَقَتْلِهِ ...فَكَثِيرَةٌ''** (صفحہ 28)۔

مگر اس کے بعد اس کے ثبوت میں انھوں نے جو آیتیں نقل کی ہیں، ان کا قتل شاتم

کے نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی پیش کی ہوئی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو پیغمبر کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے۔ کہو کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے کان ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے۔ اور وہ رحمت ہے ان کے لیے جو تم میں اہل ایمان ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ وہ تمہارے رب کے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کریں۔ حالانکہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ حقدار ہیں کہ وہ اس کو راضی کریں۔ اگر وہ مومن ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے (9:61-63)۔

ان آیتوں میں ایسے لوگوں کا ذکر تو یقیناً ہے جنھوں نے پیغمبر کو اذیت پہنچائی تھی۔ مگر ان میں صراحتاً یا اشارۃً کسی بھی انداز میں حکم موجود نہیں کہ ایسے لوگوں کو قتل کردو۔ ان آیتوں میں صرف جہنم کی آگ اور آخرت کے رسوا کن عذاب کا ذکر ہے، گویا یہ آیتیں مسلمانوں سے کہہ رہی ہیں کہ تم ان ''شاتمین'' سے اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ ان کا جو جرم ہے، اس کی سزا انھیں قیامت میں دی جائے گی۔ تمہارا کام دعوت دینا ہے اور اللہ کا کام محاسبہ کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیتوں سے قتل شاتم کا مسئلہ نکالنا لغت اور تفسیر کے علم سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

دوسری آیت جو ابن تیمیہ نے قتل شاتم کے ثبوت میں پیش کی ہے، اس میں صرف یہ ہے کہ تم مخالفین رسول سے دوستی نہ رکھو۔ اس کے علاوہ سزائے قتل کا اس میں بھی مطلق کوئی ذکر نہیں۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

تم ایسی قوم نہ پاؤ گے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور وہ ایسے لوگوں

سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہیں، اگر چہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان والے کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا ایمان لکھ دیا ہے۔ اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے۔ اور وہ ان کو باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں اور اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے (58:22)۔

اس دوسری آیت کے تحت ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ابوقحافہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شتم کیا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو قتل کرنا چاہا۔ یا یہ کہ ابن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کی تو اس کے بیٹے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے قتل کی اجازت مانگی۔ اس لیے ثابت ہو گیا کہ رسول سے مخالفت کرنے والا کافر اور قابلِ قتل ہے: ”قِيلَ: إِنَّ مَنْ سَبَبَ نُزُولِهَا أَنَّ أَبَا قُحَافَةَ شَتَمَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَرَادَ الصِّدِّيقُ قَتْلَهُ، أَوْ أَنَّ ابْنَ أَبِي تَنَقَّصَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَاسْتَأْذَنَ ابْنُهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَتْلِهِ، لِذٰلِكَ فَثَبَتَ أَنَّ الْمُحَادَّ كَافِرٌ حَلَالُ الدَّمِ“ (صفحہ 29)۔

ابن تیمیہ کے یہ الفاظ دلیل نہیں ہیں بلکہ دھاندلی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مذکورہ دونوں واقعہ میں ابوبکر صدیق اور ابن اُبی کے بیٹے (عبداللہ) کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ اے خدا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو قتل کر دوں۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس واقعہ کا اگلا حصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں سے کسی کے بھی قتل کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ دونوں ”شاتم“ زندہ رہے اور اپنی طبعی موت مرے۔ (ابوقحافہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے، اسباب النزول للواحدی، سورہ المجادلہ، آیت 22،

صفحہ 414؛ الاصابۃ لابن حجر، جلد 4، صفحہ 375، اور عبداللہ بن ابی کے واقعہ کے لیے دیکھیے، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لابن عبدالبر، جلد 3، صفحہ 941)

ظاہر ہے کہ ان واقعات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے شریعت کا حکم اخذ کیا جائے گا، نہ کہ دو مسلمانوں کے ان الفاظ سے جو ہنگامی حالت میں ان کی زبان سے نکل پڑے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق نہیں فرمائی۔

موجودہ زمانہ میں سلمان رشدی کا کیس سامنے آنے کے بعد جو لوگ اس قتل کی وکالت کر رہے ہیں، انھوں نے بھی اس سلسلہ کی کثرت سے مضامین اور بیانات شائع کیے ہیں۔ اس مضامین میں بھی یہ دعوی کیا گیا ہے کہ شاتم کو قتل کرنے کا مسئلہ قرآن سے ثابت ہے۔ مگر ان سب کی دلیلیں بھی اسی طرح بے اصل ہیں جس طرح ابن تیمیہ کی دلیل بالکل بے اصل ہے۔

مثال کے طور پر پاکستان کے عالم مولانا قاضی مظہر حسین صاحب، رشدی کے خلاف ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ”رشدی جیسے ملعون کا واجب القتل ہونا کئی آیات سے ثابت ہوا ہے“ (ماہنامہ حق چار یار، لاہور، جون 1989)۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کی ایک آیت پیش کی ہے، اس آیت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

> بے شک جو لوگ اللہ کو اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اذیت دیتے ہیں، بغیر اس کے کہ انھوں نے کچھ کیا ہو، تو انھوں نے بہتان کا اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا (33:57-58)۔

اس آیت میں رسول کو ایذاء پہنچانے کا ذکر تو ضرور ہے۔ مگر اس میں یہ حکم قطعاً موجود نہیں کہ ایذاء پہنچانے والے شخص کو قتل کر دو۔ اس آیت میں صرف خدا کی لعنت اور خدا کے

عذاب کا ذکر ہے۔ دنیا کے قانونی سزا کے ذکر سے یہ آیت بالکل خالی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحبِ مضمون نے قرآن سے لفظ ''ایذاء'' لیا، اور ''قتل'' کا لفظ اس میں اپنی طرف سے جوڑ دیا۔ اگر اس طرح سے بھی کوئی بات ثابت ہوتی ہو تو کون سی بات ہے جو قرآن سے ثابت نہ کی جا سکے۔

جس شخص نے بھی قتلِ شاتم کے مسئلہ کو قرآن سے ثابت کرنا چاہا ہے، اس نے اسی قسم کا انداز اختیار کیا ہے جس کی دو مثالیں اوپر نقل کی گئیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود ہی نہیں جس میں یہ حکم دیا گیا ہو کہ شاتم کو قتل کر دو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تر ایک خود ساختہ مسئلہ ہے۔ اس کا خدا کی کتاب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔

حدیث سے استدلال

پورے ذخیرۂ حدیث میں کوئی معتبر روایت ایسی موجود نہیں جس کے عبارت النص میں یہ حکم دیا گیا ہو کہ سب وشتم کرنے والے کو قتل کر دو۔ مثلاً اس کے الفاظ یہ ہوں کہ ''مَن سَبَّ رَسُولَكُمْ فَاقْتُلُوهُ.'' (جو تمھارے رسول کی سب وشتم کرے اس کو تم سب قتل کر دو) یا ''مَن شَتَمَ نَبِيًّا مِنَ الأَنْبِيَاءِ فَيُقْتَلُ حَدًّا'' (جو کسی بھی نبی کی سب وشتم کرے اس کو بطور حد قتل کیا جائے گا)۔ اس سلسلے میں حدیث سے قتل کا جو حکم نکالا گیا ہے، وہ حکم بطریقِ قیاس نکالا گیا ہے، نہ کہ بطریقِ نص۔

اس معاملہ میں سب سے عام استدلال یہ ہے کہ حدیث میں یہ حکم آیا ہے کہ جو شخص اپنے دین کو بدل ڈالے اس کو قتل کر دو: مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3017)۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ رسول کا سب وشتم ارتداد کے ہم معنی ہے، اس لیے ایسا فعل کرنے والا مرتد ہو گیا۔ اور جب وہ مرتد قرار پا گیا تو حدیث کے مطابق وہ اس کا مستحق ہو گیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ یہ استدلال کی وہی قسم ہے جس کے ذریعہ شاعر

نے شہد کی مکھی کے '' قتل'' کا جواز نکالا تھا:

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا　　کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا

حقیقت یہ ہے کہ ارتداد اور شتم کو ہم معنی قرار دینا بذات خود ایک غلط قیاس ہے۔ ارتداد ایک شخصی فعل ہے جس طرح قاتل کا قتل کرنا ایک شخصی فعل ہے۔ کیونکہ شاتم اپنے شتم کے ذریعہ دوسروں پر اثر ڈالتا ہے۔ وہ دوسروں کے اندر دین کے بارے میں شک ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ شتم اعتراض اور تنقید اور نکتہ چینی کی نوعیت کا فعل ہے۔ مرتد کو ذاتی سزا دے کر اس کا مسئلہ ختم کیا جاسکتا ہے، مگر شتم کے اثرات کو اس وقت تک ختم کرنا ممکن نہیں جب تک اس کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دلیل کے ذریعہ رد نہ کر دیا جائے۔

اس کی ایک مثال لیجیے۔ یہ مثال وہ ہے جو قرآن کی سورہ نمبر 108 (الکوثر) کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔

عربی زبان میں ابتر کے معنی ہیں کٹا ہوا۔ عربی میں اس شخص کو ابتر کہا جاتا ہے جو بے اولاد ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی، اس لیے مکہ کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہتے تھے۔ یعنی ایسا شخص جس کی نسل آئندہ باقی نہ رہے۔ العاص بن وایل قدیم مکہ کا ایک مشرک سردار تھا۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا کہ انھیں چھوڑو، وہ ایک ابتر شخص ہیں ان کے بعد ان کا کوئی وارث نہیں۔ جب کہ وہ ختم ہوں گے تو ان کا ذکر بھی ختم ہو جائے گا: دَعُوهُ فَإِنَّهُ رَجُلٌ أَبْتَرُ لَا عَقِبَ لَهُ، فَإِذَا هَلَكَ انْقَطَعَ ذِكْرُهُ (تفسیر ابن کثیر، جلد 8، صفحہ 477)۔

یہ واضح طور پر شتم رسول کا ایک واقعہ تھا۔ اس سے عام انسان اس غلط فہمی میں پڑ رہے تھے کہ واقعی پیغمبر اسلام ابتر ہیں، ان کے بعد اس کا سلسلہ باقی رہنے والا نہیں۔ اس غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کچھ لوگ آپ پر ایمان لانے میں متردد ہو رہے تھے۔ اب اس کا

جواب یہ نہیں تھا کہ عاص بن وائل اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس کا جواب یہ تھا کہ طاقتور دلیل سے اس کو رد کر دیا جائے۔

چنانچہ اس کی تردید میں وہ سورہ اتری جس کو الکوثر (108) کہا جاتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا کہ ہم نے محمد کو کوثر دے دیا ہے۔ محمد ابتر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ لوگ ابتر ہیں جو محمد کی مخالفت کر رہے ہیں۔

کوثر کے لفظی معنی خیر کثیر کے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ خیر ہے جو اللہ نے آپ کو دیا: هُوَ الْخَيْرُ الَّذِي أَعْطَاهُ اللَّهُ إِيَّاهُ (تفسیر ابن کثیر، جلد 8، صفحہ 474)۔ ابن عباس کے شاگرد عکرمہ نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد نبوت اور قرآن ہے: هُوَ النُّبُوَّةُ وَالْقُرْآنُ (تفسیر ابن کثیر، جلد 8، صفحہ 474)۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاد سے زیادہ بڑی چیز دے دی ہے، اور وہ سچا دین ہے۔ یہ دین لوگوں کو متاثر کرے گا اور کروروں لوگ آپ کی پیرو اور وفادار بن جائیں گے، ایک صلبی وارث کے بجائے آپ کو کروروں نظریاتی وارث حاصل ہوں گے۔ حتیٰ کہ خود مخالفین کی اولادیں اپنے باپ دادا کو چھوڑ کر آپ کا ساتھی بننے پر فخر محسوس کریں گی۔ ایسی حالت میں سمجھ لو کہ ابتر کون ہے، تم یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

قرآن کا یہ جواب بلاشبہ قتل جسمانی سے زیادہ سخت تھا۔ قتل جسمانی ایک فرد کو ختم کرتا، مگر اس طاقتور تردید نے فرد کے پورے منصوبہ کو ختم کر دیا۔

مرتد اور شاتم کے فرق کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ عرب کے مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو سب وشتم کرتے تھے، حسّان بن ثابت انصاری اشعار کے ذریعہ اس کا جواب دیتے تھے۔ یہ اشعار ان شاتمین کو تیر سے بھی زیادہ سخت بن کر لگتے تھے۔

اس مقصد کی خاطر حسّان بن ثابت کے لیے مدینہ کی مسجد نبوی میں ایک منبر رکھا جاتا تھا۔ اس پر بیٹھ کر وہ اپنے جوابی اشعار پڑھتے تھے اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شاتمین کے مقابلہ میں منافحت (مدافعت) کرتے تھے (الصارم المسلول علی شاتم الرسول، 200)۔

شتم کرنے والوں کے بارے میں یہ بات عین صحیح اور مفید معلوم ہوتی ہے۔ اب اس بات کو مرتدین کے ساتھ جوڑ دیجیے اور الفاظ کو بدل کر اس طرح کیجیے کہ — "جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو چھوڑ کر مرتد ہو گئے تھے، ان کا جواب حسان بن ثابت اشعار کی صورت دیتے تھے۔ اس مقصد کے لیے مسجد نبوی میں ایک خاص منبر رکھا جاتا تھا۔ حسان اس پر بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مرتدین کے مقابلہ میں منافحت (مدافعت) کرتے تھے۔"

پہلی بات انتہائی بامعنی معلوم ہو رہی تھی، مگر دوسری بات اتنی ہی بے معنی معلوم ہونے لگی۔ کیونکہ مرتدین کا مقابلہ تلوار ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے کیا۔ مگر سب وشتم کرنے والوں کا مقابلہ یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا جواب زیادہ طاقتور الفاظ سے دیا جائے جیسا کہ حسّان بن ثابت انصاری نے کیا اور کامیاب ہوئے۔ اس مثال سے مرتد اور شاتم کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سے پہلو ہیں جو حدیث ارتداد سے مذکورہ استنباط کو بے اصل قرار دیتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ حدیث کا تعلق ایک مومن کے مسئلہ سے ہے۔ اس میں اس شخص کا حکم بیان کیا گیا ہے جو پہلے ایمان لایا، اس کے بعد اس سے اسلام کو ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس کے برعکس، شتم کا تعلق مومن اور کافر دونوں سے ہے۔ فقہاء کا عام طور پر یہ کہنا ہے

کہ رسول کی شاتمیں گستاخی کرنے والا ہر حال میں قتل کر دیا جائے گا، خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ ابن تیمیہ کے الفاظ میں جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب وشتم کرے، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر، بیشک اس کو قتل کرنا واجب ہے ”:ان أَنَّ مَن سَبَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ مِنۡ مُسۡلِمٍ أَوۡ كَافِرٍ فَإِنَّهُ يَجِبُ قَتۡلُهُ، هَذَا مَذۡهَبُ عَلَيۡهِ عَامَّةُ أَهۡلِ الۡعِلۡمِ“ (صفحہ 4)۔

اب ایک ایسی حدیث جس کا تعلق صرف مسلمانوں کے گروہ سے ہو، جس میں مدعی ایمان کا مسئلہ بتایا گیا ہو، اس کو ایک ایسے عمومی حکم کا ماخذ کیوں کر بنایا جا سکتا ہے جس کا تعلق مومن اور کافر دونوں سے ہو، جس کو دونوں گروہوں کے اوپر یکساں طور پر نافذ کرنا مقصود ہو۔

دوسری بات یہ کہ کسی کی جانب سے گستاخی اور استہزاء کا فعل صادر ہونے کا موقع پر کیا کیا جائے، اس کے بارے میں ہم کو قیاس اور استنباط سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ اس کا واضح جواب قرآن وسنت میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ پھر جس مسئلہ کا شرعی حکم پیشگی طور پر بتا دیا گیا ہو، اس کے بارے میں ہم کو قیاس اور استنباط سے کام لینے کی کیا ضرورت۔

دوسرے مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ قرآن میں استہزاء کرنے والوں کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ان کو مناسب انداز میں جواب دو۔ اگر اس کے باوجود وہ نہ مانیں تو ان سے اعراض اور ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کرو۔ اسی طرح سنت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ عرب میں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہجو اور بد گوئی کر رہے تھے، ان کے مقابلہ میں آپ نے منافحت لسانی کا طریقہ اختیار کیا، نہ کہ منافحت شمشیری کا۔

یہ نصوص بتاتی ہیں کہ گستاخی کرنے والے کا معاملہ دین کو بدلنے والے کے معاملہ سے مختلف ہے۔ دونوں کو ایک حکم کے تحت لانا درست نہیں۔

ابن تیمیہ نے زمانۂ رسالت کے کچھ واقعات جمع کیے ہیں، جب کہ کسی کو قتل کیا گیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ سب وشتم کی بنا پر قتل کیے گئے تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔

مثلاً انھوں نے کعب بن الاشرف کے قتل کا ذکر کیا ہے اور دعوی کیا ہے کہ اس کو سب وشتم کی بنا پر قتل کیا گیا (صفحہ 73-70)۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کعب بن الاشرف کو بار بار نقض عہد (غداری) کرنے کی بنا پر قتل کیا گیا۔ کعب بن الاشرف دوسرے تمام مخالفین کی طرح سب وشتم کے الفاظ بولتا تھا۔ مگر اس کے قتل کا سبب اس کا نقض عہد تھا، نہ کہ سادہ طور پر صرف سب وشتم۔

اسی طرح ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ ابوجہل کو اس کے سب وشتم کی بنا پر دو انصاری نوجوانوں نے قتل کیا (160-159)۔ مگر یہ سراسر بے دلیل بات ہے۔ ابوجہل میدان جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑائی لڑتا ہوا مارا گیا۔ وہ مشرکوں کی فوج لے کر مدینہ پر چڑھائی کے ارادہ سے نکلا تھا۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر بدر کے مقام پر اس کا مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ میں بہت سے مشرکین مارے گئے۔ انھیں میں ایک ابوجہل تھا۔ اس کو قتل بر بنائے شتم کا کیس قرار دینا بالکل بے معنی بات ہے۔

اس طرح ابن تیمیہ نے دور اول کی کچھ مثالیں دے کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو سب وشتم کی بنا پر قتل کرایا۔ مگر یہ سب غیر متعلق واقعات ہیں۔ ان میں سے کوئی قتل بھی مجرد شتم کی بنا پر نہیں کیا گیا۔ ان کے قتل کے اسباب دوسرے تھے۔ مثلاً میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارا جانا، نقض عہد (غداری) کی بنا پر قابل قتل قرار پانا۔ وغیرہ۔

فقہ سے استدلال

فقہاء عام طور پر یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ جو شخص پیغمبر خدا پر شتم کرے یا ان کے بارے میں گستاخی کے کلمات کہے تو اس کا لازماً قتل کر دیا جائے، خواہ شتم کرنے والا مسلم ہو یا کافر۔ ملاحظہ ہو:

كتاب الام للشافعی، شرح المنهاج، الروضة الندية لصديق حسن خان، الروض الباسم للشوكانی، كشف القناع عن متن الا قناع لمنصور بن يونس البهوتی، فقه السنة للسيد سابق، الفقه علی المذاهب الا ربعة، التشريع الجنائی الاسلامی لعبد القادر عوده) وغیرہ۔

علامہ ابن تیمیہ نے اپنی مفصل کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں اسی مسلک کو دلیل وشواہد سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ جمہور کا مسلک ہے۔ اوراس پرعام علماء اسلام کا اجماع ہے(صفحہ 5-4)۔

جن لوگوں کی نظر فقہ کی کتابوں پر ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان مسائل میں فقہاء زیادہ تر صرف رائے نقل کرتے ہیں، وہ اس کے دلائل بیان نہیں کرتے۔ ان مسائل میں فقہاء کا عام طریقہ یہ ہے کہ ابتداءً اگر ایک معروف عالم کسی معاملہ میں ایک فتویٰ دے دے تو بعد کے لوگ مزید تحقیق کے بغیر بس اسی کو نقل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ دعوی کر دیا جاتا ہے کہ اس پر فقہاء علماء کا اجماع ہے۔ حالانکہ یہ زیادہ تر مقلدانہ اتفاق رائے ہوتا ہے، نہ کہ حقیقۃً علمی اور شرعی تعریف کے مطابق اجماع۔

اجماع کو متفقہ طور پر چار ادلّہ شرعیہ میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ تاہم قتل شاتم کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس پر علماء امّت کا اجماع ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ جمہور علماء نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ایک صورت یہ ہے کہ کسی مسئلہ کے بارے میں مختلف زمانوں کے علماء وفقہاء جو رائیں دیتے رہے ہوں، ان میں عمومی یکسانیت پائی جائے۔ اس کو جمہور کا اتفاق رائے کہا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اہل علم کی اکثریت کی رائے۔

دوسری صورت وہ ہے جس کو اجماع کہا جاتا ہے۔ بیضاوی نے منہاج الاصول میں

اجماع کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ معاملات میں سے کسی معاملہ میں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل وعقد کے اتفاق رائے کا نام ہے: "وَهُوَ اتِّفَاقُ أَهْلِ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ مِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَمْرٍ مِنَ الْأُمُور" (منہاج الاصول، جلد 1، صفحہ 37)۔

اجماع کے برحق ہونے پر اسلام کے شورائی حکم سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اس سلسلہ میں قرآن کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے کہ معاملات میں لوگوں سے مشورہ لو: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3:159)۔ اس آیت کو اصول اجماع کا ماخذ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ مشورہ بھی اجماع کا ایک ضروری جزء ہے۔ اجماع حقیقۃً وہ ہے جو علمائے امت کے باہمی مشورہ کے بعد سامنے آئے۔ اس لحاظ سے اجماع کی شرط لازم اجتماع ہے۔ کیونکہ باہمی مشورہ سے کسی متفقہ رائے پر پہنچنا صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ تمام متعلقہ افراد کسی ایک مقام پر جمع ہوں اور آپس میں بحث وگفتگو کے بعد ایک رائے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

قتل شاتم کے مسئلہ پر پوری تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ علماء اور فقہاء کا ایک مقام پر اجتماع ہو اور وہاں باہمی مشورہ کے بعد ایک متفقہ فیصلہ کیا جائے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس مسئلہ پر علماء وفقہاء کا اجماع ہے۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس مسئلہ میں جمہور (اکثریت) کی رائے یہی ہے کہ شاتم کو قتل کردیا جائے۔ مذکورہ نوعیت کے اتفاق رائے کو اگر اجماع کہا جائے تو وہ مجازی طور پر ہوگا، نہ کہ حقیقی طور پر۔

تاہم ان بحثوں سے قطع نظر، دو نہایت اہم واقعہ اس مفروضہ اجماع سے ٹکراتا ہے۔ ایک یہ کہ سارے قرآن اور سارے ذخیرۂ حدیث میں کوئی بھی ایسی نص موجود نہیں جس میں صراحۃً یہ حکم دیا گیا ہو کہ جو شخص گستاخی یا شتم کا فعل کرے اس کو فوراً قتل کردو۔ اس کو ہرگز زندہ نہ چھوڑو، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ پورا قرآن اور تمام کتب حدیث اس طرح کے کسی صریح حکم سے خالی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ، اپنی تمام تر شہرت کے باوجود، صرف

قیاسی یا استنباطی ہے، وہ کسی نص صریح سے براہ راست طور پر ماخوذ نہیں۔

دوسری بات یہ کہ علماء اور فقہاء کے حوالے سے جو مسئلہ بیان کیا جاتا ہے، وہ صرف پیغمبر اسلام کے لیے نہیں ہے۔ وہ خدا اور ملائکہ اور پیغمبر اسلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کے لیے یکساں طور پر عام ہے، اس فقہی مسئلہ کے مطابق، اصلی اور پورا حکم یہ ہے کہ جو شخص بھی، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر، اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کے بارے میں گستاخی کے کلمات کہے، یا دین خدا پر کسی قسم کا عیب لگائے، تو اس کو بطور حد قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس کو ہرگز زندہ نہ چھوڑا جائے، خواہ اس نے اپنے فعل سے توبہ کر لیا ہو۔

ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں کئی جگہ یہ بات لکھی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کوئی ذمی اگر رسول کو برا کہے یا اللہ کو برا کہے یا اسلام پر عیب لگائے اور ہمارے دین پر طعن کرے تو اس کا قتل واجب ہو جائے گا: ''أَنَّ الذِّمِّيَّ إِذَا سَبَّ اللَّهَ أَوْ عَابَ الْإِسْلَامَ ...وَطَعَنَ فِي دِينِنَا فَيَجِبُ قَتْلُهُ بِنَصِّ الْآيَة'' (صفحہ 17)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی کہ آپ اس شخص کا خون مباح کر دیتے تھے جو اللہ کو اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچائے اور دین میں طعن کرے: ''وهَذَا كَانَتْ سُنَّةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِنَّهُ كَانَ يُهْدِرُ دِمَاءَ مَنْ آذَى اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَطَعَنَ فِي الدِّين'' (صفحہ 16)۔ واضح ہو کہ ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ ''یہ رسول اللہ کی سنت تھی'' صحیح نہیں۔ یہ محض تعمیم (generalization) ہے۔ انھوں نے بعض استثنائی واقعہ کو عمومی واقعہ کے طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

ابن تیمیہ نے ایک حدیث قدسی کو نقل کیا ہے کہ اللہ کہتا انسان مجھ کو تکلیف دیتا ہے، یعنی وہ زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے اور میں ہی زمانہ ہوں: يُؤْذِينِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ

وَأَنَا الدَّهْرُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر4826)۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ خدا اور رسول کو ایذاء پہنچانا، خواہ قلیل ہو یا خفیف ہر حال میں موجب قتل ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچانے کو سبب قتل قرار دیا: ”فَإِنَّهُ جَعَلَ مُطْلَقَ أَذَى اللَّهِ تَعَالَى وَرَسُولِهِ مُوجِبًا لِقَتْلِ رَجُلٍ مُعَاهَدٍ“ (صفحہ 73)۔ دوسری جگہ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر سب وشتم کرے اور اگر مسلم ہے تو اس کا قتل واجب ہے: ”مَنْ سَبَّ اللَّهَ تَعَالَى فَإِنْ كَانَ مُسْلِمًا وَجَبَ قَتْلُهُ“ (صفحہ 550)۔

ایک حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ ایک دلیل ہے جو اس کو واجب قرار دیتی ہے کہ نبیوں میں سے کسی نبی پر جو شخص سب وشتم کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔اس حکم کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ وہ توبہ طلب کیے بغیر قتل کر دیا جائے گا، اور اس کا قتل بطور حد ہے: ”فَهُوَ دَلِيلٌ عَلَى وُجُوبِ قَتْلِ مَنْ سَبَّ نَبِيًّا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ، وَظَاهِرُهُ يُدُلُّ عَلَى أَنَّهُ يُقْتَلُ مِنْ غَيْرِ اسْتِتَابَةٍ، وَأَنَّ الْقَتْلَ حَدٌّ لَهُ“ (صفحہ 92)۔ یہ حدیث اگرچہ خود ابن تیمیہ کے اقرار کے مطابق ضعیف ہے۔مگر موجودہ بحث کے اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ابن تیمیہ نے اس کا حوالہ دے کر جس مسلک کو اختیار کیا ہے، وہ یہی ہے کہ کسی بھی پیغمبر پر شتم کرنے والے کو فوراً قتل کر دیا جائے گا۔

ابن تیمیہ ایک فصل کے تحت لکھتے ہیں کہ تمام پیغمبروں پر سب وشتم کرنے کا وہی حکم ہے جو ہمارے پیغمبر پر سب وشتم کرنے کا حکم ہے۔یعنی ان سب پر سب وشتم کرنے والا کافر ہے، اور ایسے شخص کا خون حلال ہے: ”الحُكْمُ فِي سَبِّ سَائِرِ الْأَنْبِيَاءِ كَالحُكْمِ فِي سَبِّ نَبِيِّنَا ...أَنَّ سَابَّهُمْ كَافِرٌ مُحَارِبٌ حَلَالُ الدَّمِ“ (صفحہ 71-570)۔

عبد القادر عودہ لکھتے ہیں کہ پیغمبروں اور فرشتوں کا استہزاء کرنے کے بارے میں فقہاء کی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایسے شخص کو بطور حد قتل کر دیا جائے اور اس کی توبہ قبول نہیں کی

جائیگی۔ دوسری رائے یہ کہ ایسا شخص مرتد ہے، اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ لیکن اگر وہ دوبارہ ایسا کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی: "سَبُّ الرُّسُلِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالِاسْتِهْزَاءِ بِهِمْ، وَفِي الْمَذْهَبِ رَأْيَانِ: أَحَدُهُمَا: يَرَى الْقَتْلَ حَدًّا فَلَا تُقْبَلُ التَّوْبَةُ. وَالثَّانِي: يَرَى أَنَّهُ مُرْتَدٌّ يُقْتَلُ لِلرِّدَّةِ فَتُقْبَلُ تَوْبَتُهُ. مَن تَكَرَّرَتْ رِدَّتُهُ فَلَا تُقْبَلُ تَوْبَتُهُ" (التشریع الجنائی، جلد 2، صفحہ 27-726)۔

حکم کی اس عمومی نوعیت کے اعتبار سے دیکھیے تو انسانی آبادی میں شاذ ونادر ہی کچھ ایسے خوش قسمت افراد ملیں گے جو اس حکم کی زد میں نہ آتے ہوں۔ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کسی نہ کسی اعتبار سے اس حکم عام کی گرفت میں آجائے گی۔ حتی کہ یہ فہرست اتنی لمبی ہوسکتی ہے کہ سب کے سب انسان قابل قتل قرار پائیں، اور پھر یہ حکم عملی طور پر کالعدم ہو جائے، کیونکہ جب سارے افراد قابلِ قتل ہوں تو وہ کون ہوگا جو ان لوگوں کے خلاف اٹھے۔ اور کون ہوگا جو انھیں قتل کر کے ان کا خاتمہ کرے۔

فقہاء نے ایک طرف شتم بطور حد (لازمی طور پر) قتل قرار دی ہے۔ اور دوسری طرف شتم کی ایسی تعریف کی ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے شاتم قرار پاتا ہے۔

اس تعریف کے مطابق، استہزاء کرنا، تنقیص کرنا، عیب لگانا، اہانت کرنا، گستاخی کرنا، لمز کرنا، ایذا رسانی کرنا، خوض اور لعب کے تحت کچھ کہنا، سب کا سب شتم میں داخل ہے۔ اس کے مطابق، نہ صرف مذمم اور ابتر اور غیر عادل جیسے الفاظ بولنا سب وشتم ہے بلکہ رسول کی دی ہوئی خبر کی اشاراتی تحقیر کرنا بھی سب وشتم میں داخل ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ کیا ان صاحب کا خیال ہے کہ روم کے محل اور قلعے فتح ہوں گے: "أَيَظُنُّ هَذَا أَنْ يَفْتَحَ قُصُورَ الرُّومِ وَحُصُونَهَا؟" (صفحہ 34-33)۔

موجودہ صورت میں یہ مسئلہ کس قدر سنگین ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں چند

مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يُؤْذِينِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ** (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4826)۔ یعنی انسان مجھ کو ایذا پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، حالانکہ میں ہی زمانہ ہوں۔ ایک اور روایت کے مطابق، یہ بھی اللہ کو برا کہنا ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ نے اپنا بیٹا لیا ہے، جیسا کہ مشرکین فرشتوں کے بارے میں کہتے ہیں اور مسیحی حضرت عیسیٰ کے بارے میں۔

اس حدیث میں جس قسم کی باتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کو ایذاء پہنچانا ہے، وہ بہت عام ہیں، اس کے مطابق ہر دور کے بیشتر انسان اللہ کا سب وشتم کرنے کے جرم میں مرتکب قرار پاتے ہیں۔ تمام مشرکین، تمام عیسائی، اور جدید تعلیم پائے ہوئے بیشتر لوگ مجرمین کے اس زمرہ میں داخل ہیں۔ اس لیے مذکورہ فقہی مسئلہ کے مطابق، سب کے سب اس قابل ہیں کہ انھیں قتل کردیا جائے۔

یہی معاملہ سبّ انبیاء کا بھی ہے، مثلاً یہودی بحیثیت ایک قوم حضرت مسیح علیہ السلام کو، نعوذ باللہ، ولد الزنا کہتے ہیں۔ اسی طرح عیسائی لوگ، جو دنیا میں سب سے بڑا مذہبی فرقہ ہیں، وہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جھوٹا پیغمبر (False Prophet) قرار دیتے ہیں۔ اب مذکورہ مسئلہ کے مطابق، دنیا بھر کے تمام یہودی اور تمام عیسائی واجب القتل ہیں۔ ان سب کو جمع کرکے ایک ایک شخص کی گردن ماردینا چاہیے۔

یہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو مشرکانہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ جو اللہ کی صفات میں سے کسی صفت میں غیر خدا کو شریک کرتے ہیں۔ اس گروہ میں معروف مشرکوں کے علاوہ بہت سے قبر پرست اور اکابر پرست مسلمان بھی شامل ہیں، وہ سب کے سب خدا کی تنقیص کرنے کے مجرم ہیں۔ وہ غیر اللہ کے لیے ایسے کلمات بولتے ہیں جو اللہ کو ایذاء پہنچانے کی تعریف میں

آتے ہیں، مذکورہ مسئلہ کے مطابق، یہ تمام لوگ بھی اس قابل ہیں کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی زندہ چھوڑے جانے کا مستحق نہیں۔

سب وشتم کی بنیاد پر قابل قتل افراد کی یہ فہرست یہیں پر ختم نہیں ہوتی، اس کا سلسلہ خود آیت اللہ خمینی اور ان کے متبعین تک جاتا ہے جو سلمان رشدی کو قتل کر کے اس کو "جہنم رسید" کرنے کے چیمپین بنے تھے۔ خمینی کی ولایت فقیہ کا عقیدہ اور دوسرے شیعی عقائد، سنّی علماء کے فتووؤں کے مطابق، خدا کی بھی توہین ہیں اور خدا کے رسول کی بھی توہین۔ ایسی حالت میں اہل اسلام پر یہ واجب ہوجاتا ہے کہ امام خمینی اور ان کے ہم خیال تمام لوگوں کو پکڑ پکڑ کر قتل کرڈالیں، ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑیں۔

واضح ہو کہ یہ راقم الحروف کا نظریہ نہیں۔ مگر "قتل شاتم" کے نظریہ کی وکالت کرنے والوں کے نظریہ کا لازمی تقاضا یہی ہے۔

جیسا کہ اوپر کے حوالے سے واضح ہے، دین پر عیب لگانا یا اس پر طعن کرنا بھی جرم ہے جس پر آدمی کا قتل واجب ہوجاتا ہے۔ اس حکم کی روشنی میں موجودہ حالات کو دیکھیے تو آج یہ چیز بے حد عام ہو چکی ہے۔ آج کا وہ طبقہ جس کو جدید تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے، وہ تقریباً 99 فی صد اس جرم کا مجرم قرار پاتا ہے۔

تمام سوشلسٹ اور کمیونسٹ حضرات اس کے مطابق مجرم ہیں۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ مذہب ایک ذہنی افیون ہے۔ بقیہ لوگ بظاہر ایسے الفاظ نہیں بولتے۔ تاہم وہ بھی مہذب الفاظ میں وہی بات کہتے ہیں جس کو کمیونسٹ لوگ برہنہ الفاظ میں کہہ رہے ہیں۔

اس طرح مذکورہ مسئلہ کے مطابق، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی تقریباً 99 فی صد تعداد اس قابل ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے یا گولی مار کر اس کو ہلاک کر دیا جائے۔

مزید یہ کہ اس نظریہ کے حامیوں کا کہنا ہے کہ سب وشتم کی سزا کے نفاذ کے لیے کسی

حکومت یا کسی عدالتی کارروائی کی ضرورت نہیں۔" اسلامی حکومت اگر یہ سزا نافذ نہ کر رہی ہو تو کوئی بھی مسلمان اس کو نافذ کر سکتا ہے، اور ایسے شخص کے بطور خود قتل کر سکتا ہے"۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ نظریہ سراسر لغو ہے۔ تاہم قتل شاتم کے حامیوں کے نزدیک مسئلہ کی نوعیت یہی ہے۔

شتم کے معاملہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک عجیب تضاد میں مبتلا ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ جب مسئلہ بیان کرنا ہو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر پر سب و شتم کرنا یکساں طور پر جرم ہے۔ وہ ایسے ہر شاتم کو واجب القتل قرار دیتا ہے۔ مگر عملی اعتبار سے ان کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اپنے پیغمبر کے سب و شتم پر بھڑکتے ہیں۔ جہاں تک دوسرے پیغمبروں کا تعلق ہے، ان کے خلاف خواہ کسی بھی قسم کی گستاخی کی جائے، ان کے اندر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی بے شمار تصویریں بنائی گئی ہیں، وہ کروروں کی تعداد میں کتابوں اور گھروں وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مگر اس تصویر سازی پر مسلمانوں کے اندر کوئی اشتعال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اپنے پیغمبر کے بارے میں اگر صرف دور کی ایک خبر سن لیں تو فوراً مشتعل ہو کر آمادۂ فساد ہو جائیں گے۔ اسی طرح دوسرے پیغمبروں کے بارے میں بے شمار گستاخانہ باتیں بولی اور چھاپی جا رہی ہیں۔ مگر مسلمانوں کو اس بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ صرف اس وقت مضطرب ہوتے ہیں جب کہ اس بری خبر کا تعلق ان کے اپنے پیغمبر سے ہو۔

یہ معاملہ یہاں تک پہنچا ہے کہ نہ صرف اغیار بلکہ مسلمان خود بھی اپنے پیغمبر کی تعظیم اور دوسرے پیغمبروں کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں، اس کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ہندو یا عیسائی یا یہودی یہ لکھ دے کہ " مکہ وہ بستی ہے جس کو چھوڑ کر

حضرت محمد بھاگ گے تھے" تو تمام مسلمان بپھر اٹھیں گے اور اس کتاب کو جلانا شروع کر دیں گے جس میں ہجرت کے لیے بھاگنے کا لفظ لکھا گیا ہے۔ مگر خود ان کا ایک شخص لکھتا ہے کہ "یہ وہی بستی ہے جس کو چھوڑ کر یونس علیہ السلام بھاگ گے تھے" (تفہیم القرآن، جلد 4، صفحہ 309) تو مسلمانوں کے اندر اس گستاخی پر کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ روش خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کے ہم معنی ہے۔ اور جو لوگ رسولوں کے درمیان تفریق کریں، وہ ایک کے ساتھ کچھ معاملہ کریں اور دوسرے کے ساتھ کچھ، وہ اللہ کے یہاں سزا کے مستحق ہیں، نہ کہ انعام کے مستحق۔

حقیقت یہ ہے کہ "قتل شاتم" کا مذکورہ مسئلہ ناقابل فہم حد تک بے اصل مسئلہ ہے۔ اس کے لیے کتاب وسنت میں کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔ اور نہ اسلام کی تاریخ میں، آغاز سے لے کر اب تک، کبھی اس کو عملی طور پر اختیار کیا گیا۔ اور نہ امکانی طور پر اس کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ مسئلہ کو سامنے رکھیے اور اسلام کی تاریخ کو دیکھیے، تو معلوم ہوگا کہ ساری اسلامی تاریخ میں کبھی بھی اس پر عمل نہیں کیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب میں جو عیسائی تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ساختہ نبی کہتے تھے۔ یہودی دہرا مجرم تھے، کیونکہ وہ پیغمبر اسلام کو بھی تحقیر کرتے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی بھی۔ اس وقت وہاں جو مشرکین تھے، وہ پیغمبر کی توہین وتحقیر کے علاوہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اس طرح ان کا جرم اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

اس اعتبار سے دیکھیے تو قدیم عرب کی آبادی میں کم از کم 95 فی صد لوگ ایسے تھے، جو کسی نہ کسی قسم کے شتم یا ایذا رسانی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اب شرعی مسئلہ یہی ہے کہ ایسے لوگوں

کو بے دریغ قتل کر دیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہیے تھا کہ عرب کی بیشتر آبادی کو تہ تیغ کر ڈالتے۔ اور جب یہ قتل بطور حد تھا تو ازروئے مسئلہ آپ ان کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہوں تو جزیرہ نما عرب میں چاروں طرف قبروں کے سوا کوئی اور منظر دیکھائی نہ دے، بشرطیکہ وہاں کوئی دیکھنے والا ابھی زندہ حالت میں موجود ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے زمانہ میں بھی ہمیشہ یہی صورت حال کم وبیش جاری رہی۔ سب وشتم کا جو عمومی مفہوم فقہاء نے بیان کیا ہے، اس کے لحاظ سے دوبارہ دنیا کی آبادی کا کم از کم 95 فی صد کسی نہ کسی اعتبار سے خدا یا پیغمبر اسلام یا دوسرے پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کی تنقیص اور گستاخی کے جرم کا مرتکب ہو رہا تھا۔ اس لیے دوبارہ یہی عمل ساری دنیا میں جاری ہونا چاہیے تھا کہ دنیا کی آبادی کے بیشتر حصہ کو قتل کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ زمین کے اوپر شاتمین کی قبروں کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہ دے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم حق کے داعی تھے، آپ کا کام شاتم کو سزا دینا نہ تھا، آپ کا اصل کام شاتم کو مومن بنانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں آپ کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے— اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو رحمتِ عالم کا لقب دیا تھا۔ مگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کا نام تاریخ میں نعوذ باللہ قاتلِ عالم کی حیثیت سے درج کیا جائے۔

جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر اب تک کبھی اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس عرصہ میں بعض استثنائی افراد ضرور قتل کیے گئے ہیں جن کے ساتھ دوسرے اسباب، مثلاً نقض عہد (غداری اور بغاوت) کا جرم شامل تھا۔ مگر مجرد لفظی ایذا رسانی کی بنیاد پر اس قسم کے قتل عام کا نہ کبھی کسی عالم نے نام زد فتوی دیا اور نہ کبھی کسی حاکم نے اس پر عمل درآمد کیا۔

بعض افراد جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر قتل کرا دیا، یا جن سے جنگ کی وہ براہِ راست خدائی حکم سے تھا جو صرف پیغمبر کے لیے خاص ہوتا ہے۔ تمام پیغمبروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جب ان پر خدا کا پیغمبر اتمام حجت کر دے تو اس کے بعد ان کے لیے زمین پر زندہ رہنے کا حق باقی نہ رہے۔

پچھلے پیغمبروں کی مخاطب قوموں کے ساتھ اس سنت الٰہی کا ظہور زیادہ تر اس طرح ہوا کہ سمندر یا طوفان یا زلزلہ جیسی قدرتی آفات کے ذریعہ انھیں تباہ کر دیا گیا (العنکبوت 29:40)۔ مگر مخصوص مصالح کی بنا پر پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی مخاطب قوم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوا کہ خود اہل ایمان کے ذریعہ اس پر اس خدائی سزا کا نفاذ کیا جائے: قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ (9:14)۔ یعنی، ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا۔

اس نوعیت کا قتل یا قتال انتہائی استثنائی معاملہ تھا۔ اس کا تعلق خصوصی طور پر صرف پیغمبر سے ہے۔ وہ پیغمبرانہ اتمام حجت کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ سادہ طور پر گستاخی اور بدزبانی کے مسئلہ سے۔ پیغمبر کے بعد کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس طرح کے واقعات کا حوالہ دے کر اپنے زمانہ کے لوگوں کو قتل کرنے لگے۔ بعد کے لوگوں کو صرف دعوت دینا ہے اور بقیہ تمام باتوں کو اللہ کے اوپر چھوڑ دینا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اور ملائکہ اور انبیاء کے خلاف گستاخی کرنا یا دین پر عیب لگانا، ایک اعتراض ہے، نہ کہ سادہ معنوں میں محض ایک جرم۔ عام قسم کے سماجی یا اخلاقی جرم کا توڑ جسمانی سزا کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے، مگر ایک فعل جو اعتراض اور تنقید کی نوعیت کا ہو، اس کا دفعیہ صرف جسمانی سزا کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اس کا واحد توڑ یا دفعیہ یہ ہے کہ اس کو دلائل سے رد کیا جائے۔ معترض کے الفاظ کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور الفاظ سے اس کو بے حقیقت

ثابت کر دیا جائے۔

ان واضح اسباب کی بنا پر راقم الحروف کی قطعی رائے ہے کہ قتلِ شاتم کے بارے میں ''جمہور فقہاء'' کا جو مسلک نقل کیا جاتا ہے، وہ یا تو اس معنی میں نہیں ہے جس معنی میں ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال لوگ اس کو لے رہے ہیں۔ اور بالفرض اگر وہ اس معنی میں ہو تب بھی وہ یقینی طور پر قابل لحاظ نہیں۔

یہ مسئلہ دین میں ایک ایسا اضافہ ہے جس کے لیے نہ قرآن و حدیث میں کوئی صریح نص موجود ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اس کی تصدیق ملتی ہے۔ مزید یہ کہ اس مسئلہ کو بجنسہ ماننے کی صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پوری اسلامی تاریخ میں تمام علماء اور سلاطین مسلسل اس شرعی حکم کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں۔ حتی کہ خلاف ورزی کرنے والوں کی اس لمبی فہرست میں، نعوذ باللہ، خود رسول اور اصحابِ رسول بھی شامل ہیں۔

قرآن وسنت سے اس نظریہ کی عدم مطابقت اتنی واضح ہے کہ خود ابن تیمیہ کو اس کا پورا احساس ہے۔ چنانچہ اپنی 600 صفحہ کی کتاب (الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول) میں انھوں نے جگہ جگہ اس کا جواب دیا ہے اور یہ توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے مفروضہ شرعی مسئلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں عمل نہیں فرمایا۔ کیونکہ آپ نے ایسا کیا کہ بے شمار گستاخی کرنے والوں کو سزا دیے بغیر چھوڑ دیا۔ مگر ان کی یہ نام نہاد توجیہات ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کا مصداق ہیں۔

مثلاً کتاب میں وہ ایک جگہ مدینہ کے بعض منافقین کا ذکر کرتے ہیں۔ ان منافقین نے مبینہ طور پر رسول کا استہزاء کیا تھا۔ اس کے باوجود انہیں قتل نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ان لوگوں پر استہزاء کی حد اس لیے جاری نہیں کی گئی، کیونکہ اس وقت تک منافقین کے خلاف جہاد فرض نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ آپ کو یہ حکم تھا کہ ان کی ایذا رسانی کو نظر

انداز کریں اور جو شخص آپ کی تنقیص کرے اس کو معاف کردیں:

"إِنَّمَا لَمْ يُقِمِ الْحَدَّ عَلَيْهِمْ لِكَوْنِ جِهَادِ الْمُنَافِقِينَ لَمْ يَكُنْ قَدْ أُمِرَ بِهِ إِذْ ذَاكَ، بَلْ كَانَ مَأْمُورًا بِأَنْ يَدَعَ أَذَاهُمْ، وَلِأَنَّهُ كَانَ لَهُ أَنْ يَعْفُوَ عَمَّنْ تَنَقَّصَهُ وَآذَاهُ" (صفحہ 34)۔

ابن تیمیہ کے اس بیان کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم تھا کہ وہ منافقین کی تنقیص اور ایذارسائی پر اعراض کریں اور ان کو معاف کردیں۔ لیکن ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ یہ وقتی حکم تھا جو بعد کو منسوخ ہو گیا۔ مگر صرف اتنا کہنا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ ابن تیمیہ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ یہ حکم کب منسوخ کیا گیا۔

حدیث اور سیرت سے تو یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت تک ان منافق افراد کا قتل عام نہیں کرایا جو آپ کے خلاف استہزاء اور گستاخی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم پر جو وحی اتری اور آپ نے اپنے عمل سے جو نمونہ پیش فرمایا۔ اس کے مطابق عفو واعراض کا یہ حکم آخر تک باقی رہا۔ وہ کبھی منسوخ نہیں کیا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن وسنت سے اس حکم کی منسوخی ثابت نہیں تو پھر دوسرا کون سا ذریعہ ہے جس سے ابن تیمیہ کو معلوم ہوا کہ یہ حکم اب منسوخ ہو چکا ہے۔ کیا محمد بن عبد اللہ کے بعد کوئی اور پیغمبر آیا ہے جس نے انھیں یہ خبر دی کہ عفو واعراض کا حکم اب منسوخ کردیا گیا ہے۔ اب تم لوگ ایسے تمام افراد کو چن چن کر قتل کر ڈالو۔

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو ابن تیمیہ کو اور ان کے تمام ہم خیال لوگوں کو وہی کہنا چاہیے اور کرنا چاہیے جس کا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ نہ کہ خود ساختہ تاویلات کے ذریعہ اس کو منسوخ قرار دیں اور پھر ایک ایسے عمل کی وکالت کریں جس کا براہ راست ثبوت نہ قرآن میں ہے، نہ رسول کے قول وعمل میں۔ ان کے اس

نظریہ کی بنیاد قیاس پر ہے، اور قیاس اس طرح کے معاملہ میں حجت نہیں۔

چنانچہ ہر زمانہ میں ایسے محقق علماء موجود رہے ہیں۔ جنھوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ سفیان الثوری (97-161ھ) کو "سَيِّدُ أَهْلِ زَمَانِهِ فِي عُلُومِ الدِّينِ وَالتَّقْوَى" (دینی علوم اور تقوی میں اپنے زمانے کے پیشوا) کہا جاتا ہے۔ مرتد کے بارے میں ان کا قول ہے کہ يُسْتَتَابُ أَبَدًا، وَلَا يُقْتَلُ (مصنف عبد الرزاق: 18697، محلّی ابن حزم، جلد 12، صفحہ 109)۔ یعنی اس سے ہمیشہ توبہ کے لیے کہا جائے گا، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی حکم شاتم کا بھی ہے، کیونکہ شاتم کا حکم حدیثِ ارتداد ہی سے اخذ کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اور مستہزئین

واقعات بتاتے ہیں کہ جس طرح دوسرے نبیوں کا استہزاء کیا گیا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی استہزاء کیا گیا۔ اس سلسلہ میں بے شمار واقعات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب آپ کے ساتھ استہزاء اور اہانت کا معاملہ کیا گیا تو اس کے جواب میں آپ نے کیا کیا۔ تاکہ آپ کے بعد جب اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو ہم اس معاملہ میں اسی اسوۂ نبوی کو اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اعتبار سے ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ اور یقیناً اس معاملہ میں بھی ہمیں اسی نمونہ کو اختیار کرنا چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی عمل سے ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس نوعیت کے جو واقعات ہیں، ان کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آپ نے ان واقعات کو مسئلہ کی نظر سے دیکھا، نہ کہ سادہ طور پر محض گستاخی کی نظر سے۔ کسی واقعہ کو مسئلہ کی نظر سے دیکھا جائے تو اس سے حل تلاش کرنے کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کو گستاخی کی نظر سے دیکھیے تو صرف انتقام کا جذبہ ابھرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے اس طرح کے واقعات کو کبھی گستاخی اور توہین کی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی ان کا انتقام لینے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں آپ کی کئی سنتیں ہمیں ملتی ہیں۔ اور یہ بالکل فطری ہے۔ کیونکہ جب مسئلہ کو حل کرنے کی نظر سے دیکھا جائے تو حالات کے اعتبار سے لازماً اس کے طریقے مختلف ہو جائیں گے۔

1۔اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ '' گستاخی'' کے واقعات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی وہ طریقہ اختیار نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے مسلمان مستقل اور مسلسل طور پر اختیار کیے ہوئے ہیں۔یعنی گستاخ آدمی کے خلاف شور وغل اور ایجی ٹیشن کرنا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بار بار گستاخی اور اذیت رسانی کے واقعات پیش آئے ،مگر ایک بار بھی آپ نے ان کے خلاف عمومی احتجاج کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔

اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔گستاخی کی بات کو عوامی ایجی ٹیشن کا موضوع بنانا خود گستاخ شخص کے ساتھ تعاون کرنے کے ہم معنی ہے۔کیونکہ اس طرح اس کی بات مزید پھیلتی ہے،وہ مزید شہرت حاصل کرتی ہے۔اس طرح کے معاملہ میں عوامی ایجی ٹیشن کاالٹا نتیجہ پیدا کرنے والا(counter productive)ہے۔

اس کی ایک مثال سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات(*Satanic Verses*)کا معاملہ ہے۔یہ کتاب بلاشبہ ایک بے ہودہ کتاب ہے۔عام حالات میں اس کو بمشکل چند ہزار آدمی پڑھتے ۔مگر مسلمانوں کے ناقابل فہم حد تک بے معنی ایجی ٹیشن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انگریزی کتابوں کی مارکیٹ میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب(Best Seller)بن گئی۔نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ٹائمس آف انڈیا(17مارچ1989)میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ نیویارک ٹائمز کے جائزے کے مطابق موجودہ ناولوں میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب شیطانی آیت ہے:

"'Satanic Verses' has become the no. 1 book on The New York Times best-seller list of hard cover fiction."

ٹائم میگزین نے اپنے شمارہ 27فروری1989 میں رشدی کی کتاب کے بارے میں

اپنی رپورٹ شائع کی تھی۔ اس کو پڑھ کر ٹائم کے دفتر میں 240 خطوط آئے۔ ان میں سے ایک خط مارگریٹ ڈورٹیز (Margareta du Rietz) کا تھا۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا کہ بہت ہی کم لوگوں نے اس کتاب کی طرف توجہ کی تھی۔ مگر خمینی کا بھلا ہو، اب وہ ایک عالمی شہرت یافتہ کتاب ہے۔

"Very few took note of this novel. Now, thanks to Khomeini, it is world famous."

سلمان رشدی نے اپنے بے ہودہ خیالات صرف اپنی کتاب میں لکھے تھے۔ مگر مسلمانوں کے شوروغل کا نتیجہ یہ ہوا اس کی باتیں تمام دنیا کے اخبارات ورسائل میں چھپیں۔ بے شمار لوگ غیر ضروری طور پر اس کی کتاب کو پڑھنے کے شائق ہو گئے۔ اب امریکا میں 20 زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے تاکہ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ بھی اس "شہرت یافتہ" کتاب کو پڑھ سکیں۔ مسلمانوں کے اس احمقانہ اقدام کا آخری احمقانہ نتیجہ یہ ہے کہ "سلمان رشدی کو قتل کرو" کے نام پر جو ہنگامہ کھڑا کیا گیا، اس میں خود مسلمان درجنوں کی تعداد میں قتل اور سیکڑوں کی تعداد میں زخمی ہو گئے۔ اور خود سلمان رشدی ادبی ہیرو بن کر برطانیہ کی شاہی حفاظت میں بیٹھا ہوا ہے۔

2۔ اہانتِ رسول کے اس طرح کے واقعات پر مسلم رہنماؤں کی طرف سے جو بیانات دیے جاتے ہیں، ان میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس سے کروروں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ یہ سراسر ایک غیر اسلامی جملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مواقع پر کبھی یہ الفاظ استعمال نہیں کیے۔ مزید یہ کہ اسلام کے "کریمنل کوڈ" میں ایسی کوئی دفعہ نہیں ہے جس میں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے کو فوجداری جرم قرار دیا گیا ہو اور اس پر موت کی سزا مقرر کی جائے۔ یہ بلاشبہ شریعتِ اسلامی میں ایک اضافہ ہے

کہ مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے کو ایک قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دیا جائے۔ اس قسم کے بیانات دینا سب سے پہلے دینے والے کو مجرم ثابت کرتا ہے، نہ کہ گستاخی کرنے والے کو۔

3۔ سلمان رشدی کے سلسلہ میں مسلم رہنماؤں کی طرف سے جو بیانات شائع ہوئے ہیں ان میں عام طور پر ''جہنم رسید'' کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ ہر بیان باز لیڈر جوش وخروش کے ساتھ یہ اعلان کر رہا ہے کہ سلمان رشدی کے جرم کے نتیجہ میں اس کو جلد از جلد جہنم رسید کیا جائے۔

مسلم رہنماؤں کے یہ الفاظ سرکشی اور بغاوت کے ہم معنی ہیں۔ کیونکہ جہنم رسید کرنے کا اختیار صرف خدا کو ہے، نہ کہ کسی انسان کو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے کافروں اور مشرکوں اور منافقوں نے آپ کے خلاف بدترین قسم کے جرائم کیے۔ مگر ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ الفاظ بولیں کہ فلاں شخص کو قتل کر کے اس کو جہنم رسید کرو۔ ایسے الفاظ بولنا گویا اپنے آپ کو خدا کی سیٹ پر بیٹھانا ہے۔ رشدی نے اگر پیغمبر کی ذات پر حملہ کیا ہے تو ایسے جملے خود خدا کی ذات پر حملہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ اب ایسے لوگ خود سوچیں کہ دونوں میں سے کون سا جرم زیادہ بڑا ہے۔

4۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اس طرح کے معاملات میں پیغمبر کا طریقہ ''گستاخی'' کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے کا نہ تھا بلکہ مسئلہ کو حل کرنے کا تھا۔ چنانچہ حالات کے اعتبار سے آپ نے اس کے حل کے مختلف انداز اختیار کیے۔

ایک عام حل یہ تھا کہ ان کو سادہ طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا کہ اے پیغمبر! تم منکروں اور منافقوں کی بات نہ مانو۔ اور ان کے ستانے کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے (33:48)۔

التفسیر المظہری میں اس آیت کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ عبداللہ بن عباس نے اور قتادہ نے کہا کہ لوگ تم کو جو تکلیف دے رہے ہیں اس پر صبر کرو۔ مطلب یہ کہ ان کی ایذا رسانی سے صرف نظر کرو۔ اس کی پروانہ کرو، اور نہ اس سے ڈرو (''اجْعَلْ إِيذَاءَهُمْ إِيَّاكَ فِي جَانِبٍ وَلَا تُبَالِ بِهِ وَلَا تَخَفْ مِنْهُ'')۔ زجاج نے کہا کہ ان سے بحث نہ کرو۔ ان کی باتوں کے پیچھے نہ پڑو۔ اور نہ تم خود انہیں تکلیف پہنچانے کی کوشش کرو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو، وہ یقینا تمہارے لیے کافی ہے (التفسیر المظہری، جلد 7، صفحہ 355)۔

یہی پیغمبرانہ سنت ہے جس کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا کہ باطل کو ہلاک کرو اس کے بارے میں چپ رہ کر: ''أَمِيتُوا الْبَاطِلَ بِالصَّمْتِ عَنْهُ'' (دیکھیے، حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء، جلد 1، صفحہ 55)۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر حالات میں باطل کی موت کے لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے خاموشی اختیار کرلی جائے۔ ایسا طریقہ اختیار کرنے کے بعد باطل اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔ پھر جو سانپ لاٹھی کے بغیر مرسکتا ہو، اس کے لیے لاٹھی استعمال کرنے کی کیا ضرورت۔

5۔ ایک طریقہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ مخالفین کی باتوں کا جواب دلیل کی زبان میں دیا جائے۔ قدیم زمانہ میں شعر کو وہ مقام حاصل تھا جو موجودہ زمانہ میں صحافت کو حاصل ہے۔ صحافت موجودہ زمانہ میں کسی بات کو وسیع حلقہ میں پھیلانے کا ذریعہ ہے۔ یہی کام قدیم زمانہ میں اشعار سے لیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے مخالفین اشعار کی صورت میں آپ کی مذمت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ام جمیل نے آپ کے خلاف یہ اشعار کہے:

مُذَمَّمًا عَصَيْنَا ... وَأَمْرَه أَبَيْنَا... وَدِينَهُ قَلَيْنَا

(سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 356)۔

یعنی محمد مذمّت کیے ہوئے ہیں ہم ان کا انکار کرتے ہیں۔ ہم ان کے حکم کو نہیں مانتے۔ اور ہم کو ان کے دین سے بغض ہے۔

مکہ میں آپ نے اس قسم کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، مدینہ آنے کے بعد اس طرح کے مواقع پر مسلمانوں کے شاعر حضرت حسّان بن ثابت شعر کا جواب شعر میں دیتے تھے۔ مثلاً ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں ایک مشرک عورت کا ذکر کیا ہے۔ جس نے اسلام اور اہلِ اسلام پر عیب لگاتے ہوئے کچھ اشعار کہے (فَقَالَتْ، تَعِيبُ الْإِسْلَامَ وَأَهْلَهُ)۔ مذکورہ مشرکہ کے ہجو کے جواب مین حسّان بن ثابت نے اسی بحر میں کچھ اشعار کہے۔ یہ دونوں قسم کے اشعار ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں نقل کیا ہے (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 637)۔

اسی طرح ایک موقع پر ایک جاہلی شاعر نے اسلام کے خلاف کچھ باتیں کہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسّان بن ثابت سے کہا کہ اے حسّان، اٹھو اور اس آدمی نے جو کچھ کہا ہے اس کا جواب دو (قُمْ يَا حَسَّانُ، فَأَجِبْ الرَّجُلَ فِيمَا قَالُ. فَقَامَ حَسَّانٌ)۔ چنانچہ حسان اٹھے اور انھوں نے برجستہ کچھ اشعار وضع کر کے مذکورہ شخص کا جواب دیا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 564)۔

6۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حنین میں) عباس بن مرداس کو چند اونٹ دیے۔ یہ اونٹ اس کو کم معلوم ہوئے۔ چنانچہ وہ غصہ ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرنے لگا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ میری طرف سے اس کی زبان کاٹ دو۔ اس کے بعد لوگوں نے اس کو مزید اونٹ دیے یہاں تک کہ وہ راضی ہو گیا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ تھا زبان کا کاٹنا جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا: فَكَانَ ذَلِكَ قَطْعَ لِسَانِهِ الَّذِي أَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه

وسلم (سیرت ابن ہشام، جلد 4، صفحہ 141)۔

اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اصل مسئلہ ہجو گو کو سزا دینے کا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی زبان بند کرنا ہوتا تھا۔ حالات کے اعتبار سے آپ اس کے لیے کوئی ایک یا دوسری تدبیر اختیار فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر کسی شخص کے متعلق یہ نظر آتا تھا کہ وہ مال پا کر چپ ہو جائے گا تو آپ اس کو مال دے کر اس کی زبان بندی فرماتے تھے۔

7۔ جب مکہ فتح ہوا تو مکہ کے مشرکین آپ کے سامنے لائے گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کا ایذا رسانی کا فعل کیا تھا۔ لفظی استہزاء سے لے کر عملی جارحیت تک کوئی بھی ایسی برائی نہ تھی جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ کی ہو۔ عام رواج کے مطابق ان سب کو قتل کر دینا چاہیے تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا بلکہ سب کو ایک طرف سے معاف کر دیا۔ اور فرمایا کہ جاؤ تم سب آزاد ہو: **اذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ** (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 18276)۔

راوی کہتے ہیں کہ مشرکین آپ کے پاس سے نکلے، گویا کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں۔ اس کے بعد وہ اسلام میں داخل ہو گئے: **فَخَرَجُوا كَأَنَّمَا نُشِرُوا مِنَ الْقُبُورِ فَدَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ** (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 18275)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت بتاتی ہے کہ اذیت پہنچانے والوں کے بارے میں کرنے کا ایک کام یہ ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ پوری طرح اپنے قابو میں آ چکے ہوں، اور ان کا جرم اتنا واضح ہو کہ خود عالمی رواج کے مطابق اس بات کا پورا حق حاصل ہو کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معافی کے بعد ان دشمنوں کا اسلام قبول کر لینا بتاتا ہے کہ

وہ کون سی خاص حکمت تھی جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ایسا فیّاضانہ سلوک کیا۔ وہ حکمت یہ تھی کہ بہترین موقع تھا جب کہ انہیں چھوڑ کر ان کو دوبارہ مسخر کر لیا جائے۔ جو لوگ ماضی میں اسلام کے دشمن تھے، ان کو مستقبل میں اسلام کا دوست اور حامی بنا لیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان مجرموں کو معاف کر دیا تو گویا کہ آپ نے ان پر سب سے زیادہ سخت حملہ کیا۔ آپ نے ان کی سابقہ سرکشی اور عناد کو نفسیاتی طور پر قتل کر ڈالا۔ اس غیر معلومی سلوک نے ان کے مصنوعی انسان کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ان کی ہستی میں جو چیز بچی وہ صرف فطری انسان تھا۔ اس فطری انسان نے عین اپنے اندرونی تقاضے کے تحت اسلام قبول کر لیا۔

زیادہ بڑا مجرم

سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کی موجودہ تحریکِ ناموس رسول کی حفاظت کے نام پر چل رہی ہے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھیے تو اس تحریک نے صرف رسول کی ناموس کو پامال کرنے کا کام انجام دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی امتیازی حیثیت، قرآن کے مطابق آپ کا پیغمبر رحمت ہونا ہے۔ مگر اس نام نہاد تحریک نے آپ کا تعارف دنیا کے سامنے، نعوذ باللہ، پیغمبر فساد کے روپ میں پیش کیا ہے۔ غالباً یہی وہ صورت حال ہے جس کی بابت شاعر اسلام نے کہا تھا:

امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

سلمان رشدی کے خلاف ایجی ٹیشن میں مسلمانوں نے جگہ جگہ تشدد کے مظاہرے کیے ہیں۔ انھوں نے دوسروں کے جان و مال کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس قسم کا فعل نہ صرف کرنے والے کے لیے ناجائز ہے بلکہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ازالۂ حیثیت

عرفی کا درجہ رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر لندن کی خبروں میں بتایا گیا ہے کہ 2 جولائی 1989 کی صبح کو لندن کی ایک بہت بڑی کتابوں کی دکان میں بم پھینکا گیا جس کے نتیجہ میں اس کی عمارت کا ایک حصہ برباد ہو گیا۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ بم اینٹی رشدی احتجاجیوں نے پھینکا تھا:

"Early this morning, one of the largest book stores in central London- Collet's- was partially destroyed by firebomb suspected to have been thrown by anti-Rushdie protesters." (p.14).

یہ ٹائمس آف انڈیا (7 جولائی 1989) کی خبر ہے۔ قومی آواز (7 جولائی 1989) کی خبر میں یہ اضافہ ہے کہ لندن کی اس دکان سے کرسمس کے بعد سے "شیطانی آیات" کی کوئی ایک بھی جلد فروخت نہیں کی گئی (صفحہ 2)۔

اس قسم کے واقعات جدید انسان کے لیے وحشت اور بربریت کے ہم معنی ہیں۔ مسلمان اگر ان باتوں کو اپنی قومی سرکشی کے نام پر کرتے تو وہ ان کے قومی خانہ میں لکھا جاتا۔ مگر وہ ان کو پیغمبر اسلام کے نام پر کر رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے خانہ میں لکھا جائے۔ لوگ یہ سمجھیں کہ پیغمبر اسلام نے اپنے پیروؤں کو جو تعلیم دی ہے وہ یہی ہے۔ رشدی نے "شیطانی آیات" لکھ کر خود اپنے آپ کو بدنام کیا تھا، مگر مسلمان اپنی ان حرکتوں سے خود پیغمبر اسلام کو بدنام کر رہے ہیں، اب ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ بڑا مجرم ہے۔

چوتھا باب

مصلحت دعوت

عبداللہ بن ابی مدینہ کا ایک منافق مسلمان تھا۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت عناد تھا۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت بے ہودہ قسم کی گستاخیاں کیں۔ آپ کی ازواج مطہرات کے خلاف گھناؤنے الزامات لگائے۔ حتیٰ کہ اس کا مجرم اکبر ہونا خود قرآن (النور، 24:11) میں ثبت کر دیا گیا۔

عبداللہ بن ابی کے اس مجرمانہ فعل کو دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، اگر ایسا کروں تو لوگ چرچا کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور آپ کی ازواج مطہرات کی کردار کشی نہایت سنگین بات ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ سنّت بتاتی ہے کہ ایک اور بات ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور وہ ہے — لوگوں کو اسلام کی تصویر بگاڑنے کا موقع نہ دینا۔

ایک گستاخ رسول کو سزا دینے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کو بہانہ بنا کر اسلام کی دعوتی تصویر کو بگاڑنے کی کوشش کریں گے، تو ایسی حالت میں اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت کو ترجیح دی جائے گی اور گستاخ رسول کی سزا کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوت اور دعوت کا مفاد ہے۔ بقیہ چیزوں کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

اسلام کے اس تقاضے کی روشنی میں موجودہ مسلمانوں کے اس شدید ردِّ عمل پر غور کیجیے جو

انہوں نے سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف ساری دنیا میں ظاہر کیا ہے۔ اس معاملہ میں یقینی تھا اور ہے کہ سلمان رشدی کو اگر قتل کر دیا جائے، یا اس کے خلاف قتل کا "فتویٰ" جاری کیا جائے تو عالمی پریس اور غیر مسلم صحافت اس کو بہت بڑے پیمانے پر اسلام کی تصویر بگاڑنے کے لیے استعمال کرے گا۔

عبداللہ بن ابی کے قتل پر قدیم زمانہ میں اسلام کو بدنام کرنے کا جو عمل کیا جاتا اس کا اثر مدینہ یا زیادہ سے زیادہ عرب تک محدود رہتا، مگر سلمان رشدی کے معاملہ میں اس کا زبردست اندیشہ تھا کہ اس کے خلاف قتل کے فتویٰ کو لے کر سارے کرۂ ارض پر اسلام کو بدنام کرنے کی مہم جاری کر دی جائے گی، جیسا کہ فی الواقع ہوئی۔

سلمان رشدی کے معاملہ میں غور کرنے کا سب سے زیادہ قابلِ لحاظ پہلو یہی ہے مگر یہی وہ پہلو ہے جس کو موجودہ مسلم رہنماؤں نے اور ان کی پیروی میں عام مسلمانوں نے سب سے زیادہ نظرانداز کیا ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں نے بلاشبہ اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی۔ رسول کے نام پر رسول کے طریقہ کی خلاف ورزی کی اس سے زیادہ سنگین مثال شاید پوری اسلامی تاریخ میں نہیں ملے گی۔

نیویارک کے ٹائم میگزین (20 مارچ 1989ء) میں اُٹاوہ کے عبدالحسین ماجد کفائی کا خط چھپا ہے۔ وہ سلمان رشدی کی کتاب کو قابلِ مذمت کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زیادہ بہتر تھا کہ رشدی کو زندہ رہنے دیا جائے اور تمام لوگ اس پر لعنت کریں، بمقابلہ اس کے کہ رشدی کو قتل کر دیا جائے اور تمام لوگ مسلمانوں پر لعنت کریں:

> "It is better to let Rushdie live and be condemned by fanatical Muslims rather than have him killed and, as a result, the entire Muslim world be cursed."

راقم الحروف عبدالحسین ماجد کفائی کے اس تبصرے سے متفق ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت میں مقامِ محمود پر فائز کیے جا چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ کسی "رشدی" کی تحریریں اس کو ادنی درجہ میں بھی داغدار کر سکیں۔

مگر رشدی کے خلاف مسلمانوں نے قتل کا فتویٰ دے کر جو ہنگامہ برپا کیا۔ اس نے اسلام معاندین کو اس بات کا سنہری موقع دے دیا کہ وہ اس کو لے کر اسلام کو بدنام کریں۔ وہ تمام دنیا کو یہ تاثر دیں کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے، وہ قتل و خون کا دین ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کر کے مسلمانوں نے پایا کچھ نہیں، البتہ انھوں نے ایک بڑی چیز کھو دی اور جو چیز انھوں نے کھوئی وہ وہی چیز ہے جو اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ حیثیت رکھتی ہے اور وہ ہے دعوت اسلامی کے مواقع۔

قدیم عرب میں جو "میڈیا" اہل کفر کے پاس تھا' وہی میڈیا اہلِ اسلام کے پاس بھی تھا۔ اس معاملہ میں دونوں برابر تھے۔ موجودہ زمانہ میں صورت حال بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ آج عالمی صحافت کا زمانہ ہے۔ مگر صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک بھی ایسا اخبار یا ایسا میگزین نہیں جو عالمی سطح پر پھیلے اور تمام قوموں کے درمیان پڑھا جائے۔ دوسری طرف غیر مسلم اقوام کا حال یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر عالمی صحافت پر قابض ہیں۔ ان کے پاس ایسے اخبار و رسائل ہیں جو کروروں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور ساری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔

اس فرق نے بے حد نازک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ وہ یہ مسلمانوں کی بات صرف ان کے مقامی یا گروہی پرچوں میں چھپتی ہے، وہ اس کو خود ہی چھاپتے ہیں اور خود ہی پڑھتے ہیں۔ جبکہ فریق ثانی کا یہ حال ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف باتوں کو اپنے عالمی پرچوں میں چھاپتا ہے اور دن رات کے اندر ساری دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔

ایسی صورت حال میں مسلمانوں کو نازک معاملات میں ہنگامہ آرائی کرنے سے انتہائی حد تک پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ موجودہ حالت میں ان کی ہنگامہ آرائی کا کوئی مثبت فائدہ تو ان کو نہیں پہنچے گا، البتہ یہ منفی نقصان ہوگا کہ غیر مسلم عالمی صحافت اس کوشوشہ بنا کر ساری دنیا میں انہیں بدنام کرے گی۔ وہ بے بسی کے ساتھ اپنی اور اسلام کی بدنامی کو دیکھیں گے اور اس کے دفعیہ کے لیے کچھ نہ کرسکیں گے۔

حالات سے بلند ہو کر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مکی دور میں پیغمبر اسلام کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا تھا، جو سلوک دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کیا گیا، یعنی استہزا (الحجر 15:11)۔ مگر پیغمبرِ اسلام کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہمیشہ منفی واقعات کا جواب مثبت انداز میں دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک روایت حدیث کی کتابوں میں اس طرح آئی ہے، پیغمبر اسلام نے کہا: **أَلَا تَعْجَبُونَ كَيْفَ يَصْرِفُ اللَّهُ عَنِّي شَتْمَ قُرَيْشٍ وَلَعْنَهُمْ يَشْتِمُونَ مُذَمَّمًا وَيَلْعَنُونَ مُذَمَّمًا وَأَنَا مُحَمَّدٌ** (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3533)۔ یعنی کیا تم کو یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ مجھ سے قریش کے سب وشتم اورلعنت کو کس طرح دور کررہا ہے۔ مجھے وہ مذمم کہہ کرشتم کرتے ہیں، مذمم کہہ کروہ مجھ پرلعنت بھیجتے ہیں۔ حالانکہ میں تومحمد ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے لوگ اپنی بڑھی ہوئی مخالفت کی بنا پر اس کو پسند نہیں کرتے کہ وہ میرا اصل نام بولیں، اور میرے خلاف جو کہنا چاہتے ہیں، وہ میرا نام لے کرکہیں۔ انھوں نے مخالفت کے جوش میں بطور خود میرا نام محمد کے بجائے مذمم رکھ دیا، اور وہ مذمم کا نام بول کر میرا سب وشتم کرتے ہیں۔ یعنی وہ سب وشتم تو کرتے ہیں، لیکن جس شخص کی وہ سب وشتم کرتے ہیں، اس کا نام انھوں نے بطور خود مذمم رکھ دیا ہے۔ اس طرح ان کے اپنے کہنے کے مطابق ان کی بات کسی ایسے شخص پر پڑتی ہے جس کا نام مذمم ہو، وہ شخص جس کا نام محمد ہے اس پر ان کی بات پڑتی ہی نہیں۔

یہ اعلیٰ سوچ کی ایک انوکھی مثال ہے۔ پیغمبر اسلام چوں کہ مکمل طور پر مثبت سوچ پر قائم تھے اس لیے انھوں نے ایک لطیف اسلوب میں قریش کے سب وشتم کو بے حقیقت کردیا۔ انھوں نے کہا کہ جب وہ میرا اصل نام لے کر مجھے کچھ نہیں کہتے تو وہ خود ہی اپنے

سبّ وشتم کو کسی اور کے اوپر ڈال رہے ہیں۔ یعنی کسی مفروضہ مذمم پر، نہ کہ اس شخص پر جس کا نام اس کے ماں باپ نے محمد رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسوۂ محمدی میں سب وشتم پر مشتعل ہونا نہیں ہے، اور نہ شاتم کو قتل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ بلکہ اس سے لطیف پیرائے میں اعراض کرنا ہے۔ یہ بلند اخلاق کا معاملہ ہے، نہ کہ قانونی سزا کا معاملہ۔

یہی معاملہ شاتم رسول کی سزا کا ہے۔ مسلم فقہاء نے عام طور پر اتفاق کرلیا ہے کہ شتم رسول ایک قابل دست اندازی جرم (cognizable offence) ہے۔ ایسے شخص کو بطور حد قتل کیا جائے گا: ”قَالَ ابْنُ الْمُنْذِرِ: أَجْمَعَ عَوَامُّ أَهْلِ الْعِلْمِ عَلَى أَنَّ حَدَّ مَنْ سَبَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَتْلُ“ (الصارم المسلول علی شاتم الرسول، ابن تیمیہ، صفحہ 3)۔ یعنی اکثر اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کیا، اس کی حد قتل ہے۔ اس مسئلہ میں اگرچہ بڑے بڑے علماء کے نام ہیں، لیکن یہ مسئلہ بلاشبہ ایک اجتہادی خطا کا مسئلہ ہے۔ اب علماء اسلام پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ اعلان کریں کہ شاتم رسول کے قتل کا مسئلہ شرعی مسئلہ نہ تھا، وہ اجتہادی خطا کا مسئلہ تھا۔ اب ہم اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کرتے ہیں۔ جس انسان کو شاتم رسول قرار دیا جاتا ہے، وہ زیادہ درست طور پر مدعو ہوتا ہے، اور مدعو کے لیے نصیحت اور دعوت ہے، نہ کہ قتل۔

پیغمبر کا نمونہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام اور دوسرے پیغمبروں کا استقبال ان کی قوموں نے بہت برے انداز میں کیا۔ انھوں نے ان کا مذاق اُڑایا۔ ان کی تحقیر وتذلیل کی۔ ان کے اوپر جھوٹے الزامات لگائے، وغیرہ۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا کہ اس قسم کے مجرمین کو گردن زدنی قرار دے کر فوراً انھیں قتل کردیا جائے۔ بلکہ دلیل کے ذریعہ ان کی بات کی کاٹ کی گئی۔ مثال کے طور پر اس سلسلہ میں ایک آیت یہ ہے۔

وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ. وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ (68:51-52)۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ضرور دیوانہ ہے۔ حالانکہ وہ صرف نصیحت ہے سارے عالم والوں کے لیے۔

ان آیات پر غور کیجیے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ لوگ خدا کے پیغمبر کو مجنون کہتے ہیں، اس لیے انھیں فوراً قتل کردو۔ بلکہ دلیل کی زبان میں ان کی بات کو رد کیا گیا۔ اس آیت کا مطلب دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ اے پیغمبر کو مجنون کہنے والو، پیغمبر کے کلام کو دیکھو۔ کیا مجنون کا کلام ایسا ہوتا ہے۔ جس قرآن کو وہ تمہارے سامنے پیش کررہا ہے، وہ سراپا نصیحت ہے۔ اس میں ساری انسانیت کے لیے بہترین پیغام ہے۔

کیا کوئی جنون والا آدمی کتاب لا سکتا ہے جس میں اتنی اعلیٰ تعلیمات درج ہوں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ نے ہجو اور استہزاء کے مواقع پر یا تو صبر کیا، یا دلیل کی زبان میں ان کا رد کیا۔

آپ قاتلِ عالم نہیں تھے بلکہ رحمتِ عالم تھے (الانبیاء، 21:107)۔ اور رحمتِ عالم وہی شخص ہوسکتا ہے جو لوگوں کی ایذا رسانی کے باوجود انھیں معاف کرے، جو لوگوں کی

طرف اشتعال انگیز سلوک کے باوجود ان کے لیے رحمت کا پیکر بنا رہے۔ آپ کی یہی بلند کرداری ہے جس کی شہادت قرآن میں ان لفظوں میں دی گئی ہے: وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ (68:4)۔ یعنی، بے شک تم بلند اخلاق پر ہو۔

دعوتی تصویر

اسلام ایک دعوت ہے، نہ کہ محض ایک تعزیزی قانون۔ اسلام کی اولین دلچسپی خدا کے بندوں کو خدا کا پرستار بنانا ہے، نہ کہ انھیں مجرم قرار دے کر انھیں کوڑا مارنا اور گولی اور پھانسی کا نشانہ بنانا۔

تعزیزی قانون کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ لوگ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ مگر دعوت کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہے۔ داعی لوگوں کو ختم کرنے کے بجائے لوگوں کو اپنے اندر ضم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے داعی ایسا نہیں کرتا کہ لوگوں کے خلاف اندھا دھند سزائیں جاری کرنا شروع کر دے۔ وہ یک طرفہ طور پر صبر واعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسان کے "حال" سے زیادہ انسان کے "مستقبل" پر نظر رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو معاف کرتا ہے تاکہ لوگوں کے اندر اس کے بارے میں نرم گوشہ پیدا ہو، وہ لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا انداز اختیار کرتا ہے تاکہ جو لوگ آج اس کے ہجو گو ہیں، کل اس کے مدح خواں بن جائیں۔ جو لوگ ابھی اس کے ساتھی نہیں بنے، آئندہ وہ اس کے شریک اور ساتھی بن جائیں۔ داعی کا کام غیر کو اپنا بنانا ہے، نہ کہ جو غیر دکھائی دے اس کا دشمن بن کر صرف اس کی ہلاکت کے درپے ہو جانا۔

بدنامی سے بچت

کسی کارخانہ کی خوش نامی اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام کی اشاعت کے لیے اس کی دعوتی تصویر بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام میں یہ بات آخری حد

تک مطلوب ہے کہ اسلام کی دعوتی تصویر کو بگڑنے سے بچایا جائے۔ اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت ہر دوسری چیز پر مقدم ہے، حتیٰ کہ توہین رسالت اور اہانت اسلام جیسے جذباتی مواقع پر بھی۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے یہاں عبداللہ بن ابی بن سلول کی مثال درج کی جاتی ہے۔ یہ شخص مدینہ کے قبیلۂ خزرج کا سردار تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر مدینہ کے لوگوں نے اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہا۔ اس کے لیے تاج کی تیاری بھی شروع ہوگئی — عین اسی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے۔ یہاں آتے ہی لوگوں نے آپ کو اپنا بڑا بنالیا۔ عبداللہ بن ابی کو اس سے بہت تکلیف پہنچی۔ حالات کے دباؤ کے تحت اس نے رسول اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔ تاہم اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض پیدا ہوگیا۔ وہ اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے ساری عمر آپ کی توہین وتحقیر کرتا رہا۔

(1)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لیے نکلے۔ آپ ایک گدھے پر سوار تھے۔ راستہ میں عبداللہ بن ابی کا قلعہ نما مکان آیا جس کا نام مزاحِم تھا۔ اس وقت عبداللہ بن ابی کے گرد اس کے قبیلہ کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ وہاں سواری سے اتر پڑے اور عبداللہ بن ابی کے پاس پہنچ کر اس کو سلام کیا۔ آپ تھوڑی دیر وہاں بیٹھے اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔

راوی (اسامہ بن زید بن حارثہ) کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی بے پروائی کے ساتھ چپ چاپ سنتا رہا۔ جب آپ فارغ ہوچکے تو عبداللہ بن ابی نے کہا: اے شخص، آپ کی یہ بات اچھی تو ہے، لیکن اگر وہ حق ہے تو آپ اپنے گھر میں بیٹھیں اور جو شخص اس کو سننے کے لیے آپ کے

پاس آئے اس کو سنائیں، اور جو شخص آپ کے پاس نہ آئے تو اس کو آپ اس کی تکلیف نہ دیں۔ اور ایسے شخص کی مجلس میں اس کا ذکر نہ کریں جو اس کو ناپسند کرتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ بن ابی کا یہ قول سخت ناگوار ہوا مگر آپ خاموشی سے آگے بڑھ گئے (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 219)۔

(2)

غزوۂ احد (شوال 3ھ) میں قریش کا لشکر مکہ سے چل کر مدینہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ فرمایا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ شہر کے اندر ٹھہر کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی نے یہی دوسری رائے پیش کی۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے گروہ کی رائے کا لحاظ فرمایا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

جب آپ مدینہ اور احد کے درمیان پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر اسلامی فوج سے الگ ہو گیا۔ اس طرح اس نے بے حد نازک موقع پر سخت بے وفائی کا ثبوت دیا۔ مزید یہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی بھی کی۔ اس نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا کہ اس شخص نے دوسروں کی بات مانی اور میری بات نہیں مانی۔ لوگو، میں نہیں سمجھتا کہ ہم یہاں کس لیے اپنے آپ کو ہلاک کریں: **أَطَاعَهُمْ فَخَرَجَ وَعَصَانِي، وَاللّٰهِ مَا نَدْرِي عَلَامَ نَقْتُلُ أَنْفُسَنَا هَاهُنَا أَيُّهَا النَّاسُ** (تفسیر الطبری، جلد 6، صفحہ 222)۔

(3)

غزوۂ بنی المصطلق شعبان 6ھ میں ہوا۔ اس مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عبداللہ بن ابی بھی تھا۔ سفر سے واپسی میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قافلہ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ صبح کو اندھیرے میں روانگی ہوئی۔ اس وقت ایک اتفاقی غلطی

سے حضرت عائشہ، جو آپ کے ساتھ شریک سفر تھیں۔ قافلہ میں پیچھے رہ گئیں۔ سورج نکلنے کے بعد ایک صحابی صفوان بن معطّل سُلَمی اس جگہ سے گزرے۔ انھوں نے حضرت عائشہ کو اپنے اونٹ پر بٹھالیا اور خود اس کی نکیل پکڑ کر آگے چلتے ہوئے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا۔ اس واقعہ کو عبداللہ بن ابی نے خوب استعمال کیا۔ حضرت عائشہ کا اس طرح تنہا ایک نوجوان کے ساتھ آنا ایک ہنگامی سبب سے تھا۔ مگر عبداللہ بن ابی نے اسے برے معنی پہنا کر خوب تقریریں کیں۔ اس نے اس واقعہ کو پیغمبر کی کردار کشی کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ یہاں تک کہ پورے مدینہ میں آپ کے خلاف شک وشبہ کی فضا ہوگئی۔

اس واقعہ کی تفصیلات سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ جس شخص نے اس بہتان تراشی میں سب سے بڑا حصہ ادا کیا اس کے لیے عذابِ عظیم ہے (24:11)۔ اس آیت میں جس شخص کے لیے سب سے بڑا عذاب کا ذکر ہے، اس سے مراد عبداللہ بن ابی ہے۔ مگر اس کو دنیا میں کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اس کے معاملہ کو تمام تر آخرت کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت سے مرا۔

(4)

غزوۂ بنی المصطلق (5ھ) سے واپسی میں ایسا ہوا کہ پانی کے ایک چشمہ پر پانی لینے کے لیے مسلمانوں کا ہجوم ہو گیا۔ اس وقت ایک مہاجر اور ایک انصار آپس میں لڑ گئے۔ مہاجر نے کہا: یاللمہاجرین، انصاری نے کہا: یالَلانصار۔ یہاں تک کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مداخلت فرما کر اس کو ختم کیا۔

عبداللہ بن ابی پہلے سے اس بات پر خوش نہ تھا کہ مکہ کے مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ بلا کر انہیں یہاں پناہ دی جائے۔ اس واقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

اس نے اپنے قبیلہ والوں کے سامنے اشتعال انگیز تقریر کی۔ اس میں اس نے کہا کہ اپنے کتّے کو پال کر موٹا کرو کہ وہ تمہیں کو کاٹ کھائے۔ خدا کی قسم، اگر ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو عزت والا ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔(سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 291)

عبداللہ بن ابی کی یہ باتیں سن کر صحابہ کو غصہ آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں: **دَعْهُ، لاَ يَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ** (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4905)۔

مزید مثالیں

اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً لیث بن سعد نے یحییٰ بن سعید سے، انھوں نے ابو الزبیر سے روایت کی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے کہا کہ جعرانہ میں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس وقت آپ لوگوں کو عطیات دے رہے تھے۔ آدمی نے دیکھ کر کہا کہ اے محمد، انصاف کیجیے۔ آپ نے فرمایا، تمہارا برا ہو، اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون انصاف کرے گا: **يَا مُحَمَّدُ، اعْدِلْ قَالَ:وَيْلَكَ وَمَنْ يَعْدِلُ إِذَا لَمْ أَكُنْ أَعْدِلُ**۔

حضرت عمر نے یہ گفتگو سن کر کہا کہ اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کو قتل کردوں، آپ نے فرمایا: اللہ کی پناہ کہ لوگ یہ کہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں: **فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ :دَعْنِي، يَا رَسُولَ اللَّهِ فَأَقْتُلَ هَذَا الْمُنَافِقَ، فَقَالَ:مَعَاذَ اللَّهِ، أَنْ يَتَحَدَّثَ النَّاسُ أَنِّي أَقْتُلُ أَصْحَابِي** (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1063)۔

غزوۂ تبوک کی واپسی میں کچھ منافق قسم کے مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ مخلص مسلمانوں سے الگ ہو کر بیٹھتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بے ہودہ باتیں کیا کرتے۔ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کہ جانتے ہو یہ کون لوگ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے بتایا کہ یہ لوگ بیٹھ کر آپس میں ہمارے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ حضرت حذیفہ نے کہا اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آپ اجازت دیں گے کہ ہم انہیں قتل کریں۔ آپ نے فرمایا مجھے ناپسند ہے کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں: **أَكْرَهُ أَنْ يَتَحَدَّثَ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ** (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 8100)۔

زیادہ قابلِ لحاظ

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی اور آپ کے خلاف سب وشتم والے افعال کیے۔ حتیٰ کہ صحابۂ کرام کو وہ قابل قتل نظر آنے لگے۔ انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر اجازت دیں تو وہ انہیں قتل کر دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل کی اجازت نہ دی۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اگر میں ان کو قتل کر دوں تو لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس کو اسلام کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز ہے جو ”قتل شاتم“ سے بھی زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ اور وہ اسلام کی دین رحمت کی تصویر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں دعوتی تصویر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسلام کی دعوتی تصویر بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک شخص کے کھلے ہوئے سب وشتم اور اس کی شدید ایذارسانی کے باوجود اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو نظرانداز کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔

اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی مصلحت اسلام میں سپریم حیثیت کا درجہ رکھتی ہے۔ دعوتی مصلحت کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دیا جائے گا، خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی سنگین نظر آتی ہو۔ مسلمانوں کے دلوں کے مجروح ہونا خدا اور رسول کی نظر میں اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ دعوتی مصلحت کا مجروح ہونا۔ اگر کسی معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں تو انہیں اپنے جذبات کو دبانا چاہیے، نہ کہ وہ جذبات کا بے جا اظہار کریں اور دعوت کے قیمتی مصالح کو برباد کر کے رکھ دیں۔

اغیار کو موقع نہ دینا

مذکورہ واقعات میں جن افراد کا ذکر ہے، ان کی توہین رسول اور اسلام دشمنی بالکل واضح تھی۔ اپنے کردار کے اعتبار سے بلا شبہ وہ لوگ اس کے مستحق بن چکے تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ اسی بنا پر صحابۂ کرام نے ان کو اعداء اللہ قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اجازت دیجیے کہ ہم خدا اور رسول کے ان دشمنوں کو قتل کر کے ان کا خاتمہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان اشخاص کو قتل کرتے تو اس کی وجہ یقیناً ان کی اسلام دشمنی ہوتی۔ مگر امتحان کی اس دنیا میں جہاں ہر ایک کو آزادی ہے، آپ کسی کو اس پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ وہی الفاظ بولے جو آپ چاہتے ہیں کہ بولا جائے۔ چنانچہ یہ یقینی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر صرف ان کے شتم کو دیکھا اور شتم کی سزا کے بعد پیدا ہونے والے نتائج کو نہیں دیکھا اور ان افراد کو قتل کرا دیا تو اس کے بعد ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ اصل واقعہ کے مطابق صرف یہ کہیں کہ "محمد نے اسلام دشمنوں کو قتل کیا ہے"۔ اس کے برعکس یقینی تھا کہ وہ کہیں گے کہ "محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں" ان برے لوگوں کا قتل بجائے خود ایک صحیح فعل تھا۔ مگر حالات کے اعتبار سے یقینی تھا کہ صحیح ہونے کے باوجود وہ عوام کے درمیان اسلامی بدنامی کا سبب بن جائے گا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر

عمل نہیں فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ نہ تھا کہ پہلے قتل کر دیں۔ اور پھر جب لوگ بدنام کریں تو اس کے بعد یہ شکایت کریں کہ لوگ ہم کو غلط طور پر بدنام کرتے ہیں۔ اس کے بجائے آپ کا طریقہ یہ تھا کہ ایسا فعل ہی نہ کیا جائے جس کی وجہ سے لوگوں کو غلط طور پر بدنام کرنے کا موقع ملے۔ اس معاملہ میں یہی حکمتِ نبوی ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال آج ہمارے سامنے ہے۔ سلمان رشدی نے بلاشبہ توہینِ رسالت اور اسلامی دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے وہ سخت سزا کا مستحق ہے۔ لیکن مسلمان اگر اس کے خلاف قاتلانہ کارروائی کریں تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ یہ کہیں کہ مسلمانوں نے ایک اسلام دشمن کو قتل کر دیا۔ بلکہ لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ مسلمان آزادیِ فکر کے قاتل ہیں۔ اسلام کا اصل انحصار تلوار کی طاقت پر ہے، نہ کہ دلیل کی طاقت پر۔

ہمیں حقیقت کو جاننا چاہیے کہ موجودہ زمانہ آزادیِ فکر کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادیِ فکر کو سب سے بڑی قدر کا درجہ دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادی خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کا انسان کسی ایسے مذہب یا نظام کو غیر مہذب اور وحشیانہ سمجھتا ہے جو آزادیِ فکر کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ ایسی حالت میں، باعتبار نتیجہ، سب سے بڑی اسلام دشمنی یہ ہوگی کہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جو دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ اسلام آزادیِ فکر کا قاتل ہے، اور اس لیے وہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔ اس معاملہ میں سنّتِ رسول کا تقاضہ یہ ہے کہ اسلام کو اس ''بدنامی'' سے بچایا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی ہو، خواہ اس کے لیے کتنی ہی بری چیز کو برداشت کرنا پڑے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام دشمنوں کو قتل نہیں کیا تاکہ لوگوں کے درمیان اسلام کی دعوت کا دروازہ کھلے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اسلام دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے

سرگرم ہیں تاکہ لوگوں کے درمیان اسلام کی دعوت کا دروازہ بند ہو جائے، اس قسم کی سرگرمی بلاشبہ سرکشی ہے، اس کا خدا اور رسول کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔

دو اقتباس

سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے مجنونانہ ایجی ٹیشن کا فائدہ تو کچھ نہ ہوا۔ البتہ اس کا یہ زبردست نقصان ہوا کہ اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو کر رہ گیا۔ اس کی بے شمار مثالیں 1989 کے نصف اوّل میں سامنے آئی ہیں۔ یہاں مسئلہ کی وضاحت کے لیے ان میں سے دو مثال نقل کی جاتی ہیں۔

”لندن کے مضافات میں مقیم ایک برطانوی نژاد نومسلم انگریز نے، جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے، لکھنؤ میں مقیم اپنے ایک دوست کو لکھا ہے کہ مجھے اپنے خاندان، رشتہ داروں، اپنے دوستوں اور اپنی پوری قوم کا رویہ بدلا ہوا نظر آرہا ہے۔ چاروں طرف سے لوگ حملے کر رہے ہیں۔ جملے کس رہے ہیں، اور خمینی کا نام لے کر چڑھا رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انگریز قوم کے اندر دیکھتے ہی دیکھتے اسلام سے اتنی نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اس واقعہ سے پہلے جو چند ماہ میں نے اسلام لانے کے بعد یہاں گزارے تھے، ان کے دوران مجھے ایسی تلخی کا کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔“

ماخوذ از ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، اپریل 1989، صفحہ 5-4

2۔ ٹائم میگزین (17 اپریل 1989) کے دو صفحہ پر یورپ میں اسلام کے بارے میں ایک باتصویر رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کا ایک پیراگراف یہ ہے:

"The incendiary furore over Salman Rushdie and his novel, The Satanic Verses, reinforced the longstanding Western stereotype of Islam as a religion of intolerance and violence. The clash in Europe was

especially acute. Almost overnight, efforts to dispel old perceptions were shattered," says a French historian and Islamic scholar, Bruno Etienne. "Rather than the televised images of thousands of screaming Muslims, I would have preferred to witness the hundreds of thousands of Muslims who reflect and pray privately for an Islam that is integrated."

سلمان رشدی اور اس کے ناول ”شیطانی آیات“ پر مسلمانوں کا اشتعال انگیز شور وغل مغرب کے اس قدیم نظریہ کی تصدیق کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اسلام غیر رواداری اور تشدّد پسندی کا مذہب ہے۔ یورپ میں ٹکراؤ خاص طور پر بہت سخت تھا۔ تقریباً راتوں رات ایسا ہوا کہ قدیم تصوّرات کو مٹانے کی کوششیں ملیا میٹ ہو کر رہ گئیں۔ ایک فرانسیسی مؤرخ برونو اٹینی جو اسلام کا عالم ہے، اس نے کہا کہ ہزاروں لوگ جو ہم کو ٹی وی کے اوپر چیختے چلّاتے ہوئے دکھائے گئے، اس کے مقابلہ میں مجھ کو یہ زیادہ پسند تھا کہ ہم ایسے ہزاروں مسلمان دیکھتے جو اپنی تنہائیوں میں اسلام کے استحکام کے لیے دعائیں کر رہے ہوتے (صفحہ 40)۔

ان دو حوالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے رشدی کے خلاف جو بے معنی شور وغل کیا، وہ کس طرح کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچا، البتہ وہ اسلام کی بدنامی کا سبب ضرور بن گیا۔

دورِ اوّل کی مثال

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام خیال یہ ہو گیا ہے کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی یا اس کا استہزاء ایک ایسا جرم ہے جو علی الاطلاق طور پر مجرم کو واجب القتل بنا دیتا ہے۔ یعنی جیسے ہی کوئی شخص ایسے الفاظ بولے جو مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی نظر آئے، اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کا مطلق نظریہ شرعی اعتبار سے بے بنیاد ہے، اسلام میں اس کے لیے کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے ساتھ استہزاء کا معاملہ کوئی اتفاق نہیں۔ یہ مجرمانہ فعل بلا استثنا خدا کے تمام پیغمبروں کے ساتھ ہمیشہ جاری رہا ہے (11:15؛ 7:43)۔ قرآن میں تقریباً 50 مقامات پر بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کے معاصرین نے پیغمبروں کا استہزاء اور تمسخر کیا۔ انھوں نے ان کی شان میں گستاخیاں کیں۔ مگر ایک جگہ بھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جہاں بھی کوئی شخص پیغمبر کا مذاق اڑائے، فوراً اس کو قتل کر دو۔ ایسے کسی شخص کو ہرگز زندہ نہ چھوڑو۔

قرآن میں استہزاء کے جرم کا ذکر تو بار بار آیا ہے مگر اس کے مجرم کے لیے سزائے قتل کا اعلان سارے قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں۔ قرآن میں مستہزئینِ رسالت کے سلسلہ میں صرف دو قسم کے ردّ عمل کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یا تو دلائل کے ساتھ ان کی کہی ہوئی بات کو رد کیا گیا ہے، یا انہیں خدا کی پکڑ سے اور اس کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

یہ استہزاء کرنے والے غیر مسلمین بھی ہوتے تھے (یس، 36:30) اور منافق قسم کے مسلمان بھی (البقرہ، 2:4؛ التوبہ، 9:35)۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قسم کے لوگوں کی طرف سے یہ معاملہ اپنی بدترین صورت میں پیش آیا۔ مگر مجرد استہزاء کی بنا پر قرآن

میں نہ غیر مسلموں کے لیے قتل کی قانونی سزا کا حکم دیا گیا اور نہ منافق مسلمانوں کے لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر رسول کی اہانت اور آپ کے ساتھ گستاخی کو اس طرح مطلق انداز میں واجب القتل جرم قرار دے دیا جاتا تو مجرم سے زیادہ خود اسلام کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن جاتا۔ کیونکہ اسلام کے وہ مقدس سپاہی جن کو صحابۂ کرام کہا جاتا ہے، ان کی بیشتر تعداد ابتداءً عین اسی جرم میں مبتلا تھی جس کو "رسول کی شان میں گستاخی" کہا جاتا ہے۔ اگر اس جرم کا ارتکاب کرتے ہی فوراً انہیں قتل کر دیا جاتا تو یہ سادہ معنوں میں صرف مجرم کا قتل نہ ہوتا بلکہ تاریخ ساز انسانوں کا قتل ہوتا۔ اس کے بعد اسلام کی وہ تاریخ ہی نہ بنتی جو بعد کو بنی، اور جو موجودہ مسلمانوں کا سب سے زیادہ پُرفخر سرمایہ ہے۔ تمام قیمتی زندگیاں اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتیں کہ اسلام قبول کریں اور دنیا کی تاریخ میں وہ عظیم الشان کردار ادا کریں جو منصوبۂ الٰہی کے تحت اس کے لیے عالمی سطح پر مقدر کیا گیا تھا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کچھ واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ واقعات بطور حصر نہیں ہیں، بلکہ صرف بطور مثال ہیں۔ پہلے کچھ غیر مسلموں کے واقعات درج کیے جائیں گے، اور اس کے بعد کچھ مسلمانوں کے واقعات۔

مستقبل پر نظر

قدیم مکّہ میں جو ممتاز افراد تھے، ان میں سے ایک شخص کا نام سہیل بن عمرو تھا۔ آج سہیل بن عمرو کا شمار صحابہ کی فہرست میں ہوتا ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے۔ وہ بدر کی لڑائی میں مشرکین کی طرف سے شریک ہوئے۔ اس لڑائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مشرکین کو شکست ہوئی۔ ان کے 70 آدمی گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے۔ ان میں سے ایک سہیل بن عمرو بھی تھے۔

سہیل بن عمرو کے اندر زبان آوری کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ خطیبِ قریش کہے

جاتے تھے۔ اپنی اس صلاحیت کو انھوں نے بھر پور طور پر اسلام کے خلاف استعمال کیا۔ وہ شعر اور خطابت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے خلاف اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اکساتے رہتے تھے۔ جب وہ گرفتار ہو کر مدینہ آئے اور ان کے اوپر مسلمانوں کو پوری طرح قابو حاصل ہو گیا، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے اجازت دیجیے کہ میں سہیل بن عمرو کے سامنے کے دانت توڑ دوں۔ اس طرح اس کی زبان باہر نکل پڑے گی اور اس کی آواز خراب ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ آپ کے خلاف خطیب بن کر کھڑا ہو سکے۔

بظاہر یہ ایک جائز بات تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کا مُثلہ نہیں کروں گا۔ اگر میں اس کا مُثلہ کروں تو اللہ میرا مُثلہ کرے گا، اگرچہ میں ایک رسول ہوں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے مزید ایک بات فرمائی۔ یہ بات بظاہر شخصی ہے مگر وہ ایک عالمی انسانی حقیقت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ سہیل بن عمرو ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں تم ان کی مذمت نہ کرسکو: **لَعَلَّهُ يَقُومُ مَقَامًا لَا تَكْرَهُهُ** (مغازی الواقدی، جلد 1، صفحہ 107)۔ چنانچہ مُثلہ یا قتل کے بغیر سہیل بن عمرو کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غیر معمولی سلوک کیا کہ غزوۂ بدر (2ھ) کے بعد ان پر قابو پانے کے باوجود انہیں رہا کر دیا۔ مگر اب بھی وہ اپنی اسلام دشمنی سے باز نہ آئے۔ انھوں نے مکہ کے لوگوں کو دوبارہ اکسایا اور تین ہزار کی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ اندوہناک جنگ پیش آئی جس کو غزوۂ احد (3ھ) کہا جاتا ہے۔

یہی سہیل بن عمرو تھے جنھوں نے معاہدہ حدیبیہ (6ھ) کے موقع پر لفظ ”رسول اللہ“ کو کاغذ سے محو کرادیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی یک طرفہ شرائط پر راضی ہونے کے لیے مجبور کیا تھا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی۔ 8ھ میں مکہ فتح ہو گیا۔ اس وقت تک سہیل بن عمرو کفر کی حالت میں تھے۔ مگر اب بھی، ثابت شدہ جرائم کے باوجود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی سزا نہیں دی۔ اس کے برعکس آپ نے اپنے اصحاب کو ان کے ساتھ حسن اخلاق کی ہدایت فرمائی۔ آپ نے کہا:

مَنْ لَقِيَ سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو فَلَا يَشُدُّ النَّظَرَ إِلَيْهِ، فَلَعَمْرِي، إِنَّ سُهَيْلًا لَهُ عَقْلٌ وَشَرَفٌ، وَمَامِثْلُ سُهَيْلٍ جَهِلَ الْإِسْلَامَ (الطبقات الکبریٰ، حدیث نمبر 198)۔

یعنی جو شخص سہیل بن عمرو سے ملے، وہ اس کی طرف تیز نگاہوں سے نہ دیکھے۔ میری جان کی قسم، بلاشبہ سہیل عقل اور شرف والا آدمی ہے۔ اور سہیل جیسا آدمی اسلام سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایتیں جاری رہیں۔ غزوۂ ہوازن کے بعد آپ نے ان کو ایک سو اونٹ تالیف قلب کے طور پر دیے۔ اس عطیہ کے بعد وہ بالکل ڈھ پڑے اور اسلام قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بن گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب قبائل میں یہ تاثر پھیل گیا کہ وہ شخص دنیا سے چلا جس کی وجہ سے اسلام کو خدا کی مدد ملتی تھی۔ چنانچہ عرب قبائل کی اکثریت ارتداد کی طرف مائل ہو گئی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو مکہ کے بیشتر لوگوں نے یہ چاہا کہ وہ اسلام سے پھر جائیں۔ انھوں نے اس کا پورا ارادہ کر لیا۔ مکہ کی فضا اتنی خراب ہوئی کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل عتّاب بن اسید روپوش ہو گئے۔

مذکورہ سہیل بن عمرو اس وقت تک اسلامی جماعت کے ایک فرد بن چکے تھے۔ وہ شاندار خطیب ہونے کے ساتھ ایک بارعب شخصیت والے آدمی تھے۔ جب انھوں نے مکہ کا یہ حال دیکھا تو وہ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ خطیبانہ صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان ایک پُرزور تقریر کی۔ انھوں نے کہا سن لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نے اس کے سوا کچھ اور نہیں کیا ہے کہ اس نے اسلام کی قوت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ جو شخص ہمارے خلاف کچھ کرے گا، ہم تلوار سے اس کی گردن مار دیں گے۔

سہیل بن عمرو کی گرج دار تقریر کو سن کر لوگوں نے رجوع کرلیا۔ انہوں نے اسلام سے پھرنے کا جو ارادہ کیا تھا، اس سے باز آ گئے۔ اس کے بعد عتّاب بن اسید بھی روپوشی سے نکل آئے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہی مطلب تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں وہ تمہارے نزدیک قابلِ مذمت نہ ہوں بلکہ قابلِ تعریف ہوں: إِنَّ ذَلِكَ لَمْ يَزِدْ الْإِسْلَامَ إِلَّا قُوَّةً، فَمَنْ رَابَنَا ضَرَبْنَا عُنُقَهُ، فَتَرَاجَعَ النَّاسُ وَكَفُّوا عَمَّا هَمُّوا بِهِ، وَظَهَرَ عَتَّابُ بْنُ أَسِيدٍ. فَهَذَا الْمَقَامُ الَّذِي أَرَادَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم فِي قَوْلِهِ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ: إِنَّهُ عَسَى أَنْ يَقُومَ مَقَامًا لَا تَذُمُّهُ (سیرت ابن ہشام، جلد 4، صفحہ 346)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنّت بتاتی ہے کہ آپ کی نظر حال پر نہیں رکتی تھی۔ آپ آدمی کے حال سے گزر کر اس کے مستقبل کے امکانات کو دیکھتے تھے۔ ایک انسان کا آج اگر باغیانہ ہے تو اس کو نظر انداز کر کے آپ یہ سوچتے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں وہ ہمارا وفادار ہو جائے۔ اور پھر اس کی وہ خدا دار صلاحیتیں جو اس وقت اسلام کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں، وہ اسلام کی تائید میں استعمال ہونے لگیں: تاریخ بتاتی ہے کہ فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔

اسلامی تاریخ میں 10 نبوی کا عام الحزن کہا جاتا ہے، کیونکہ اسی سال اوّلاً ابو طالب اور اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ کے حالات انتہائی حد تک غیر موافق ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے اسی سال مکہ سے طائف کا سفر کیا۔ یہ سفر اس امید میں تھا کہ شاید طائف میں آپ کے لیے کام کے موافق حالات مل سکیں۔

مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ طائف کے سرداروں (عبد یالیل، مسعود، حبیب) نے آپ کے ساتھ بے حد گستاخی اور اہانت کا سلوک کیا۔ مزید یہ کہ انھوں نے شہر کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا جو آپ کی ہنسی اُڑائیں اور آپ پر پتھر برسائیں۔ آپ اس حال میں طائف سے واپس ہوئے کہ پتھروں کے مار سے آپ کا جسم خوں آلود ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت عائشہ سے فرمایا کہ میری زندگی کا سب سے سخت دن وہ ہے جو طائف کے سفر کے موقع پر گزرا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آپ طائف سے زخم خوردہ اور غم گین حالت میں واپس لوٹ رہے تھے تو قرن ثعالب کے مقام پر حضرت جبریل آپ کے پاس آئے انھوں نے آپ کو آواز دے کر کہا کہ اللہ نے آپ کی قوم کے سلوک کو دیکھا۔ اب اللہ نے ملک الجبال (پہاڑوں کے فرشتہ) کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ اہل طائف کے بارے میں جو کچھ چاہتے ہیں، اس کا انہیں حکم دیں۔

اس کے بعد ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) سامنے آیا۔ اس نے آپ کو سلام کیا اور کہا اے محمد، اللہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اللہ نے آپ کے خلاف آپ کی قوم کی بات سنی۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کا باہم ملا کر اس

کے درمیان طائف کی بستی کو پیس ڈالوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسلوں سے وہ انسان پیدا کرے گا جو ایک اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے: أَرْجُو أَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ مِنْ أَصْلاَبِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ وَحْدَهُ، لاَ يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3231، صحیح مسلم، حدیث نمبر 1795)۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اگر موجودہ نسل نہ مان رہی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اگلی نسلوں تک انتظار کرنے کے لیے تیار تھے۔ موجودہ لوگوں کی طرف سے توہین اور سرکشی کا تجربہ ہونے کے باوجود آپ اس امید میں انھیں ہلاک کرنا نہیں پسند کرتے تھے کہ شاید ان کی اولاد یا اولاد کی اولاد میں وہ انسان پیدا ہو جو خدا کی خدائی کا اعتراف کرے اور اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد کے دور میں طائف کے تمام باشندے اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کی راہ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ مثلاً ابو عبید مسعود ثقفی انہی اہل طائف کی اولاد تھے۔ وہ اس مسلم فوج کے قائد تھے جس نے حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں ایران میں جہاد کیا۔ انھوں نے ہاتھیوں کی فوج کے مقابلہ میں غیر معمولی جانبازی دکھا کر ایرانی فوجوں کو اس قدر مرعوب کیا کہ انہوں نے جنگ کا حوصلہ کھو دیا۔

محمد بن القاسم ثقفی 711ء (95ھ) میں سندھ کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ وہ ایک انتہائی عادل اور باصلاحیت سردار تھا۔ اس نے صرف دو سال کے عرصہ میں سندھ اور پنجاب میں اتنے بڑے پیمانے پر اسلام کی اشاعت کی کہ ایک پورا علاقہ اللہ کے دین کے سایہ میں آ گیا۔ موجودہ پاکستان محمد علی جناح کی دَین نہیں، بلکہ حقیقتاً وہ محمد بن القاسم ثقفی کی دَین ہے۔

محمد بن القاسم اتنالائق اور شریف سردار تھا کہ جب وہ ہندستان سے واپس ہوکر دمشق گیا تو، فتوح البلدان (صفحہ 424) کے بیان کے مطابق، اہل ہنداس کے لیے روئے اور اس کا مجسمہ بنا کر اس کی تعظیم وتقدس کی (فَبَکَی أَھْلُ الْھِنْدِ عَلَی مُحَمَّدٍ وَصَوَّرُوهُ)۔ اسلام کا یہ قیمتی مجاہد اسی قبیلۂ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا جس کی بدترین گستاخی اور ایذا رسانی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ ان کی اگلی نسل میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اللہ کے عبادت گذار بنیں گے۔

قبیلۂ ثقیف (اہل طائف) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی اور ایذا رسانی کا بدترین فعل کیا تھا۔ مزید یہ کہ ان کو سزا دینے کا معاملہ پوری طرح آپ کے قابوں میں تھا، کیونکہ پہاڑوں کا فرشتہ (ملک الجبال) آپ کے حکم کے نفاذ کے لیے آچکا تھا۔ مگر آپ نے انہیں سزا دینے کے بجائے اس کو پسند کیا کہ ان کی نسلوں سے ایسے افراد نکلیں جو اسلام کے سپاہی بن کر اسلام کی تاریخ بنائیں۔

حالات بتاتے ہیں کہ فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔ اگر آپ طائف والوں کی گستاخی کی سزا دینے کے لیے ملک الجبال کو استعمال کرتے تو طائف آج صرف کھنڈروں کی داستان ہوتا، نہ کہ اسلام کے قلعہ کی تعمیر کی شاندار تاریخ۔

آج کا دشمن کل کا دوست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مخالفین میں سب سے برا کردار جس شخص نے ادا کیا، وہ مکہ کا عمرو بن ہشام ہے جو تاریخ میں ابوجہل کے نام سے مشہور ہے۔ ابوجہل کے لڑکے کا نام عکرمہ تھا۔ عکرمہ آج اصحاب رسول کی معزز فہرست میں شامل ہیں، مگر فتح مکہ سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت مخالف تھے اور اس معاملہ میں پوری طرح اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ گستاخی اور جارحیت کی کوئی قسم نہ تھی جو انھوں نے آپ کے خلاف اختیار

نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ اپنے باپ کی موت کے بعد بھی بدستور رسول اللہ صلی اللہ علی وسلم کے خلاف سرگرم رہے۔ مثلاً غزوۂ احد میں مشرک فوج کے میمنہ کے سردار خالد بن ولید تھے، اور میسرہ کے سردار عکرمہ بن ابی جہل۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عکرمہ کا جرم اتنا واضح تھا کہ فتح مکہ کے بعد وہ مکہ چھوڑ کر یمن کی طرف بھاگ گئے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور قتل کر دیے جائیں گے۔ ان کی بیوی جو مسلمان ہو گئی تھیں، وہ یمن جا کر باصرار انہیں واپس لے آئیں۔ وہ انتہائی شرمساری کے ساتھ اپنا سر جھکائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا مجھے امان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، تم کو امان ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی واقعات سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آخر کار انھوں نے کلمہ شہادت ادا کر کے اسلام قبول کر لیا۔

عکرمہ جب یمن سے واپس ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آرہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ عکرمہ تمہارے پاس آرہے ہیں۔ تم ان کے باپ (ابوجہل) کو برا نہ کہنا۔ کیونکہ مُردہ کو برا کہنا مردہ تک تو نہیں پہنچتا، البتہ وہ زندوں کو تکلیف دیتا ہے (يَأْتِيكُمْ عِكْرِمَةُ بْنُ أَبِي جَهْلٍ مُؤْمِنًا مُهَاجِرًا، فَلَا تَسُبّوا أَبَاهُ، فَإِنّ سَبّ الْمَيّتِ يُؤْذِي الْحَيّ وَلَا يَبْلُغُ الْمَيّت)۔ عکرمہ جب آپ کے پاس پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوش ہو کر ان کی طرف تیزی سے بڑھے، حتیٰ کہ آپ کی چادر آپ کے اوپر سے گر پڑی (مغازی الواقدی، جلد، صفحہ 851-852)۔

اسلام قبول کرنے کے بعد عکرمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں آپ سے ایک چیز طلب کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم طلب کرو میں تمہیں ضرور وہ چیز دوں گا

(لَا تَسْأَلْنِي الْيَوْمَ شَيْئًا أُعْطِيهِ أَحَدًا إِلَّا أَعْطَيْتُكَهُ) ۔عکرمہ نے کہا کہ میری آپ سے درخواست ہے کہ ہر دشمنی جو میں نے آپ کے ساتھ کی ہے، یا ہر رکاوٹ جو میں نے آپ کے راستہ میں ڈالی ہے، ہر وہ لڑائی جو میں نے آپ کے خلاف لڑی ہے، ہر وہ بدکلامی جو میں نے آپ کے منہ پر کی ہے یا آپ کے پسِ پشت کی ہے، ان سب کو معاف کر دیں اور ان کے بارے میں اللہ سے میرے لیے استغفار فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ہی ان کے حق میں یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ ہر وہ عداوت جو عکرمہ نے میرے ساتھ کی، ہر وہ سرگرمی جو انھوں نے اس ارادہ سے کی کہ تیرے نور کو بجھا دیں، ان سب کو تو ان کے لیے معاف کر دے اور وہ سب کچھ جو انھوں نے میری بے آبروئی کے لیے کیا، خواہ میرے سامنے کیا ہو، یا میرے پسِ پشت، ان سب کو تو معاف کر دے (مغازی الواقدی، جلد، صفحہ 852)۔

اس کے بعد عکرمہ نے کہا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خدا کی قسم، ہر وہ خرچ جو میں اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کرتا تھا، اب اس کا دگنا اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ اور اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جو جنگیں میں نے کیں، اب اللہ کے راستہ میں اس سے دُگنا جنگ کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد عکرمہ اپنی جان اور اپنے مال کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں لگ گئے۔ وہ برابر اسی میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ وہ یرموک کے معرکہ میں زبردست جانبازی دکھاتے ہوئے شہید ہو گئے (مغازی الواقدی، جلد، صفحہ 852-853؛ الاستیعاب لابن عبد البر، جلد 3، صفحہ 1085)۔

عکرمہ نے گستاخی سے لے کر جارحیت تک ہر جرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا تھا۔ بظاہر وہ اس قابل تھے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاتل نہیں تھے، داعی تھے۔ آپ نے عکرمہ کے ”آج“ میں چھپا ہوا ”کل“ دیکھ لیا تھا۔ یہی وہ داعیانہ نگاہ تھی، جس کی بنا پر آپ نے انہیں یک طرفہ معاف کر دیا۔ بعد کے واقعات نے

بتایا کہ آپ کا اندازہ نہایت درست تھا۔ چنانچہ دشمن عکرمہ کے اندر سے ایک دوست عکرمہ برآمد ہوا۔ جو شخص اپنی ابتدائی زندگی میں کفر کا کھمبا بنا ہوا تھا، وہ اپنی بعد کی زندگی میں اسلام کا ستون بن گیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد

اوپر ان لوگوں کی مثال نقل کی گئی ہے جو قبولِ اسلام سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مرتکب ہوئے مگر انھیں سزا دینے کے بجائے ان کو معاف کر دیا گیا۔ اب کچھ ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جب کہ آدمی نے اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کی شان میں گستاخی کی اور آپ کو اذیت پہنچائی۔ اس کے باوجود اس مسلمان کو قتل کی سزا نہیں دی گئی۔

1۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ، مجھ سے ابو عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر نے مقسم بن ابو القاسم مولیٰ عبد اللہ بن الحرث بن نوفل کی روایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ میں اور تلید بن کلاب اللیثی دونوں نکلے، یہاں تک کہ ہم عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس پہنچے۔ وہ اپنا جوتا ہاتھ میں لٹکائے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا۔ کیا آپ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے جب حنین کے دن تمیمی نے آپ سے بات کی تھی۔ انھوں نے کہا ہاں۔ بنو تمیم کا ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ اس کو ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس وقت آپ لوگوں کو مالِ غنیمت دے رہے تھے۔ (وہ دیکھتا رہا) یہاں تک کہ اس نے کہا کہ اے محمد! میں نے اس کو دیکھ لیا جو آپ نے آج کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، پھر تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے عدل کیا ہو (لَمْ أَرَكَ عَدَلْت)۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے بیان کیا کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہو گئے۔ آپ نے کہا تیرا بُرا ہو، اگر میرے پاس عدل نہیں ہوگا تو پھر کس کے پاس ہوگا (فَغَضِبَ رَسُولُ اللّٰہِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ قَالَ: وَيْحَكَ، إِنْ لَمْ يَكُنِ الْعَدْلُ عِنْدِي، فَعِنْدَ مَنْ يَكُونُ)۔ حضرت عمر بن الخطاب نے یہ سن کر کہا اے خدا کے رسول، کیا میں اسے قتل نہ کردوں۔ آپ نے کہا کہ نہیں، اس کو چھوڑ دو۔ عنقریب اس کی ایک جماعت ہوگی جو دین میں تعمق کرے گی، یہاں تک کہ وہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے کہ تیر شکار سے (مسند احمد، حدیث نمبر 7038)۔

مذکورہ مسلمان (ذوالخویصرہ) کے معاملہ پر غور کیجیے۔ اس نے خدا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جو گستاخی کی وہ سادہ معنوں میں صرف ایک لفظی گستاخی نہ تھی، وہ خود آپ کی حیثیتِ رسالت پر ضرب لگانے کے ہم معنی تھی۔ اس شخص نے آپ کی عدالت پر شبہ کیا تھا اور آپ کو اپنے خیال کے مطابق غیر عادل بتایا تھا۔ یہ بات انتہائی حد تک سنگین ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت قرآن کے راوی کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بواسطہ جبریل خدا کا کلام پایا ہے۔ اور اس کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ آپ کی اسی روایت پر یقین کرکے ہم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں۔

یہ معلوم ہے کہ کسی روایت کو قبول کرنے کے لیے راوی کا عادل ہونا شرط لازم ہے۔ جس راوی کی عدالت مشتبہ ہو، اس کی روایت کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔ ایسی حالت میں مذکورہ تمیمی مسلمان کا آپ کو غیر عادل بتانا گویا آپ کے راویِ قرآن ہونے کی حیثیت کو مشتبہ قرار دینا ہے۔ یہ بلاشبہ سب سے زیادہ سخت بات ہے جو آپ کے خلاف کہی جا سکتی ہے۔ مذکورہ شخص نے اتنی سنگین بات کہی، اس کے باوجود اس کو نہ کوئی سزا دی گئی اور نہ اس کو قتل کیا گیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے بجائے خود کوئی واجب القتل جرم نہیں ہے۔ کسی کے

واجب القتل ہونے کے لیے اسی کے ساتھ کچھ مزید اسباب درکار ہیں۔ مثلاً ریاستِ اسلامی سے بغاوت۔ چند افراد کو دورِ اول میں قتل کیے گئے ہیں، ان کا معاملہ اسی دوسرے حکم کے تحت آتا ہے۔ انہیں ریاست سے بغاوت کے جرم میں قتل کیا گیا، نہ کہ مجرد گستاخیِ رسول کے جرم میں۔

2۔ شعبان 6ھ میں وہ غزوہ پیش آیا جس کو تاریخ میں غزوہ بنی المصطلق کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ کے لیے جو لشکر روانہ ہوا، اس میں عبداللہ بن ابی اور دوسرے بہت سے منافق قسم کے مسلمان شریک تھے۔ یہ لوگ اپنی بے حسی اور بے خوفی کی بنا پر معمولی باتوں کو شوشہ بنا لیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مخلص مسلمانوں کے خلاف فتنے برپا کرتے رہتے۔

اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ عائشہ بنت ابی بکر بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ واپسی میں فوج نے ایک منزل پر پڑاؤ کیا۔ حضرت عائشہ حسب معمول رات کے آخری حصہ میں رفع حاجت کے لیے دور چلی گئیں۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک معمولی قسم کا ہار تھا، وہ اتفاق سے ٹوٹ کر گر پڑا۔ حضرت عائشہ اس کو تلاش کرنے لگیں۔ اندھیرے کی وجہ سے اس میں بہت زیادہ دیر لگ گئی۔

حضرت عائشہ ابھی لوٹی نہیں تھیں کہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت حضرت عائشہ اپنی ہودج میں بیٹھ جاتی تھیں جو چاروں طرف سے کپڑے سے ڈھکا ہوتا تھا، اور چار آدمی اس کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ حضرت عائشہ اس وقت ایک چھوٹی اور دبلی خاتون تھیں۔ چنانچہ ہودج اٹھانے والوں کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ اس میں کوئی سواری نہیں ہے۔ انھوں نے خالی ہودج کو اونٹ پر رکھ دیا اور اس کو لے کر روانہ ہو گئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا واپس آئیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ بظاہر کوئی صورت نہ پا کر وہ وہیں چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔ صبح کے وقت صفوان بن معطّل سُلمی وہاں آئے جو قافلہ کے پیچھے

چلنے پر مامور تھے۔ میدان میں ایک خاتون کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ (عائشہ) ہیں۔ ان کی زبان سے نکلا: اناللّٰہ واناالیہ راجعون۔ اس کے سوا انھوں نے کوئی کلام نہ کیا۔ صرف اپنا اونٹ لا کر حضرت عائشہ کے پاس بٹھا دیا۔ حضرت عائشہ اشارہ سمجھ کر اونٹ پر سوار ہوگئیں۔ اس کے بعد وہ اونٹ کی نکیل پکڑ کر تیزی سے آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوپہر کے قریب یہ اونٹ مسلمانوں کے قافلہ سے جا ملا جبکہ وہ اگلے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ابن ابی مُلَیکہ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ جب اس طرح قافلہ میں پہنچی تو منافقین کے ایک گروہ نے ان کو دیکھ لیا جو عبداللہ بن ابی کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے سردار عبداللہ بن ابی نے پوچھا یہ کون ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ عائشہ ہیں۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم، نہ یہ بچی ہیں اور نہ وہ ان سے بچا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ تمہارے پیغمبر کی بیوی نے ایک غیر شخص کے ساتھ رات گزاری، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اب وہ ان کو لے کر آرہا ہے: قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ، رَئِيسُهُمْ: مَنْ هَذِهِ؟ قَالُوا: عَائِشَةُ قَالَ: وَاللّٰهِ مَا نَجَتْ مِنْهُ وَمَا نَجَا مِنْهَا، وَقَالَ: امْرَأَةُ نَبِيِّكُمْ بَاتَتْ مَعَ رَجُلٍ حَتَّى أَصْبَحَتْ ثُمَّ جَاءَ يَقُودُ بِهَا (تفسیر البغوی، جلد 6، صفحہ 23)۔

اس کے بعد جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا تو عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے اس معاملے کو پروپیگنڈا کا اشو بنایا اور اس کو بھرپور طور پر آپ کے خلاف استعمال کیا۔ یہاں تک کہ سارے شہر میں ہنگامی حالت پیدا ہوگئی۔ ہر طرف اس کا چرچا تھا، ہر زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھے۔ حضرت عائشہ کا یہ حال تھا کہ رات دن روتی رہتی تھیں۔ اس قصہ کی تفصیلات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہ ہنگامی صورت حال ایک مہینہ تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ سورہ النور کی آیتیں (11-21) اتریں۔ ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ عائشہ مکمّل طور پر معصوم اور بے قصور ہیں۔ اس معاملہ میں سارا جرم یک طرفہ طور پر عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ اس طرح یہ سنگین معاملہ براہ راست خدائی مداخلت کے ذریعہ ختم ہوا۔

عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت کے ساتھ اتنا بڑا بہتان تراشا۔ خود قرآن کی گواہی کے مطابق، اس معاملہ میں عبداللہ بن ابی سب سے بڑا مجرم تھا (24:11)۔ قرآن میں اس کے ابلیسی جرم کا اعلان کیا گیا، مگر اس کے لیے کوئی قانونی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ اس کی سزا کے معاملہ کو تمام تر آخرت پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ وہ اس واقعہ کے بعد زندہ رہا، یہاں تک کہ مدینہ میں اپنی طبعی موت سے مر کر وہ اپنا حساب دینے کے لیے خدا کے یہاں چلا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبداللہ بن ابی کی بابت کہا کہ اے خدا کے رسول! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں: أَنْ يَتَحَدَّثَ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 8100)۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے اس کے لیے ایک موقع پر یہ فرمایا کہ ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے اور بہتر سلوک کریں گے، جب تک یہ ہمارے درمیان رہے: بَلْ نَتَرَفَّقُ بِهِ وَنُحْسِنُ صُحْبَتَهُ مَا بَقِيَ مَعَنَا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 293)۔

عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو کچھ کیا، وہ آپ کی اور آپ

کے اہل بیت کی کردار کشی کی بدترین صورت تھی۔ یہ پیغمبر کے خلاف اتنی بری مجرمانہ حرکت تھی کہ اس سے بڑی کسی مجرمانہ حرکت کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مدینہ کے حاکم تھے۔ اس اعتبار سے آپ کو عبداللہ بن ابی کے اوپر کامل قانونی اختیار حاصل تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس کو قتل نہیں کرایا۔ صرف اس کے جرم کا اعلان کرکے اسے آزاد چھوڑ دیا۔

ایسی حالت میں جولوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی علی الاطلاق طور پر مستوجبِ قتل جرم ہے، وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس قرآن وسنت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

خدائی ضمانت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بگاڑنے اور آپ کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش آپ کے ہم عصر یہودیوں نے شروع کی جو اس وقت عرب میں آباد تھے۔ پھر صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کے مسیحی علماء اور مستشرقین نے صدیوں تک اسے پوری قوت کے ساتھ جاری رکھا (دیکھیے زیرِنظر کتاب کا عنوان: اسلام مغربی لٹریچر میں)۔ موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے سلمان رشدی اور ان جیسے دوسرے لوگ یہی نازیبا کام جدید ترین ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے انجام دے رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لیے کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کریں۔ وہ ایسی کتابوں کے خلاف ایجی ٹیشن اور ہنگامہ شروع کر دیں۔ اب تک مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے عملاً بس اسی قسم کا ردّعمل ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مگر اس واقعہ کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور بدقسمتی سے مسلمان اپنے منفی جوش کی وجہ سے اب تک اس دوسرے پہلو سے آگاہ نہ ہو سکے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے کعب بن اشرف سے لے کر بیسویں صدی کے سلمان رشدی تک بے شمار لوگ مسلسل اس معاندانہ کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ وہ آپ کی تصویر کو داغدار کریں۔ اس مخالفانہ عمل پر جلد ہی ڈیڑھ ہزار سال پورے ہو جائیں گے۔ مگر ان دشمنانِ رسول کو اپنے مقصد میں ایک فی صد کامیابی بھی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی ساری کوششیں عملاً کامل طور پر بے نتیجہ رہیں۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کی نازیبا کوششیں پچھلے پیغمبروں کے خلاف بھی کی

گئیں مگر یہاں نتیجہ بالکل مختلف رہا۔ یہاں ان کے دشمنوں کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ سابق پیغمبروں کے دشمنوں نے ان کی سیرت اور ان کی تعلیمات کو بگاڑنا یا معدوم کردینا چاہا۔ اور عملاً بگاڑ دیا یا معدوم کرڈالا۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک ہر پیغمبر کے خلاف انھوں نے اپنی تحریفی کوشش کی اور ہر بار وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے۔

انسانی تاریخ کا جو مدوّن ریکارڈ ہے، اس میں پچھلے تمام پیغمبروں کو حذف کردیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مصر کی قدیم تاریخ میں فرعون کا ذکر ہے مگر موسیٰ کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ فلسطین کی تاریخ سے مسیح کا ذکر حذف ہے، جب کہ آپ کے ہم عصر رومی حکمرانوں کا ذکر اس میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن کے علاوہ، پچھلے پیغمبروں کی بابت جاننے کا واحد ذریعہ بائبل ہے اور بائبل کا یہ حال ہے کہ اس میں تمام پیغمبروں کو مسخ شدہ حالت میں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں بائبل کا بیان ہے کہ نوح کاشتکاری کرنے لگا۔ اس نے ایک انگور کا درخت لگایا، اور اس نے اس کی مَے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرہ میں برہنہ ہوگیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا (پیدائش، 21-9:2)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ بائبل میں ملتا ہے۔ مگر اس میں آپ کی غیر متعلق خاندانی باتوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے، مگر آپ کی دعوتِ توحید کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہیں (دیکھیے، بائبل کی کتاب پیدائش، باب 15)۔

حضرت لوط علیہ السلام ایک سچے پیغمبر تھے۔ مگر بائبل میں ان کی تصویر یہ دی گئی ہے کہ ان کی دو بیٹیوں نے ان کو مَے پلایا اور رات کے وقت ان کے ساتھ ہم آغوش ہوئیں۔ اور پھر لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں (پیدائش، 19:33)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی چمک قرآن کے مطابق ایک خدائی نشان تھی (20:22; 27:12)۔ مگر بائبل کا بیان ہے کہ موسیٰ نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر اسے

ڈھانک لیا اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کے مانند سفید تھا (خروج، 4:6)۔

حضرت سلیمان علیہ السلام خدا کے سچّے پیغمبر تھے۔ مگر بائبل ان کی بابت کہتی ہے کہ سلیمان بہت سی اجنبی عورتوں سے محبت کرنے لگا۔ یہ ان قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے کہا تھا کہ ان کے بیچ نہ جانا، کیونکہ وہ ضرور تمہارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کر لیں گے۔ سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا۔ اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا۔ کیونکہ جب سلیمان بڑھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا۔ اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی (1۔سلاطین، باب 11)۔

یہ صرف چند حوالے ہیں جو بطور مثال یہاں درج کیے گئے ہیں، نہ کہ بطور احاطہ۔ تفصیل کے طالب بائبل کا مطالعہ کر کے اسے جان سکتے ہیں۔

پیغمبروں کی طویل فہرست میں اس اعتبار سے صرف ایک استثنا ہے، اور وہ پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تمام پیغمبروں میں آپ اکیلے پیغمبر ہیں جن کی تصویر بگاڑنے کی ہر کوشش مسلسل ناکام ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات کا ریکارڈ اپنی کامل ترین ابتدائی شکل میں آج بھی پوری طرح محفوظ ہے اور کسی بھی شخص کے لیے ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ کر کے اس کو بخوبی طور پر جان سکے۔

یہ محض ایک اتفاق کی بات نہیں اور نہ یہ مسلمانوں کی کوششوں کی بنا پر ہے۔ یہ براہ راست خدا کی مداخلت کے تحت ہے۔ یہ خود خدا ہے جس نے آپ کے معاندین کی معاندانہ کوششوں کو مکمل طور پر ناکام بنا رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ

ہے کہ مسلمان جن شیطانی کتابوں (satanic books) پر انسانی حکومتوں سے پابندی لگانے کا مطالبہ کررہے ہیں، وہ پابندی، پیغمبرِ اسلام کے معاملہ میں، خود مالک کائنات کی طرف سے زیادہ بڑے پیمانے پر پہلے ہی لگی ہوئی ہے۔ امتحانی آزادی کی بنا پر خدا نے کسی دشمن حق کے زبان وقلم کو تو نہیں پکڑا۔ مگر اس کی زبان وقلم کی کاوشوں کے نتیجہ کو یقیناً پکڑ رکھا ہے۔ اس نے انہیں عملی طور پر موثر بننے سے روک دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاندین اپنی ساری کوششوں کے باوجود، باعتبار نتیجہ، پیغمبر آخر الزماں کی تصویر کو بگاڑنے کے معاملہ میں وہ کامیابی حاصل نہ کرسکے جو پچھلے پیغمبروں کے معاملہ میں بلا استثنا انھوں نے حاصل کرلی۔

خدائی حفاظت

قرآن میں بار بار مخالفوں کے تمسخر اور استہزاء کا ذکر ہے۔ مگر کہیں بھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جب بھی کسی کو استہزاء کرتے ہوئے پاؤ تو فوراً اس کو پکڑ کر قتل کر ڈالو۔ اس کے برعکس، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ تم اپنی ساری توجہ دعوت و تبلیغ کے کام پر مرتکز رکھو، اور استہزاء کرنے والوں کو سزا دینے کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دو:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۔ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ۔ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ (15:94-99)۔ یعنی، پس جس چیز کا تم کو حکم ملا ہے اس کو کھول کر سنا دو۔ اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ہم تمہاری طرف سے ان کا مذاق اڑانے والوں کے لیے کافی ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک کرتے ہیں۔ پس عنقریب وہ جان لیں گے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے۔ پس تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اور سجدہ کرنے والوں میں سے بنو۔ اور اپنے رب کی عبادت کرو۔ یہاں تک کہ تمہارے پاس یقینی بات آجائے۔

ان آیات کے تحت مفسرین نے جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ، ابن کثیر کے الفاظ میں، یہ ہے کہ تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تمہارے اوپر اتارا گیا ہے، اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ اور مشرکین کی طرف متوجہ نہ ہو جو تم کو آیاتِ الٰہی کی تبلیغ سے روک دینا چاہتے ہیں۔ تم ان سے نہ ڈرو۔ کیونکہ اللہ ان کی طرف سے تمہارے لیے کافی ہے۔ اور تم کو ان سے محفوظ

رکھنے والا ہے: بَلِّغْ مَاأُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ، وَلَا تَلْتَفِتْ إِلَى الْمُشْرِكِينَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَصُدُّوكَ عَنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ وَلَا تَخَفْهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ كَافِيكَ إِيَّاهُمْ وَحَافِظُكَ مِنْهُمْ (تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 473)۔

قرآن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں داعی کا طریقہ اعراض ہے، نہ کہ جواب اور مقابلہ۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اپنی ساری توجہ صرف پیغام رسانی کے کام پر لگائے رہے۔ مدعو کی طرف سے استہزاء اور ایذارسانی کا ردّعمل سامنے آئے تو ہرگز وہ اس سے براہ راست نہ الجھے۔ وہ ایسے لوگوں کے معاملہ کو تمام تر اللہ کے اوپر چھوڑ دے۔ قرآن کے مطابق، دعوت دینا داعی کا کام ہے اور مستہزئین سے نمٹنا اللہ کا کام۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا ہے کہ مستہزئین کے مقابلہ میں ہم تمہاری طرف سے کافی ہیں: إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ (15:95)۔ اس خدائی ضمانت کا کوئی وقتی یا محدود مطلب نہیں لیا جا سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک ابدی پیغمبر تھے، اس لیے ضمانت کا یہ وعدہ بھی ابدی وعدہ ہے۔ یعنی اس کا تعلق اسلام کے زمانۂ اول سے بھی ہے جب کہ آپ اپنے وجود مقدس کے ساتھ دنیا میں موجود تھے۔ اور بعد کے زمانہ سے بھی جب کہ آپ اپنے پیغام حق کے ساتھ دنیا میں موجود ہیں۔ اور اہل عالم کو مسلسل اپنی دعوت پہنچا رہے ہیں۔

استہزاء کرنے والا کسی کا استہزاء کیوں کرتا ہے۔ وہ اس لیے ایسا کرتا ہے کہ زیر استہزاء شخصیت لوگوں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائے۔ وہ لوگوں کو اس قابل نظر نہ آئے وہ اس کو اہمیت دیں اور اس کے پیغام پر غور کریں۔ یہی مقصد قدیم زمانہ میں پیغمبر کے مستہزئین کا تھا۔ اور یہی بعد کے زمانہ کے مستہزئین کا ہے۔

اس اعتبار سے استہزاء کا جواب یہ نہیں ہے کہ مستہزی شخص کو قتل کر دیا جائے۔ اس کا

زیادہ حقیقی اورزیادہ کارگر جواب یہ ہے کہ جس شخصیت کا استہزاء کیا جارہا ہے، اس کو اتنا بلند اور اتنا مسلّم الثبوت بنادیا جائے کہ استہزاء کرنے والوں کا استہزاء اس پر اثرانداز ہی نہ ہو۔

اگر کوئی شخص ہمالیہ پہاڑ کو ایک چھوٹا ٹیلہ کہہ کر مذاق اڑائے تو یہ مذاق اس کے اوپر چسپاں نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہمالیہ کی غیر معمولی عظمت خود ہی اس مذاق کی تردید ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہاتھی کو چیونٹی کہہ کر اس کی ہنسی اڑائے تو یہ ہنسی بھی ہاتھی کے اوپر چسپاں نہ ہو گی۔ کیونکہ ہاتھی کا غیر معمولی ڈیل ڈول اپنے آپ اس ہنسی کو بے معنی ثابت کررہا ہے، اس قسم کا تمسخر اتنا بے معنی ہے کہ اس کی تردید کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی تردید آپ ہے۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے۔ آپ کے ساتھ ایسے غیر معمولی نوعیت کے تاریخی حالات جمع کیے گئے ہیں کہ آپ کی شخصی عظمت عالمی سطح پر ایک مسلّمہ واقعہ بن چکی ہے۔ آپ اب کوئی متنازعہ شخصیت نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ایسی شخصیت ہیں جس کی بڑائی کا اعتراف کرنے پر ہر آدمی مجبور ہو، خواہ وہ آپ پر عقیدہ رکھتا ہو یا عقیدہ نہ رکھتا ہو۔

چنانچہ موجودہ زمانہ میں غیر مسلم مصنفین نے کثرت سے ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں آپ کی غیر معمولی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ٹامس کارلائل نے آپ کو تمام پیغمبروں کا ہیروں قرار دیا ہے۔ مائیکل ہارٹ نے دنیا کے سو بڑے انسانوں کی فہرست بنائی تو اس میں آپ کو نمبر ایک پر رکھا (دیکھیے، زیر نظر کتاب کا صفحہ 52)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے مقامِ عظمت پر فائز کردیا ہے کہ اب کسی مستہزی کا استہزاء خود مستہزی کو لوگوں کی نظر میں حقیر بنادے، اس کا استہزاء کسی بھی درجہ میں آپ کے اوپر چسپاں نہ ہو۔ اس فیصلہ الٰہی کی پیشگی خبر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دیدی تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ مکہ کے قریش آپ کو مذمّم (مذمّت کیا ہوا، ملامت زدہ) کہتے

تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف کوئی براہ راست کارروائی نہیں کی۔اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ قریش کی اس ایذارسانی پر مجھے تعجب ہے۔وہ مجھے گالی دیتے ہیں اور مجھ کو مذمّم کہتے ہیں۔حالانکہ میں محمد ہوں:أَلَا تَعْجَبُونَ لِمَا يَصْرِفُ اللَّهُ عَنِّي مِنْ أَذَى قُرَيْشٍ، يَسُبُّونَ وَيَهْجُونَ مُذَمَّمًا، وَأَنَا مُحَمَّدٌ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 356)۔

یعنی کائنات ارض وسماء کے مالک نے میرے لیے مقدر کردیا ہے کہ عالمی تاریخ میں مجھ کو محمد (تعریف کیا ہوا) کی حیثیت سے جگہ ملے۔ایسی حالت میں ان کے جھوٹے سب وشتم کی کیا حقیقت۔

اسی خدائی ضمانت کا یہ کرشمہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب کی اعلیٰ طباعت اوراس کی زبردست پبلیسٹی کے باوجود ساری دنیا میں کوئی ایک شخص نہیں جو اس بے ہودہ کتاب کو پڑھ کر متاثر ہوا ہو یا اس کی رائے پیغمبر اسلام کے بارے میں خراب ہوجائے۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد عالمی اخبارات میں قارئین کے بے شمار خطوط چھپے ہیں۔مگر کسی ایک شخص نے یہ بات نہیں لکھی کہ اس کتاب نے میری نظر میں پیغمبر اسلام کی تصویر بگاڑ دی۔میری نگاہ میں ان کا جو تقدس پہلے تھا، وہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد باقی نہ رہا۔حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے خود مصنف کی تصویر کو بگاڑا ہے، نہ کہ پیغمبر اسلام کی تصویر کو۔

اصل ذمہ داری سے غفلت

مذکورہ آیت (الحجر، 15:94) اوراسی طرح کی دوسری قرآنی آیتوں سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پیغمبر کی لائی ہوئی تعلیمات کو لوگوں کے سامنے پیش کریں، نہ یہ کہ پیغمبر کے خلاف گستاخی کرنے والوں سے لڑائی لڑتے رہیں۔پہلا کام اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ذمہ کیا ہے، اور دوسرا کام اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لیا ہے۔موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جس کام کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ موثر طور پر خود

اپنے ذمہ لے رکھا ہے، اس کے لیے وہ بے فائدہ طور پر شور وغل کرتے ہیں۔ اور جس کام کو اللہ نے خود ان کے ذمہ کیا ہے اس کے لیے وہ متحرک نہیں ہوتے۔ اس نوعیت کی سرگرمی خدا کے مقابلہ میں سرکشی ہے، نہ کہ خدا کے حکم کی تعمیل۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان پیغمبر اسلام کے دین کی اشاعت کے لیے تو کچھ نہیں کرتے، البتہ اگر کوئی معاند ایک لغو بیان دے یا ایک مخالفانہ تحریر چھاپے تو اس کے خلاف شور وغل کرنے میں وہ نہایت تیزی دکھاتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کوتاہی کو بتا رہا ہے۔ اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ مسلمان وہ کام کرنے کے لیے تو بہت بے قرار ہیں جس کا اہتمام خدا نے خود اپنی طرف سے رکھا ہے۔ مگر اس کام کو کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ موجود نہیں جو شریعت کے مطابق انہیں اپنی کوششوں کے ذریعہ انجام دینا ہے۔

قرآن کے مطابق مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی نصرت کریں۔ مگر نصرت سے مراد دعوت ہے، نہ کہ دوسروں کے خلاف شور وغل۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ پیغمبر آخر الزماں پر طعن کرنے والوں کے خلاف شور وغل کر کے انھیں پیغمبر آخر الزماں کی نصرت کا کریڈٹ نہیں مِل سکتا۔ یہ کریڈٹ انھیں صرف اس وقت ملے گا جب کہ وہ پیغمبر آخر الزماں کے پیغام کی اشاعت کے لیے اٹھیں اور اس کو اس کے تمام ضروری آداب وشرائط کے ساتھ ساری قوموں کے سامنے انجام دیں۔

مسلمانوں کی موجودہ روش کیوں ہے، اس کا نہایت گہرا نفسیاتی سبب ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان، مختلف اسباب سے، دوسری قوموں کے بارے میں نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ ان کے بارے میں وہ محبت اور خیر خواہی کا جذبہ نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کے خلاف بھڑکنے کا موقع ہو تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری

قوموں کے ساتھ ہمدردی وخیرخواہی کی بات ہوتو اس کے لیے وہ متحرک نہیں ہوتے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی" کے مسئلہ پر اٹھنے کے لیے صرف نفرت کا جذبہ کافی ہے، جو مسلمانوں کے اندر کافی مقدار میں موجود ہے۔ اس کے برعکس "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی اشاعت" کے لیے محبت کا جذبہ درکار ہے جو آج کے مسلمانوں کے اندر موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے سوال پر تیزی سے حرکت میں آجاتے ہیں اور دوسرے سوالوں پر وہ حرکت میں نہیں آتے، خواہ اس کے لیے انھیں کتنا ہی زیادہ پکارا جائے۔ یہ صورت حال حد درجہ تشویشناک ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اس روش پر نظر ثانی کریں، یہ روش یقینی طور پر خدا کے نقشہ کے مطابق نہیں۔

پہلا کام اتمام حجت

مسلمانوں کا پہلا کام دوسروں کو سزا دینا نہیں ہے، ان کا پہلا کام دعوت دینا ہے اور اس کو اس کے تمام آداب وشرائط کے ساتھ جاری رکھتے ہوئے اتمام حجت تک پہنچانا ہے۔ اور شرائطِ دعوت میں سب سے اہم شرط یہ ہے کہ مدعو کی ہر زیادتی اور گستاخی کو اس وقت تک یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے جب تک اس کی ہدایت کے بارے میں آخری مایوسی کا مرحلہ نہ آجائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض افراد کو سزائیں بھی دی ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں جن واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے، ان تمام واقعات میں سببِ قتل یا تو نقض عہد تھا یا انکارِ رسالت بعد از اتمام حجت۔ سادہ طور پر محض شتم کی بنا پر کسی ایک شخص کو بھی رسول یا اصحابِ رسول نے کبھی قتل نہیں کیا۔

شتمِ رسول کا مسئلہ

عام طور پر مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ شتمِ رسول کی سزا اسلامی شریعت میں قتل ہے۔ اگر اِن لوگوں سے اِس کا حوالہ طلب کیجیے اور یہ پوچھیے کہ اِس کا ثبوت کیا ہے، تو وہ فوراً فقہ کا حوالہ دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ اسلامی فقہ میں متفقہ طور پر یہ حکم بتایا گیا ہے کہ شتمِ رسول کا ارتکاب کرنے والے شخص کو بطور حد قتل کیا جائے گا (یقتل حَدًّا)۔

اِس قسم کا حوالہ اپنے آپ میں ایک بے بنیاد حوالہ ہے۔ کیوں کہ حد کا قانون (capital punishment) کی حیثیت رکھتا ہے، اور اِس قسم کا قانون براہِ راست طور پر، قرآن اور حدیث سے نکلے گا، نہ کہ بعد کو بنائی جانے والی فقہ سے۔ یہ ایک مسلَّم بات ہے کہ اسلام میں مستند ماخذ (authentic source) کی حیثیت صرف قرآن اور حدیث کو حاصل ہے، کوئی تیسرا ماخذ اِس معاملے میں مستند ماخذ نہیں۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، فقہ، علماء کے قیاس اور استنباط پر مبنی ہے، اور علماء کا قیاس اور استنباط اپنے آپ میں کسی قانون کا مستند ماخذ نہیں بن سکتا۔

فقہ کی کتابوں میں شتمِ رسول کے مسئلے پر بحثیں موجود ہیں۔ اِس کے علاوہ، اِس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اُن میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

1۔ تقی الدین احمد بن تیمیہ (وفات 1328ء): **الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول**

2۔ تقی الدین ابوالحسن علی السّبکی (وفات 1355ء): **السیف المسلول علی مَن سبّ الرسول**

3۔ ابنِ عابدین الشامی (وفات 1836ء): **تنبیه الوُلاة والحُکّام علی أحکام شاتم خیر الأنام أو أحد أصحابه الکرام**

شاتمِ رسول کی سزا کے معاملے میں عام طور پر مسلمان بہت زیادہ حساس ہیں، لیکن اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں کوئی حقیقی حوالہ موجود نہیں۔

اِس سلسلے میں پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن کی وہ کون سی آیت ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ شاتمِ رسول کو قتل کردو۔ جیسا کہ معلوم ہے، قرآن میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں، اور آیتوں کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ مگر کسی بھی سورہ، یا کسی بھی آیت میں یہ حکم بیان نہیں کیا گیا ہے کہ — جو شخص رسول کو شتم کرے، اس کو قتل کردو۔

اِس نظریے کے حامی، قرآن کی کچھ آیتیں پیش کرتے ہیں، مگر وہ اِس مسئلے سے مکمل طور پر غیر متعلق ہیں۔ مثال کے طور پر ابنِ تیمیہ نے اپنی کتاب 'الصارم المسلول علی شاتم الرسول، میں کچھ قرآنی آیتیں پیش کی ہیں۔ اُن میں سے ایک آیت یہ ہے: الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (9:61) ۔یعنی جو لوگ خدا کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں جس دردناک سزا (عَذَابٌ اَلِيْمٌ) کا ذکر ہے، اُس سے مراد یقینی طور پر آخرت کی سزا ہے، نہ کہ موجودہ دنیا کی سزا۔ یہ ایک انتہائی غیر علمی طریقہ ہے کہ دنیا کے قتل، اور آخرت کی سزا میں فرق نہ کیا جائے۔ دنیا کی سزا انسانی عدالت کے ذریعے دی جاتی ہے، لیکن آخرت کی سزا براہِ راست خدائی فیصلے کے تحت ہوگی۔ دونوں سزاؤں کی نوعیت ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ ایک سراسر غیر علمی استدلال ہے کہ آخرت کی سزا والی ایک آیت لی جائے اور اُس سے دنیوی سزا کا حکم نکالا جائے۔

اسلامی شریعت کا دوسرا مصدر (source) سنتِ رسول ہے۔ مگر جو لوگ شاتمِ رسول کے لیے قتل کا حکم بیان کرتے ہیں، وہ پورے ذخیرۂ حدیث سے کوئی ایک حدیث بھی اِس کی تائید میں پیش نہ کرسکے۔ یہ مسئلہ اُس وقت ثابت ہوگا، جب کہ حدیث کے ذخیرے

میں کوئی ایسی روایت ہو جس میں اِس قسم کے الفاظ موجود ہوں: **مَن شتم رسولکم فاقتلوہ** (جو تمھارے رسول کی شتم کرے اس کو تم لوگ قتل کردو)۔ مگر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اِس قسم کی کوئی روایت، حدیث کے پورے ذخیرے میں موجود نہیں، اور نہ اب تک کسی نے ایسی کوئی مستند حدیث پیش کی۔

ابنِ تیمیہ حدیث کے ایک بڑے عالم تھے۔ ان کے بارے میں امام محمد بن احمد الذہبی (وفات 1348ء) نے کہا ہے: **کل حَدِیث لَا یعرفهُ ابْن تَیمِیة فَلَیْسَ بِحَدِیث** (شذرات الذہب لابن العماد الحنبلی، جلد 8، صفحہ 145)۔ یعنی کوئی حدیث جس کو ابنِ تیمیہ نہ جانتے ہوں، وہ حدیث ہی نہیں۔ مگر ابنِ تیمیہ اِس پہلو سے کوئی مستند حدیث پیش کرنے سے عاجز ثابت ہوئے ہیں۔

حدیث کے نام سے، انھوں نے اپنی کتاب میں صرف ایک قول نقل کیا ہے۔ اِس کے الفاظ یہ ہیں: ''مَنْ سَبَّ نَبِیًّا فَاقْتُلُوہُ (صفحہ 92)۔ یعنی جو شخص کسی نبی کو شتم کرے، اُس کو قتل کردو۔ اِس مفروضہ حدیث کے بارے میں خود ابنِ تیمیہ نے اپنی کتاب میں یہ الفاظ لکھے ہیں: ''فَإِنْ کَانَ مَحْفُوظًا، فَهُوَ دَلِیلٌ عَلَی وُجُوبِ قَتْلِ مَنْ سَبَّ نَبِیًّا مِنَ الأَنْبِیَاءِ'' (صفحہ 93)۔ یعنی اگر اِس حدیث کی صحت ثابت ہوجائے، تو وہ اِس بات کے وجوب کی دلیل ہوگی کہ نبیوں میں سے کسی نبی کے شاتم کو قتل کیا جائے۔

مذکورہ کتاب کے مصنف ابنِ تیمیہ کی وفات 1328 عیسوی میں ہوئی تھی۔ زیر نظر مضمون لکھے جانے کے وقت اِس کتاب کی اشاعت پر تقریباً سات سو سال گزر چکے ہیں۔ مگر اب تک کسی عالم نے یہ نہیں بتایا کہ اِس حدیث کا ماخذ کیا ہے، اور استناد کے اعتبار سے اس کا درجہ کیا ہے۔ ایسی حالت میں یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ حدیث ایک موضوع حدیث ہے، اور موضوع حدیث سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔

اوپر کی وضاحت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن اور حدیث میں کہیں یہ مسئلہ موجود نہیں ہے کہ جو شخص تمھارے پیغمبر کا شتم کرے، اس کو قتل کردو۔ قرآن اور حدیث کا پورا ذخیرہ اِس قسم کے کسی حکم سے خالی ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ جب اُس قسم کا کوئی واقعہ پیش آئے جس کو مسلمان اپنی زبان میں "شتمِ رسول" کہتے ہیں، تو ایسی حالت میں مسلمانوں کا ردّ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے کسی واقعے کو فکری چیلنج کے طور پر لیں، اور فکری سطح پر اس کا جواب دیں۔ اسلام میں قصاص (البقرۃ، 2:179) کا اصول ہے۔ اِس کے مطابق، یہ ہونا چاہیے کہ قول کا جواب قول سے دیا جائے، قلم کا جواب قلم سے دیا جائے، اور کتاب کا جواب کتاب سے دیا جائے۔ یہ بات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔

مثلاً روایت میں آیا ہے کہ ایک مشرک قبیلے کا شعر مدینہ میں پیغمبر اسلام کے پاس آیا۔ اُس نے اپنے موقف کو اشعار کی زبان میں بیان کیا۔ واضح ہو کہ پریس کے دور سے پہلے شعر کا اسلوب اِس طرح کے معاملات میں رائج تھا۔ گویا شاعری کی حیثیت اُس وقت کے واحد میڈیا کی تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ اُس وقت، پیغمبر اسلام نے ایک قاصد کو بھیج کر حسان بن ثابت الانصاری (وفات: 674ء) کو بلایا۔ جب وہ آگئے تو آپ نے حسان بن ثابت سے کہا: "**قُم یا حسّان، فَأَجِبِ الرَّجُلَ فِیما قال**" (سیرت ابن ہشام، جلد 4، صفحہ 227)۔ یعنی اے حسان اٹھو، اور اِس آدمی کا جواب دو جو اُس نے کہا ہے۔ اِس کے بعد حسان بن ثابت کھڑے ہوئے اور آنے والے شاعر کا جواب شعر کی زبان میں دیا۔

اِس طرح کے متعدد واقعات پیغمبر اسلام کے زمانے میں ملتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام، یا پیغمبر اسلام کے خلاف کچھ کہے، تو اس کا جواب برابر کی سطح پر دیا جائے گا، یعنی قول کا جواب قول سے، اور قلم کا جواب قلم سے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قلم کا

جواب تلوار سے دینا، اسلام کا طریقہ نہیں۔ اِس طرح کا کوئی واقعہ اہلِ اسلام کے لیے صرف ایک فکری چیلنج ہے، وہ کوئی جنگی چیلنج نہیں۔ ایسے موقع پر فریقِ مخالف سے بات کر کے اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ پُرامن انداز میں اس کا جواب فراہم کیا جائے گا۔ عقل کو مطمئن کرنے والا طریقہ اختیار کرتے ہوئے، اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اِس طرح کے موقع پر کسی بھی حال میں تشدد کا کوئی جواز نہیں۔

Conclusion

اوپر جو بحث کی گئی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام مکمل طور پر ایک امن پسند مذہب ہے، حتی کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ تاریخ میں اسلام پہلا ریلجس سسٹم تھا جس نے امن کی ایک مکمل آئڈیالوجی پیش کی، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار کرتے ہوئے حقیقی معنوں میں ایک پُرامن انقلاب برپا کیا۔

اِس معاملے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ایک واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے اپنے ساتھیوں سے کہا: **قَدِمْتُمْ خَيْرَ مَقْدَمٍ مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ قَالُوا وَمَا الْجِهَادُ الْأَكْبَرُ؟ قَالَ: مُجَاهَدَةُ الْعَبْدِ هَوَاهُ** (الزہد الکبیر للبیہقی، حدیث نمبر 373)۔ یعنی تمھارا استقبال ہے چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف۔ لوگوں نے کہا: بڑا جہاد کیا ہے، آپ نے کہا: بندے کا اپنی نفسانی خواہش سے جہاد کرنا۔

جہادِ اکبر اور جہادِ اصغر سے کیا مراد ہے۔ جہادِ اصغر سے مراد ہے عارضی جہاد (temporary jihad) اور جہادِ اکبر سے مستقل جہاد (permanent jihad) مراد ہے۔ مستقل جہاد وہ ہے جو مومن کی زندگی میں ہر روز جاری رہتا ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں مومن کو بااصول طریقِ زندگی پر قائم رہنا ہے۔ کسی بھی قسم کے ٹمپٹیشن (temptation) اور پرووکیشن (provocation) سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے، اسلام کے اصولوں پر قائم

رہنا، یہ ایک مسلسل عمل ہے، اِس لیے اس کو جہادِ اکبر کہا گیا۔

جہاں تک جہادِ اصغر کا تعلق ہے، وہ دراصل دفاعی جہاد کا دوسرا نام ہے۔ دفاعی جہاد استثنائی طور پر کبھی اتفاقاً پیش آتا ہے، وہ اسلامی زندگی کا کوئی مستقل حصہ نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل کا زمانہ ہے۔ آپ کی نبوت کا آغاز 12 فروری 610 عیسوی کو مکہ میں ہوا، اور 8 جون 632 عیسوی کو مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ اِس اعتبار سے آپ کی پیغمبرانہ مدت مسیحی کیلنڈر کے مطابق، 22 سال تین مہینہ ہوتی ہے۔ اِس پوری مدت میں صرف چار لڑائیاں پیش آئیں— غزوۂ بدر (2 ہجری)، غزوۂ اُحد (3 ہجری)، غزوۂ خیبر (7 ہجری)، غزوۂ حنین (8 ہجری)۔ اِن چاروں مواقع پر جو لڑائیاں ہوئیں، اُن میں سے ہر لڑائی صرف آدھے دن تک جاری رہی، یعنی مجموعی طور پر یہ لڑائیاں صرف دو دن کی تھیں۔

دن کے حساب سے اگر شمار کیا جائے، تو پیغمبر اسلام کی نبوت کے کُل ایّام تقریباً آٹھ ہزار ایک سو تیس (8130) ہوتے ہیں۔ اِس لمبی مدت میں پیغمبر اور آپ کے صحابہ آٹھ ہزار ایک سو اٹھائیس دن تک پُرامن جدوجہد میں مشغول رہے، اور صرف دو دن بطور دفاع مسلّح جدوجہد میں حصہ لیا۔ اِس بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

"In Islam, peace is the rule, and war is a rare exception."

ڈائری سے انتخاب

زیرِنظر مضمون مولانا وحید الدین خاں صاحب کی ڈائری سے جمع کیے گئے ہیں:

18 فروری 1989

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا نے اپنے شمارہ 18 فروری 1989 میں ”شیطانی آیات“ کے مصنف سلمان رشدی کے معاملہ پر اڈیٹوریل لکھا ہے جس کا عنوان ہے:

Satanic fall-out

اس اڈیٹوریل میں ایران کے آیت اللہ خمینی کے اس ”فتوی“ پر تنقید کی گئی ہے کہ سلمان رشدی کو مسلمان قتل کر دیں۔ اخبار کے اڈیٹر دلیپ پیڈگاؤنکر نے لکھا ہے کہ ایک فارن نیشنل جو فارن لینڈ میں رہتا ہو، اس کے خلاف اس قسم کی کارروائی دہشت گردی (Terrorism) کے ہم معنی ہے۔ اسی کے ساتھ اڈیٹر نے ایک بہت قیمتی بات لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے: اسلام کو آیت اللہ کی جامد، غیر روادار اور جارحانہ تعبیر دین کے ہم معنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

"Islam cannot be equated with the Ayatullah's rigid, intolerant and aggressive interpretation of it."

اس کا مطلب یہ ہے کہ خمینیت الگ چیز ہے اور اسلام الگ چیز۔ بلاشبہ حقیقت واقعہ یہی ہے۔ مگر ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر کی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف بتاتا ہے کہ اس ملک میں اگر کچھ متعصب لوگ بستے ہیں تو اسی کے ساتھ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو تعصب اور فرقہ واریت سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں۔

21 فروری 1989

17 فروری 1989 کو ٹائمس آف انڈیا اور دوسرے اخبارات میں صفحہ اول پر یہ خبر تھی کہ

ایران کے امام خمینی نے اعلان کیا ہے کہ ”سیٹنک ورسز“ کے مصنف سلمان رشدی کو قتل کردے اس کو ایک بڑا انعام دیا جائے گا۔

سلمان رشدی انگلینڈ کے شہری ہیں۔ خمینی کے اس اعلان کے بعد ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ آخر کار 19 فروری کو یہ خبر آئی کہ سلمان رشدی نے اپنی مذکورہ نزاعی کتاب پر معافی مانگ لی ہے۔ اگرچہ ایرانی حکومت نے اس کے بعد بھی اس کی جان بخشی نہیں کی۔

اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر ارن شرما (دہلی کے ایک انگلش جرنلسٹ) نے کہا کہ خمینی نے اس بات کو یقینی بنا دیا کہ اب صدیوں تک یہ کتاب چھپتی رہے:

"Khomaini has ensured reprint of Satanic Verses for centuries to come."

ٹائمس آف انڈیا (21 فروری 1989) میں صفحہ آخر پر ایک رپورٹ ہے جس میں سلمان رشدی کی کتاب پر مختلف لوگوں کے تبصرے نقل کئے گئے ہیں۔ خوشونت سنگھ نے کہا کہ ناول کی حیثیت سے بھی شیطانی آیات کوئی پڑھنے کے قابل کتاب نہیں۔

مسلمان اگر اس کے خلاف شور وغل نہ کرتے تو یہ کتاب اپنے آپ ختم ہو جاتی۔ مگر انھوں نے شور وغل کر کے غیر ضروری طور پر اس کتاب کو زندگی دے دی۔

23 فروری 1989

آج کل ساری دنیا کے مسلمان سلمان رشدی کی کتاب (سیٹینک ورسز) کے خلاف ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہیں۔ آیت اللہ خمینی اور ایرانی حکومت کی طرف سے انعام کے اعلان کے بعد اس میں مزید بہت زیادہ تیزی آگئی ہے۔

اس نے اخباروں کو ایک نیا پر شور عنوان دے دیا ہے۔ کیونکہ اس طرح کی چیزیں عوام میں خوب پڑھی جاتی ہیں۔ جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ اخباروں میں جو اڈیٹوریل

ہوتے ہیں، ان کو صرف 3 فی صد لوگ پڑھتے ہیں۔ جب کہ بڑے بڑے جرائم کی خبریں صد فی صد پڑھی جاتی ہیں۔ Readability factor کے لحاظ سے کرائم (جرم) کو اخباری صفحات میں ٹاپ کی جگہ حاصل ہے۔ اخباروں کا یہی مزاج ہے جس نے سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے ہنگاموں اور توڑ پھوڑ اور قتل کے منصوبوں کو اخبارات کے صفحہ اول پر جگہ دے دی ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ایک مسلمان ٹیلی فون پر سلمان رشدی سے ملاقات کا اپائنٹمنٹ لیتا۔ وہ رات کو نمازیں پڑھ کر اللہ سے دعا کرتا کہ خدایا، تو سلمان رشدی کو ہدایت عطا فرما۔ اس کے بعد وہ اگلے دن سلمان رشدی سے ملاقات کرتا اور تنہائی میں دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کو نصیحت کرتا۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرتا تو اللہ کی نظر میں وہ سب سے بڑا واقعہ ہوتا۔ مگر اخبار والوں کے نزدیک وہ اتنا غیر اہم ہوتا کہ گوشہ کی چند سطری خبریں بھی اس کو جگہ نہ ملتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان ان کاموں کو تو بہت دھوم کے ساتھ کر رہے ہیں جو اخبار والوں کے نزدیک اہم ہیں۔ مگر ان کاموں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں جو اللہ تعالی کے یہاں اہمیت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

24 فروری 1989

اخبار قومی آواز (22 فروری 1989) میں ایک مسلم لیڈر کا مراسلہ چھپا ہے۔ وہ سلمان رشدی کی کتاب (Satanic Verses) کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے رسول کی توہین کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا۔

آج کل ہر مسلم اخبار یا رسالہ میں اس قسم کے الفاظ چھپ رہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ

مسلمانوں کا اپنا بنایا ہوا دین ہے۔ اس کا خدا اور رسول کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا ورسول کے دین میں اصل اہمیت دعوت کی ہے۔ نہ کہ ان چیزوں کی جن کو موجودہ مسلمان اہمیت دئے ہوئے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ "مسلمان دعوت کے مواقع کی بربادی کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا۔" مسلمانوں نے سلمان رشدی کے خلاف جو شوروغل کیا ہے اس کا واحد نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دعوت کے مواقع ناقابل تلافی حد تک برباد ہو گئے۔ سلمان رشدی نے مذکورہ کتاب لکھ کر اپنے آپ کو بدنام کیا تھا مگر مسلم رہنماؤں نے اس کے خلاف ہنگامہ کر کے اسلام کو بدنام کیا ہے۔ اصل اہمیت کی چیز مواقع دعوت کا تحفظ تھا نہ کہ "توہینِ رسالت" پر بھڑک کر قتل وغارت گری شروع کر دینا۔

6 مارچ 1989

بعد کے مسلم علماء نے یہ مسئلہ بنا لیا ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کرے وہ لازماً قتل کیا جائے۔ اس مسئلہ کے حق میں کوئی صریح نص قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہے۔ یہ مسئلہ تمام تر قیاسی اور استنباطی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عرب کے بے شمار لوگوں نے آپ پر طعن کیا۔ مگر آپ نے انھیں قتل نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ ایسا کرتے تو اسلام کی تاریخ ہی نہ بنتی۔ کیونکہ یہی لوگ تھے جو بعد کو مومن ہو کر اسلام کی طاقت کا ذریعہ بنے۔

ابن القیم نے اپنی کتاب زاد المعاد (جلد 5، صفحہ 61) میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قدیم عرب میں ایسے لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت پر قدح کیا۔ مگر آپ نے انھیں قتل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا آپ کو حق حاصل تھا۔ آپ کو آزادی تھی کہ خواہ ایسے شخص کو سزا دیں یا اسے چھوڑ دیں۔ مگر آپ کی امت

کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کو وصول کرنا ترک کردے (فَذَلِكَ أَنَّ الْحَقَّ لَهُ، فَلَهُ أَنْ يَسْتَوْفِيَهُ، وَلَهُ أَنْ يَتْرُكَهُ، وَلَيْسَ لِأُمَّتِهِ تَرْكُ اسْتِيفَاءِ حَقِّهِ صلى الله عليه وسلم)۔

ابن قیم کی یہ توجیہ نہایت کمزور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی توجیہ کو شریعت میں معتبر مان لیا جائے تو شریعت کا سارا نظام بگڑ کر رہ جائے گا۔

6 اپریل 1989

پیارے لال بھون (نئی دہلی) کے ایک اجتماع میں شریک ہوا اور منتظمین کی دعوت پر مختصر تقریر ہوئی۔ یہ اجتماع ایک انگریزی کتاب کے اجراء (Release) کی تقریب پر کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر ماجد علی خاں نے Satanic Verses کے جواب میں لکھی ہے اور اس کا نام The Holy Verses ہے۔

میرا تاثر یہ تھا کہ کوئی شخص بھی سنجیدہ نہیں۔ نہ سننے والے اور نہ سنانے والے۔ جو صاحب اس اجتماع کے چیف گیسٹ تھے، انھوں نے اپنی تقریر میں "سلمان رشدی" کا نام نہیں لیا۔ انھوں نے کہا میں اس ملعون کا نام لے کر اپنی زبان کو گندا کرنا نہیں چاہتا۔ ان کے اس جملہ پر زوردار تالیاں بجائی گئیں۔ مگر جب وہ اپنی تقریر کو مکمل کرکے واپس آئے تو میں نے سنا کہ سب سے پہلے انھوں نے سلمان رشدی کا نام لیا۔ میرے اور مذکورہ چیف گیسٹ کے درمیان صدر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے صدر صاحب سے کہا: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شخص نے اپنا نام رشدی کیوں رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنا ذہنی رشتہ ابن رشد سے جوڑتا ہے، کیونکہ وہ بھی ایک گمراہ آدمی تھا۔"

14 ستمبر 2007

آج رمضان 1428 ہجری کی پہلی تاریخ ہے۔ حدیث میں روزے کے بارے میں آیا

ہے کہ: مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1903)۔ یعنی، جس نے قولِ زور اور عمل زور ترک نہیں کیا، اللہ کے نزدیک اس کے کھانا اور پانی چھوڑنے کی کوئی اہمیت نہیں۔

اِس حدیث میں قولِ روز کا مطلب ہے واقعے کے خلاف بولنا۔ عملِ زور یعنی جھوٹ پر عمل کرنا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جھوٹ کی بنیاد پر اپنا عملی منصوبہ بنایا جائے۔ مثلاً کسی کو یہ فرضی الزام دیا جائے کہ اس نے رسول اللہ کا شتم کیا ہے اور پھر اس کے قتل کا فتویٰ دے دیا جائے۔ اِسی طرح مثلاً یہ دعویٰ کیا جائے کہ امریکا اسلام دشمن ہے اور پھر اس کے خلاف ہر قسم کے تشدد کو دفاعِ اسلام قرار دے کر جائز بتایا جائے۔

14 دسمبر 2007

آج راشٹریہ سہارا (اردو) کے نمائندہ مسٹر اسجد ندوی آئے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لیے شتمِ رسول کے مسئلے پر ایک انٹرویو کیا۔ میں نے کہا کہ اگرچہ فقہا کی اکثریت یہ مانتی ہے کہ شاتمِ رسول کو قتل کیا جائے گا (يُقتل حدّاً) لیکن یہ رائے تمام تر قیاس اور اجتہاد پر مبنی ہے۔ اِس کے حق میں کوئی صریح نص موجود نہیں، یعنی اِس طرح کا جملہ قرآن یا حدیث میں موجود نہیں کہ: "مَنْ شَتَمَ رَسُولَكُمْ فَاقْتُلُوهُ" جو تمھارے رسول کی شتم کرے اس کو قتل کردو)۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سارے انسانوں کے خیر خواہ تھے۔ میرے نزدیک سب سے بڑا شتم رسول یہ دعویٰ کرنا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا ہے کہ میری شان میں گستاخی کرنے والے ہر شخص کو قتل کردو۔ میرا ماننا ہے کہ ایسا کہنا رسول اللہ کو "رحمت للعالمین" کی حیثیت سے گرانا ہے۔

18 فروری 2013

میں ذاتی طور پر اس مسئلے کو غلط سمجھتا ہوں کہ توہین رسول یا شتمِ رسول ایک قابلِ سزا جُرم

ہے۔ یہ مسئلہ نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ عباسی دور کے فقہاء نے یہ مسئلہ بنایا۔ میں ذاتی طور پر اِس کو فقہی بدعت سمجھتا ہوں۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ توہین رسول کا مسئلہ توہین محمد کا مسئلہ نہیں ہے۔ خود فقہاء کے مطابق، اس کا تعلق خدا سے، تمام رسولوں سے اور پیغمبر اسلام سے ہے۔ مگر عملاً دیکھیے تو مسلمانوں نے اس کو توہین محمد کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ خدا کے خلاف سخت ترین باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی مسلمان اس پر نہیں بھڑکتا۔ دوسرے مسلمانوں کی توہین کی جاتی ہے لیکن اس پر بھی کوئی نہیں بھڑکتا۔ مسلمان استثنائی طور پر صرف پیغمبر اسلام کی توہین پر بھڑکتے ہیں۔ یہ بلاشبہ جاہلیت ہے خود فقہی مسئلے کے مطابق، مسلمانوں کی یہ روش اسلامی روش نہیں۔ یہ ایک خودساختہ شریعت ہے نہ کہ اسلامی شریعت۔

17 اپریل 2006

مجلس التحقیق العلمی (لاہور) کے ترجمان ماہ نامہ محدّث کے شمارہ مارچ 2006 میں ایک مضمون اِس عنوان کے تحت شائع ہوا ہے:

توہین رسالت اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم

اِس مضمون کے لکھنے والے شیخ الحدیث مولانا محمد علی جاں باز ہیں۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے شتم رسول کے متعلق ایک حدیث اس طرح نقل کی ہے: **مَنْ سَبَّ نَبِيّاً قُتِلَ، وَمَنْ سَبَّ أَصْحَابَهُ جُلِدَ** (صفحہ 41)۔ یہ حدیث انھوں نے ابن تیمیہ کی کتاب الصارم المسلول (صفحہ 92) کے حوالے سے نقل کی ہے۔ میں نے ابن تیمیہ کی کتاب میں اِس حدیث کو نکالا۔ معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ وہ بعض ایسی کتابوں کے حوالے سے ہے جن میں رطب و یابس روایتیں بھری ہوئی ہیں۔ مزید یہ کہ خود ابن تیمیہ نے اس روایت کو ضعیف بتایا ہے (**هَذَا الإِسْنَادُ الشَّرِيفُ قَدْ رُكِّبَ عَلَيْهِ مُتُونٌ نَكِرَةٌ،**

وَالمُحَدِّثُ بِهِ عَنْ أَهْلِ البَيْتِ يُعَدُّ ضَعِيفًا) الصارم المسلول لابن تیمیہ، صفحہ 93۔ ایسی حالت میں اس حدیث کو لے کر سبّ وشتم کرنے والے شخص کے قتل کا فتویٰ دینا خود ایک ناقابلِ معافی جسارت ہے۔

19 اپریل 2000

بدنام کتاب Satanic Verses کے مصنف سلمان رشدی آج کل ہندوستان میں ہیں۔ اس نسبت سے ان کی شخصیت اور ان کی کتاب کے بارے میں ہندوستان کے اخباروں میں رپورٹیں آرہی ہیں۔ دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ نے آج ٹیلی فون پر مجھ سے اس موضوع پر تبصرہ پوچھا۔ میں نے کہا کہ میں نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب شائع کی ہے۔ میں اسی معاملہ میں آیت اللہ خمینی کے فتویٰ کو غلط سمجھتا ہوں۔ اسلام میں یہ تعلیم نہیں دی گئی ہے کہ کوئی شخص گستاخی کرے تو اس کو قتل کر دو۔ میں نے کہا کہ سیٹنک ورسز ایک انتہائی لغو کتاب تھی اور اس کا صحیح جواب یہ تھا کہ اس کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جائے میں نے کہا کہ اس قسم کی چیزوں کے بارے میں اسلام کے خلیفہ ثانی عمر فاروق نے کہا ہے کہ: "أَمِيتُوا الْبَاطِلَ بِالصَّمْتِ عَنْهُ"۔ یعنی باطل کو ختم کرو اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرکے:

"Kill the falsehood by observing silence over it."

ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ کو حضرت عمر کا یہ قول بہت پسند آیا۔ اس نے کئی بار اس کو دہرایا۔ اصل یہ ہے کہ آج کا انسان تشدد سے نفرت کرتا ہے۔ اس کو صرف امن کی بات اچھی لگتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان جدید دور کے انسان کی اس نفسیات کو نہیں سمجھتے وہ مختلف انداز میں تشدد کی باتیں کرتے ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کو اسلام سے بیزار کر رہے ہیں۔

5 جون 2001

ایران کے صدر محمد خاتمی نے ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ سلمان رشدی کے خلاف قتل کے فتویٰ کے معاملہ کو اب ختم سمجھنا چاہیے۔ ایران حکومت کے سامنے ایسا کوئی منصوبہ نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ”رشدی کو قتل کرو“ کا نعرہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا متفقہ نعرہ تھا۔ مسلم دنیا میں مَیں اکیلا تھا، جس نے اس معاملہ میں اختلاف کیا اور اس کے خلاف ایک مستقل کتاب لکھی جو (زیرِ نظر کتاب کی صورت میں) ”شتم رسول کا مسئلہ“ کے نام سے چھپ چکی ہے۔ آج تمام دنیا کے مسلمان، بشمول ایران میری رائے پر آچکے ہیں۔ مگر لوگوں کے اندر یہ جرأت نہیں کہ وہ کھلے طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔

پانچواں باب

جدید ذہن اور اسلام

جدید ذہن (modern mind) کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس کو یہ نظر آتا ہے کہ اسلام کا قدیم ماڈل دورِ جدید کے ماحول سے ٹکرا رہا ہے۔ اس بنا پر اسلام بظاہر دورِ جدید کے لیے غیر موزوں (misfit) ہو گیا ہے۔

مثلاً ان کے خیال کے مطابق، اسلام اپنے قانون کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، جب کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جمہوریت (government of the people) کے اصول پر چلائی جاتی ہیں۔ اسلام اظہارِ خیال کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتا ہے، جب کہ جدید ذہن اظہارِ خیال کی آزادی کو غیر مشروط حق سمجھتا ہے۔ اسلام میں اجتماعی زندگی کے لیے جو شرعی قوانین ہیں، ان کو اسلام مقدس اور ناقابلِ تغیر سمجھتا ہے، جب کہ موجودہ زمانے میں کسی قانون کو اس معنی میں مقدس نہیں سمجھا جاتا۔ اسلام اپنے ماننے والے کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی الگ شناخت (identity) قائم کریں، جب کہ اس قسم کا نظریہ جدید دور میں ایک اجنبی نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام میں قومیت (nationhood) کو مذہب پر مبنی قرار دیا گیا ہے، جب کہ دورِ جدید میں عام طور پر مبنی بروطن قومیت (homeland-based nationality) کو تسلیم کرلیا گیا ہے، وغیرہ۔

اسلام کے بارے میں اس قسم کے تمام خیالات ایک غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ اور وہ ہے — اسلام اور مسلمانوں میں فرق نہ کرنا۔ وہ تمام چیزیں جن کی صداقت پر موجودہ زمانے میں شک کیا جاتا ہے، وہ سب کی سب مسلم ذہن کی پیداوار ہیں، وہ اسلام کی اصل تعلیم کا حصہ نہیں۔

یہ تمام چیزیں وہ ہیں، جن کو بعد کے زمانے میں مسلمانوں نے بطور خود اضافہ کر کے

اسلام کا لیبل لگا دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ تمام چیزیں حاشیۂ کتاب کا حصہ ہیں، نہ کہ متنِ کتاب کا حصہ۔ مثال کے طور پر، شتمِ رسول پر قتل کی سزا بعد کو مسلم فقہا نے وضع کیا، قرآن وسنت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ شتمِ رسول کے معاملہ میں اسلام کا اصول کیا ہے، وہ اگلے مضمون سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ہجر جمیل

قرآن کی سورہ المزمل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے:وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (73:10)۔اُردو مترجمین نے اس آیت کے جوترجمے کیے ہیں اُن میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1۔ اورسہتا رہ جو کہتے رہیں اور چھوڑ اُن کو بھلی طرح کا چھوڑنا (شاہ عبدالقادر)

2۔ اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اُن پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ۔ (اشرف علی تھانوی)

3۔ اورسہتا رہ جو کچھ وہ کہتے رہیں اور چھوڑ دے اُن کو بھلی طرح کا چھوڑنا۔ (محمود حسن، دیوبندی)

4۔ اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اُس پر صبر کر اور اُن کو خوبصورتی سے نظرانداز کر۔ (امین احسن اصلاحی)

اس آیت کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو وہ اس طرح ہوگا:

"Endure patiently whatever they say, and avoid them in a decent manner."

قرآن کی یہ آیت مکی دور میں اُتری۔ اُس وقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ رسول اور اصحاب رسول نے اُن کے آبائی دین سے انحراف کیا ہے۔ اس بنا پر وہ لوگ رسول اور اصحاب رسول کو ستانے لگے۔ اُنھوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ اس ماحول میں قرآن کی یہ آیت اُتری۔ اس میں خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا کہ تم لوگ صبر کرو اور ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کرو۔

ہجر جمیل کے لفظی معنیٰ ہیں، خوبصورتی کے ساتھ چھوڑنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ستانے والوں کے ساتھ حسنِ اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ ان کے معاملہ میں تمہارا طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مثبت ردعمل کا طریقہ ہونا چاہیے۔ تم کو چاہیے کہ اُن کے معاملہ میں درگزر کرو، اور اُن کے برے انداز کے مقابلہ میں تم اُن کے ساتھ اچھا انداز اختیار کرو۔

مفسرین نے عام طور پر یہ لکھا ہے کہ صبر اور ہجر جمیل کا یہ حکم آیات قتال کے نزول کے بعد منسوخ ہو گیا۔ مگر یہ ایک غلط تفسیر ہے۔ ہجر جمیل (حسن اعراض) کوئی مجبوری کا فعل نہیں ہے، یہ اہل ایمان کا ایک مثبت رویہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن منفی ردعمل کا تحمل نہیں کرسکتا۔ شکایت کی نفسیات شکر کے جذبہ کی قاتل ہے اس لیے مومن یک طرفہ طور پر شکایت کے جذبات کو ختم کرتا ہے تاکہ اُس کے اندر شکر کا جذبہ مجروح نہ ہونے پائے۔ اسی طرح نفرت کی نفسیات محبت کے جذبہ کی قاتل ہے اس لیے مومن نفرت کی نفسیات کو اپنے اندر پنپنے نہیں دیتا تاکہ اُس کے اندر محبتِ الٰہی کا جذبہ پوری طرح باقی رہے۔ اس کام کو کبھی سختی سے کرنا پڑتا ہے اور کبھی حسن تدبیر سے۔

ہجر جمیل (حسنِ اعراض) بظاہر دوسرے کے مقابلہ میں ہوتا ہے مگر اُس کا تعلق خود اپنی ذات سے ہے۔ مومن آخری حد تک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے اندر اعلیٰ اسلامی احساس ہمیشہ زندہ رہے۔ کسی بھی حال میں اُس کے اندر کمی (erosion) نہ ہونے پائے۔

قرآن کے مطابق، اللہ نے کسی انسان کے اندر دو دل نہیں بنائے (33:4)۔ یعنی انسان کے دل میں بیک وقت دو متضاد نفسیات پرورش نہیں پاسکتیں۔ جو دل انسان سے نفرت کرے، عین اُسی وقت وہ خدا سے محبت نہیں کرسکتا۔ جس دل کے اندر انسانوں کے بارے میں شکایات بھری ہوئی ہوں وہ دل کبھی خدا کے شکر سے سرشار نہیں ہوسکتا۔ جس آدمی کا سینہ انتقامی نفسیات کا جنگل بنا ہوا ہو، وہ خدا سے طلبِ عفو کی لذت کا تجربہ نہیں کرسکتا۔ جو

انسان ظلم کی یادوں میں جی رہا ہو، وہ خدائے رحمٰن ورحیم کی یادوں کا تجربہ نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر اور حسن اعراض مومن کے لیے ایک خود حفاظتی تدبیر ہے۔ یہ اپنے آپ کو اس سے بچانا ہے کہ اُس کے سینے میں غیر مومنانہ نفسیات کی پرورش ہونے لگے۔ اس لیے جب بھی ایسا کوئی موقع پیش آتا ہے تو مومن کہہ اُٹھتا ہے کہ میں اس قسم کی منفی سوچ کا تحمل نہیں کرسکتا۔ یہاں اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے رسول اور اصحاب رسول کی زندگی سے حسن اعراض کی کچھ عملی مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ ابن اسحق کی روایت ہے کہ قدیم مکہ کے قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے تھے اور سبّ وشتم کرتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے آپ کا نام محمد کے بجائے مذمّم رکھ دیا تھا۔ محمد کا مطلب ہے، تعریف کیا ہوا۔ اس کے بجائے وہ آپ کو مذمّم (مذمت کیا ہوا) کہتے تھے۔ روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا: ''أَلَا تَعْجَبُونَ لِمَا يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّي مِنْ أَذَى قُرَيْشٍ، يَسُبُّونَ وَيَهْجُونَ مُذْمَمًا، وَأَنَا مُحَمَّدٌ'' (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 356)۔ یعنی کیا تم کو تعجب نہیں کہ اللہ نے مجھے قریش کی اذیت سے کس طرح بچالیا، وہ سبّ وشتم کرتے ہیں اور مذمم کہہ کر ہجو کرتے ہیں، حالانکہ میں محمد ہوں۔

پیغمبر اسلام کے اس قول کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ مثلاً قریش اگر یہ کہیں کہ ''مذمّم مجنون ہے'' تو رسول اللہ اس کا بُرا اثر نہ لیتے ہوئے یہ کہہ دیں گے کہ تمہاری یہ بات اُس کے اوپر پڑے گی جس کا نام مذمّم ہو، میرا نام تو محمد ہے۔ یہ حسن اعراض کی ایک لطیف مثال ہے۔ اس طرح مومن اپنے آپ کو اس نقصان سے بچاتا ہے کہ کسی کی بدگوئی اُس کے اندر منفی نفسیات پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔ مومن کا قول یہ ہوتا ہے کہ میں منفی جذبات کا تحمل نہیں کرسکتا۔

اس طرح کے حسن اعراض کی ایک دلچسپ مثال ڈاکٹر ذاکر حسین (1897-1969) کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ایک بار وہ دہلی کی ایک سڑک پر اپنی گاڑی چلا رہے تھے، اتفاق سے اُن کی گاڑی ایک اور شخص کی گاڑی سے معمولی طور پر ٹکرا گئی۔ اُن کی گاڑی میں رگڑ (dent) آ گیا۔ اُس آدمی نے ابھی نئی گاڑی لی تھی۔ وہ گاڑی روک کر اُترا۔ ذاکر صاحب بھی اپنی گاڑی روک کر اُتر گئے۔ اُس آدمی نے ذاکر صاحب کی طرف غصہ سے دیکھتے ہوئے کہا کہ ایڈیٹ (idiot)۔ اس انگریزی لفظ کے معنیٰ ہوتے ہیں، احمق۔ ذاکر صاحب نے جوابی غصہ نہیں دکھایا۔ اُنھوں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا:

Sir, I am not Mr. Idiot, I am Zakir Husain.

جناب، میں مسٹر ایڈیٹ نہیں ہوں، میں ذاکر حسین ہوں۔ یہ سُن کر اُس آدمی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ساری (sorry) کہہ کر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی پر بیٹھا اور آگے کے لیے روانہ ہو گیا۔

2۔ ہجرت کے بعد حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اُس وقت حدیبیہ کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان ایک معاہدۂ امن تیار کیا گیا۔ اس معاہدہ کے وقت قریش نے ضد کا مظاہرہ بھی کیا اور تشدد کا مظاہرہ بھی۔ اُنھوں نے اصرار کیا کہ اُن کی یک طرفہ شرطوں پر معاہدہ کیا جائے۔ اصحاب رسول کو اس سے بے حد تکلیف ہوئی۔ اس طرح کی شرطوں پر معاہدہ کرنا اُن کو بظاہر ایک ذلت کا معاہدہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ: لَا تَدْعُونِي قُرَيْشٌ الْيَوْمَ إِلَى خُطَّةٍ يَسْأَلُونَنِي فِيهَا صِلَةَ الرَّحِمِ إِلَّا أَعْطَيْتُهُمْ إِيَّاهَا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 310)۔ یعنی قریش آج جو خاکہ بھی

پیش کریں گے، بشرطیکہ اُس میں صلہ رحمی کوملحوظ رکھا گیا ہو، میں ضرور اُس پر راضی ہوجاؤں گا۔دشمن کی یک طرفہ شرطوں کو ماننا ایک سخت نا گوار معاملہ تھا۔مگر آپ نے مذکورہ بات کہہ کراس نا گوار کوایک خوش گوار معاملہ بنالیا۔

پیغمبر اسلام کا یہ قول ہجر جمیل کی ایک حکیمانہ مثال ہے۔قدیم عربوں کے نزدیک صلہ رحمی بہت بڑی انسانی قدر سمجھی جاتی تھی۔اور قطع رحمی کو وہ بہت بُرا سمجھتے تھے۔اس لیے اس کا سوال ہی نہ تھا کہ وہ معاہدہ کے لیے ایسا خاکہ پیش کریں جس میں قطع رحم کی دفعہ رکھی گئی ہو۔باعتبارِ حقیقت رسول اللہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں ہر قیمت پر قریش سے صلح کرلوں گا۔اس بات کو کہنے کے باعزت طریقہ کے طور پرآپ نے فرمایا کہ میں قریش کی طرف سے صُلح کے ہر خاکہ کو منظور کرلوں گا بشرطیکہ اُس میں قطع رحم نہ پایا جاتا ہو۔حالانکہ پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ وہ قطع رحم کی شرط کبھی نہیں رکھیں گے۔

3۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو جلد ہی یہاں کے باشندوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہوگئی۔اُس وقت مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام عبد اللہ بن اُبی تھا۔وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا لیڈر تھا۔وہ بھی اگر چہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہو گیا۔مگر اُس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حسد کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ اکثر آپ کے خلاف شر انگیز باتیں کیا کرتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ کا ذکر مدینہ کے ایک مسلمان اُسید بن حضیر سے کیا۔اُنہوں نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: **يَارَسُولَ اللّٰهِ !اُرْفُقْ بِهِ.فَوَاللّٰهِ لَقَدْ جَاءَنَااللّٰهُ بِكَ،وَإِنَّالَنَنْظِمَ لَهُ الْخَرَزَ لنتوّجه.فَوَاللّٰهِ إِنَّهُ لَيَرَى أَنْ قَدْسَلَبْتَهُ مُلْكًا** (سیرت ابن ہشام، جلد2، صفحہ 292) یعنی اے خدا کے رسول، اُس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیجیے، خدا کی قسم، اللہ آپ کو ہمارے پاس لے آیا اور اُس کی قوم کے لوگ اُس کے لیے جواہر کا تاج

تیار کررہے تھے تاکہ وہ اُس کو بادشاہ بنائیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ نے اُس کا مقام اُس سے چھین لیا ہے۔

یہ حسن اعراض کی ایک حکیمانہ مثال ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ عبداللہ بن اُبی کی شرانگیزی کا جواب سختی کے ساتھ دیا جاتا۔ صحابی نے گویا اپنے جواب میں یہ بتایا کہ اس معاملہ میں سختی کی ضرورت نہیں۔ حسن اعراض ہی اس مسئلہ کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔

4۔ اوپر ہجر جمیل کی وہ مثالیں ہیں جو سطور میں ہوتی ہیں۔ اب ایک بین السطور کی مثال لیجیے۔ جب کسی معاملہ میں ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اُس میں ایک اور بات پوشیدہ ہوتی ہے جو اگرچہ زبان سے بولی نہیں جاتی مگر وہ حقیقی مطلوب کے طور پر اس میں شامل رہتی ہے۔ اس کی ایک مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔

حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہفتہ قیام فرمایا۔ اس دوران قریش نے مختلف قسم کی زیادتیاں کیں۔ مثلاً ایک صحابی کو تنہا پا کر اُنہیں تیر مار کر ہلاک کردیا۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ باجماعت نماز ادا کررہے تھے، اتنے میں قریش کے کچھ لوگ آئے اور آپ پر تیر برسانے لگے۔ اس طرح کی اشتعال انگیز صورت حال کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے دس سال کا امن معاہدہ کرلیا۔

اس معاہدہ کی دفعات حضرت عمر پر سخت ناگوار تھیں۔ وہ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا: **يَا أَبَا بَكْرٍ، أَلَيْسَ بِرَسُولِ اللَّهِ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: أَوَ لَسْنَا بِالْمُسْلِمِينَ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: أَوَ لَيْسُوا بِالْمُشْرِكِينَ؟ قَالَ: بَلَى، قَالَ: فَعَلَامَ نُعْطَى الدَّنِيَّةَ فِي دِينِنَا** (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 317)۔ یعنی اے ابوبکر، کیا محمد اللہ کے رسول نہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ کیا ہم مسلمان نہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا

کہ کیا وہ مشرک نہیں، اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ پھر ہم اپنے دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ روایات کے مطابق، حضرت عمر نے یہی بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کہی۔

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی زیادتیوں کے باوجود اُن کی یک طرفہ شرطوں پر دس سال کا جو امن معاہدہ کیا تھا، وہ ایک نہایت اہم اسلامی مصلحت کی بنا پر تھا۔ اور وہ مصلحت یہ تھی کہ دشمن سے معاہدۂ امن کر کے معتدل حالات پیدا کیے جائیں تا کہ اسلامی دعوت کا عمل مؤثر طور پر جاری ہو سکے۔ مگر یہ نصیحت نہ امن معاہدہ کے اندر لکھی گئی اور نہ حضرت عمر اور دوسرے صحابہ کی شدید ناگواری کے باوجود آپ نے حدیبیہ کے مقام پر اس کا اعلان کیا۔

یہ ہجر جمیل (حسن اعراض) کا دوسرا پہلو ہے۔ یہ دوسرا پہلو ہمیشہ مخفی حالت میں ہوتا ہے۔ اس پہلو کو لفظوں میں پانا ممکن نہیں۔ اگر اُس کو لفظوں میں لکھا یا بولا جائے تو اُس کی ساری معنویت ختم ہو جائے گی۔

ایسی حالت میں لوگوں کے لیے صرف دو میں سے ایک رویّہ درست ہے۔ یا تو وہ اتنا زیادہ ہوش مند ہوں کہ سطور کے اندر بین السطور کو پڑھ لیں۔ وہ اعلان کے بغیر اُس کی اہمیت کو دریافت کر لیں۔ جن لوگوں کے اندر اتنی ہوش مندی نہیں ہے اُن کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے لیڈر کی بصیرت پر اعتماد کریں۔ وہ صرف اعتماد اور حسن ظن کی بنا پر یہ عقیدہ رکھیں کہ اُن کے رہنما نے جو بات کہی ہے اُس کے پیچھے ضرور کوئی گہری مصلحت ہوگی۔ ہمارا کام اپنے رہنما کی اتباع کرنا ہے، نہ کہ اُس کی دیانت داری (integrity) پر شک کرنا۔

5۔ صُلح حدیبیہ بظاہر ایک ایسی صُلح تھی جو دشمن کے مقابلہ میں دب کر کی گئی۔ مگر اس کے اندر ایک غیر اعلان شدہ مقصد چھپا ہوا تھا اور وہ تھا — ٹکراؤ کو اَوائڈ کر کے اپنے لیے وقفۂ

تعمیر حاصل کرنا۔ اگر یہ بات معاہدہ کے متن میں لکھ دی جاتی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان اُسی وقت اس کا اعلان کر دیتے تو صلح کے مقاصد سرے سے فوت ہوجاتے۔ اس قسم کے مقاصد ہمیشہ اعلان کے بغیر ہوتے ہیں، نہ کہ اعلان کے ساتھ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ یہاں تک کہ بعد کو جب اس کا عملی نتیجہ ظاہر ہو گیا، اُس وقت لوگوں نے جانا کہ اس صلح کے اندر کتنی بڑی مصلحت چھپی ہوئی تھی۔

یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابوبکر صدیق نے بعد کے زمانہ میں ان الفاظ میں بیان کی:

مَا كَانَ فَتْحٌ فِي الْإِسْلَامِ أَعْظَمَ مِنْ فَتْحِ الْحُدَيْبِيَةِ، وَلَكِنَّ النَّاسَ يَوْمَئِذٍ قَصَرَ رَأْيُهُمْ عَمَّا كَانَ بَيْنَ مُحَمَّدٍ وَرَبِّهِ، وَالْعِبَادُ يَعْجَلُونَ، وَاللّٰهُ تبارك وتعالى لَا يَعْجَلُ كَعَجَلَةِ الْعِبَادِ حَتّٰى تَبْلُغَ الْأُمُورُ مَا أَرَادَ اللّٰهُ (مغازی الواقدی، جلد 2، صفحہ 610)۔ یعنی اسلام میں حدیبیہ کی فتح سب سے بڑی فتح تھی۔ لیکن معاہدہ کے دن لوگوں کو اس بات میں رائے قائم کرنے میں کوتاہی ہوئی جو محمد اور آپ کے رب کے درمیان تھا۔ انسان عجلت پسند ہے اور اللہ انسانوں کی طرح عجلت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ معاملہ وہاں تک پہنچ جائے جو اللہ چاہتا ہے۔

6۔ ہجر جمیل (حسن اعراض) سادہ طور پر محض ایک بچاؤ کی تدبیر نہیں، بلکہ وہ بامقصد انسان کی سوچی سمجھی ایک مستقل اخلاقی روش ہے۔ بامقصد انسان کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے، جہاں پہنچنا اُس کا سب سے بڑا کنسرن (concern) ہوتا ہے۔ اس لیے وہ راستہ کے ہر اُلجھاؤ سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے تاکہ وہ کسی رُکاوٹ کے بغیر اپنی آخری منزل تک پہنچ سکے۔

جیسا کہ معلوم ہے، قدیم مکہ کے لوگوں نے پیغمبر اسلام کو بہت زیادہ ستایا تھا۔ آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اتنا زیادہ تشدد کیا کہ آپ کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ چھوڑ دینا پڑا۔ اس ترک وطن کے بعد بھی وہ آپ کے خلاف مسلسل جارحیت کرتے رہے۔

آخر کار وہ وقت آیا جب کہ پیغمبر اسلام، اللہ کی مدد سے مکہ کے فاتح بن گئے۔ اب وقت تھا کہ ماضی کے ظلم کی اُنھیں سزا دی جائے۔ عام رواج کے مطابق، اُن کو قتل کر دینا عین جائز تھا۔ مگر پیغمبر اسلام نے اُن لوگوں کے ساتھ ہجر جمیل کی روش اختیار کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب قریش کے یہ مجرمین آپ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے اُن سے پوچھا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ اُنھوں نے کہا کہ: "أَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيمٍ" (آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں)۔

پیغمبر اسلام نے اس کے بعد فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ میں تمہارے بارے میں وہی کہوں گا جو پیغمبر یوسف نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:96)۔ یعنی، آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ: جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو۔ اس طرح آپ نے اُن تمام لوگوں کو آزاد کر دیا جو اس سے پہلے آپ کے خلاف کھلے دشمن بنے ہوئے تھے۔ (دیکھیے، السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 18275-76)

پیغمبر اسلام کا یہ عمل ایک بامقصد انسان کے عمل کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ پیغمبر اسلام کا مقصد یہ تھا کہ آپ بیت اللہ کو بتوں سے پاک کریں۔ مکہ کے لوگوں کو شرک سے نکال کر اُنھیں خدائے واحد کا پرستار بنائیں۔ اپنے دشمن انسان کو دوست انسان میں تبدیل کر کے توحید کی بنیاد پر وہ انقلاب لائیں جس کے لیے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔

پیغمبر اسلام کے یک طرفہ حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکّہ کے یہ تمام لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ راوی کہتے ہیں: فَخَرَجُوا كَأَنَّمَا نُشِرُوا مِنَ الْقُبُورِ فَدَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ۔ یعنی پھر وہ لوگ وہاں سے اس طرح نکلے جیسے کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ (دیکھیے، السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 18275-76)

پیغمبر اسلام اگر اس کے برعکس اُن دشمنوں سے اُن کی ظالمانہ روش کا انتقام لیتے تو اس کے بعد یہ ہوتا کہ وہاں انتقام در انتقام کا دور چل پڑتا۔ ایک انتقام کے بعد دوسرا انتقام شروع ہو جاتا اور پھر حالات ایسا منفی رُخ اختیار کر لیتے کہ سارا تعمیری منصوبہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔

غیر فطری ردعمل

جب کوئی خلاف مزاج بات پیش آئے تو اُس کے مقابلہ میں آدمی کی روش کی دو مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جذباتی ردعمل کا طریقہ، اور دوسرا غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ۔ جذباتی رد عمل عین وہی چیز ہے جس کو میڈیکل اصطلاح میں الرجی (allergy) کہا جاتا ہے۔ الرجی کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ الرجی نام ہے معتدل حالات میں غیر معتدل ردعمل کا۔

"Abnormal reaction to normal things."

مثلاً اپنے خلاف تنقید کو سُن کر غصہ ہونا، اس قسم کی ایک الرجی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کی کسی بات پر تنقید کرتا ہے تو اُس کا معتدل اور فطری ردعمل یہ ہے کہ آپ کھلے ذہن کے ساتھ اُس کو سنیں اور کھلے ذہن کے ساتھ اُس پر غور کریں۔ اگر تنقید غلط ہے تو آپ کو چاہیے کہ آپ دلیل کے ساتھ اُس کا جواب دیں اور اگر تنقید درست ہے تو سیدھی طرح اُس کو مان لیں۔ اس کے برعکس، تنقید کو سُن کر بگڑ جانا تنقید کا غیر معتدل اور غیر فطری انداز میں جواب دینا ہے۔ پہلی صورت مریضانہ ذہنیت کا ثبوت ہے اور دوسری صورت صحت مند ذہنیت کا ثبوت۔

اسی طرح مخالفانہ نعرہ کو سُن کر مشتعل ہو جانا، توہین کے کسی معاملہ پر بھڑک اُٹھنا، اپنے راستہ میں کوئی رکاوٹ دیکھ کر بگڑ جانا، اپنی سوچ کے خلاف سوچ کو برداشت نہ کرسکنا، یہ سب جذباتی ردِعمل کی صورتیں ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ دوسروں کے خلاف نفرت اور تشدد میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ زندگی کے مثبت اور تعمیری رخ کا تجربہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

اس کے برعکس، دوسرا طریقہ غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ ہے۔ اسی کو قرآن میں ہجر جمیل

کہا گیا ہے۔ یعنی جب اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات پیش آئے تو مشتعل نہ ہوکر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرنا، اور سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت معتدل انداز میں اس کا جواب دینا۔ اس معتدل جواب کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ سادہ طور پر بس اُس کو نظر انداز کردیا جائے۔ یعنی وہی رویہ جس کو عام زبان میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے — کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔

اسی طرح کبھی ہجر جمیل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مخالف گروہ کی بدعملی کا جواب خوش عملی سے دیا جائے۔ اس کے پست اخلاق کے مقابلہ میں برتر اخلاق کا طریقہ اختیار کرکے اس کو مغلوب کرلیا جائے۔ اسی طرح کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوسکتا ہے کہ دباؤ کی سیاست (pressure tactics) کا طریقہ اختیار کرکے اس کو خاموش ہونے پر مجبور کردیا جائے۔

ہجر جمیل کی کوئی ایک لگی بندھی صورت نہیں۔ حالات کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ تاہم جو صورت بھی اختیار کی جائے وہ سوچے سمجھے منصوبہ کی بنیاد پر ہوگی، نہ کہ بلا سوچے سمجھے ردعمل کی حیثیت سے۔ اس کا بنیادی مقصد اعراض کرنا ہوگا، نہ کہ اُلجھ جانا۔ وہ ہمیشہ امن کے اصول پر ہوگی، نہ کہ تشدد کے اصول پر۔ اس کے پیچھے کبھی بھی نفرت اور انتقام کا جذبہ نہیں ہوگا بلکہ صرف یہ جذبہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح حسن تدبیر کے ذریعہ معاملہ کو ٹال دیا جائے تاکہ زندگی کی گاڑی معمول کے مطابق اپنے مطلوب رُخ پر چلنے لگے۔

ہجر جمیل کا نشانہ خارجی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ آدمی کی خود اپنی ذات ہوتی ہے۔ ہجر جمیل کا نشانہ یہ نہیں ہوتا کہ خود مسئلہ کا خاتمہ کردیا جائے۔ اُس کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کو اپنے خلاف مسئلہ بننے سے روک دیا جائے۔

دعوت کے حدود

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (88:21-22)۔ یعنی، تم لوگوں کو نصیحت کرو، کیوں کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو۔ تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو۔

اسی طرح دوسرے مقام پر کہا گیا ہے:

مَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ (50:45)۔ یعنی، تم لوگوں کے اوپر زبردستی کرنے والے نہیں ہو، پس تم قرآن کے ذریعہ اس شخص کو نصیحت کرو جو میرے پیغام کو سننے کے لیے راضی ہو۔

حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے کسی صحابی کو کسی کام پر بھیجتے تو فرماتے:

بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا، وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1732)۔ یعنی، خوش خبری دو اور متنفر نہ کرو، آسانی پیدا کرو اور لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالو۔

اس طرح کی آیتیں اور حدیثیں گویا دعوت کے عمل کی حد بندی کررہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو ابلاغ کے دائرے میں رہ کر کام کرنا ہے، اس کو اجبار (زور زبردستی) کے دائرے میں داخل نہیں ہونا ہے۔ اس کے لیے یہ مناسب طریقہ ہے کہ وہ سمجھانے بجھانے کے تمام ذرائع کو استعمال کرے۔ مگر اس کو یہ حق نہیں کہ وہ دین کے نام پر دھرنا یا احتجاج، وغیرہ کا راستہ اختیار کر کے عام لوگوں کے لیے تکلیف کا سبب بنے (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 2629)۔ مثال کے طور پر شتم رسول کو لیجیے۔ شتم رسول کا واقعہ پیش

آنے پر مسلمانوں کا مروجہ احتجاجی ردعمل اسلامی تعلیمات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ یہاں ایک داعی کو یہ کرنا ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ پیغمبر اسلام کی سیرت اوران کے پیغام کولوگوں کے سامنے پیش کرے۔ "شتم رسول" کا واقعہ آپ کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے پیغمبر کی تعلیمات کو پرامن انداز میں پیش کریں۔

لیکن اگر کچھ لوگ "اینٹی شتم رسول مہم" چلائیں۔ وہ شتم رسول کے خلاف سڑکوں پر دھرنا دیں، مفروضہ شاتم کا پتلا (effigy) بنا کراس کو جلائیں اور دکانوں کو بند کرائیں، وغیرہ تو اس قسم کی مہم درست نہ ہوگی۔ یہ گویا ابلاغ کی حد کو پار کرکے اجبار کی حد میں داخل ہونا ہے۔ ایسا طریقہ عام انسانوں کو اللہ اوراس کے دین سے دور کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس قسم کی "اینٹی" مہم چلانا گویا دعوتی مواقع کو قتل کرنا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تخریب کاری ہے، نہ کہ دین کی خدمت۔

کارٹون

ڈنمارک کے ایک مقامی اخبار (Jyllands-Posten) میں 30 ستمبر 2005 چھپنے والے کارٹون کو مسلمانوں نے جس طرح توہینِ رسول کا مسئلہ بنایا اور اُس پر شدید ہنگامے کیے، اُس کا کوئی بھی تعلق، اسلام سے نہ تھا۔ مذکورہ کارٹون کی حیثیت تو صرف ایک صحافتی جوک (joke) کی تھی۔ اِس قسم کا جوک موجودہ صحافت میں عام ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اِس کے ردعمل میں جس طرح نفرت اور تشدد کا مظاہرہ کیا، وہ بلاشبہ توہینِ رسول کا ایک فعل تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ کے زمانے میں بار بار اِس نوعیت کے واقعات ہوئے ہیں، لیکن آپ نے ان کے مقابلے میں صرف ایک روش کا اظہار کیا، اور وہ اِن واقعات کو نظر انداز کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے ڈنمارک کے کارٹون کا واقعہ پیش آنے کے بعد ایک آرٹکل لکھا تھا، جو اُسی زمانے میں درج ذیل عنوان کے تحت چھپا:

"Ignore Cartoons."

پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ ہر اُس اقدام سے بچو جس سے اسلام کی امیج خراب ہوتی ہو۔ موجودہ زمانہ فریڈم آف ایکسپریشن کا زمانہ ہے۔ ایسے زمانے میں کارٹون جیسے مسئلہ پر ہنگامہ کھڑا کرنا، یقینی طور پر یہ تاثر پیدا کرے گا کہ اسلام آزادیِ اظہارِ رائے کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں کارٹون جیسے مسائل پر ہنگامہ آرائی کرنا کسی بھی عذر کی بنا پر جائز نہیں ہوسکتا۔ اگر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں، تب بھی

اُنھیں کامل اعراض سے کام لینا چاہیے۔ جذبات کا مجروح ہونا، اُن کے لیے اِس معاملے میں کوئی عذر نہیں بن سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسوۂ محمدی میں سب وشتم پر مشتعل ہونا نہیں ہے، اور نہ شاتم کو قتل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ بلکہ سب وشتم سے اعراض کرتے ہوئے شاتم کی غلط فہمی کو دور کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شتم رسول کا کیس غلط فہمی کا کیس ہے۔ یہ ڈائلاگ کی سطح پر تصفیہ کا معاملہ ہے، نہ کہ قانونی سزا کا معاملہ۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ گفت وشنید کے ذریعہ اس انسان کی سوچ میں تبدیلی لائی جائے۔ انسانی سوچ کو بدلے بغیر شتم رسول کے مسئلہ کا کوئی بھی حل ممکن نہیں۔

پیغمبر کے نام پر غیر پیغمبرانہ روش

24-20 جنوری 2012 کے دوران راجستھان میں جے پور لٹریچر فیسٹول (Jaipur Literature Festival) ہوا۔ یہ ایک انٹرنیشنل فیسٹول تھا۔ اِس میں مختلف ملکوں کے آرٹسٹ اور اہلِ علم بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اِس فیسٹول میں سلمان رشدی (مقیم لندن) کو بھی بلایا گیا تھا، مگر انڈیا کی مسلم تنظیموں نے اِس کے خلاف شدید احتجاج کیا اور یہ مانگ کی کہ رشدی انڈیا میں نہ آنے پائیں، کیوں کہ انھوں نے اپنی کتاب (Satanic Verses) میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے۔ حکومتِ ہند نے سیاسی مصالح کے تحت، مسلمانوں کے اِس مطالبے کو مان لیا اور سلمان رشدی کے دورۂ ہند کو منسوخ کردیا گیا۔ ہندستان کے مسلمانوں نے یہ مطالبہ بہ ظاہر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کیا تھا، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ پیغمبر اسلام کے اُسوہ (model) کی نفی تھا۔ یہ بظاہر فتح، اپنے نتیجے کے اعتبار سے، صرف بدترین شکست کے ہم معنٰی تھی۔ اِس طرح کے معاملے میں پیغمبر اسلام کا اسوہ یہ ہے کہ اس کو غیر جذباتی انداز میں دیکھا جائے، مسئلہ (problem) کو نظر انداز کرتے ہوئے موقع (opportunity) کو استعمال (avail) کیا جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں کعبہ میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ یہ بلا شبہ ایک مسئلہ تھا، لیکن اِسی کے ساتھ اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اِنھیں بتوں کی وجہ سے بڑی تعداد میں وہاں مشرک زائرین آتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے کعبہ میں بتوں کی موجودگی کو نظر انداز کیا اور مشرک زائرین کے سامنے قرآن کا پیغام پیش کیا۔ جے پور لٹریچر فیسٹول کے موقع پر مسلمانوں کو یہی کام کرنا تھا۔ اِس فیسٹول میں ہندستانی اور غیر ہندستانی لوگ بڑی تعداد میں شریک ہورہے تھے۔ مسلمانوں کو یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ

فیسٹول کے ناخوشگوار پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو ایک موقع دعوت (Dawah opportunity) کے طور پر استعمال کریں۔ وہ وہاں اپنا اسٹال لگائیں اور لوگوں کو قرآن کا ترجمہ اور دوسری اسلامی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ یہی اِس معاملے میں پیغمبرِ اسلام کا نمونہ ہے۔

اعراض کی ضرورت

جس طرح تصویر جدید صحافت کا ایک حصہ ہے، اسی طرح کارٹون بھی جدید صحافت کا ایک حصہ ہے۔تصویر اور کارٹون دونوں کا مقصد ایک ہے— صحافت کو قارئین کے لیے دلچسپ بنانا۔ کارٹون کا مقصد نہ کسی کی تعریف ہوتی ہے اور نہ کسی کی توہین۔ وہ اخبار کا صرف ایک تفنّن آمیز جُز (comic item) ہوتا ہے۔سنجیدہ آدمی کارٹون کو دیکھ کر اس سے محظوظ ہوگا یا وہ سادہ طور پر اس کو نظر انداز کر دے گا۔

ڈنمارک کے ایک اخبار شیلاندس پوستین (Jyllands-Posten) میں 30 ستمبر 2005 کو ایک مضمون کے تحت، ایک کارٹون چھپا۔ اس کارٹون میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خاکہ بنایا گیا تھا، اور آپ کے سر پر ایک پگڑی دکھائی گئی تھی جس کی بناوٹ بم کی مانند تھی۔ اس کارٹون کی خبر جب مسلم دنیا تک پہنچی تو تمام مسلمان اس پر برہم ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے توڑ پھوڑ شروع کردی۔ کچھ لوگوں نے تقریر اور تحریر میں اس کے خلاف احتجاج کیا۔ میرے علم کے مطابق، ساری مسلم دنیا میں غالباً کوئی شخص نہیں تھا جو مسلمانوں کے اِس منفی ردّعمل کی کُھلی مذمت کرے۔ قابلِ اعتراض کارٹون کی مذمت کرنا اور منفی احتجاج کی مذمت نہ کرنا بلاشبہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

کارٹون کے خلاف اِس منفی ردّعمل کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا گیا کہ وہ پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کی مہم کے تحت کیا گیا ہے اور اِس قسم کی مہم ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ مگر یہ سوچ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، اِس طرح کے معاملے میں صحیح سوچ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس کا اصل سبب کیا ہے، اور اصل سبب کی نسبت سے اپنے ردّعمل کا تعیّن کیا جائے۔ غور کیجیے تو اِس قسم کے کارٹون کو وجود میں لانے کے ذمّے دار

خود مسلمان ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے اندر ذاتی احتساب (introspection) کا ذہن اُبھرنا چاہیے، نہ کہ دوسروں کے خلاف احتجاج و مظاہرہ کا ذہن۔

عربی مثل ہے کہ ''تُعرَفُ الأَشْيَاءُ بِأَضْدَادِهَا'' (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں)۔ اس اصول کو اِس معاملے میں استعمال کرکے دیکھیے۔ دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب ہیں۔ ہر مذہب کے مقدس پیشوا ہیں۔ مگر اِن پیشواؤں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا کہ ان کے سر پر بم رکھا ہوا دکھایا جائے۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ اس قسم کا معاملہ پیش آیا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان لمبے عرصے سے اسلام کے نام پر جگہ جگہ تشدد کررہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی تشدد میں ملوّث ہیں۔ مثلاً آئرلینڈ میں عیسائی، آسام میں ہندو، سری لنکا میں بدھسٹ وغیرہ۔ مگر فرق یہ ہے کہ دوسرے مذہب کے لوگ اپنا متشددانہ عمل اپنے قومی مفاد کے نام پر کرتے ہیں، جب کہ مسلمان اپنے متشددانہ عمل کو اسلامی جہاد کے نام پر کرتے ہیں۔

ایسی حالت میں یہ ایک فطری بات ہے کہ دوسری قوموں کا متشددانہ عمل ان کی اپنی قوم کی طرف منسوب کیا جائے، اور مسلمانوں کا متشددانہ عمل ان کے مذہب کی طرف منسوب ہو اور مذہبِ اسلام کی بدنامی کا سبب بنے۔ اس اعتبار سے غور کیجیے تو مذکورہ اخباری کارٹون کو دیکھنے کے بعد مسلمانوں کے اندر ذاتی احتساب کا جذبہ اُبھرنا چاہیے تھا۔ وہ کہتے کہ ہم نے خود اپنی روش کے ذریعے دنیا کو یہ تاثر دیا ہے کہ پیغمبر اسلام کا مذہب، تشدد کا مذہب ہے۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم اسلام کے نام پر کیے جانے والے تشدد کو مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ یا اگر تشدد کرنا ہے تو اس کو اسلام کے نام پر نہ کریں، جیسا کہ دوسرے مذاہب کو ماننے والے کررہے ہیں۔

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کے لیے قرآن میں صبر اور اعراض

کے الفاظ آئے ہیں۔ صبر اوراعراض، تشدد کے برعکس رویّے کا نام ہے۔ تشدد یہ ہے کہ کوئی بات جو آپ کو ناگوار معلوم ہو اس پر مشتعل ہوجانا، اور احتجاج یا تخریب کاری کی صورت میں اپنے انتقامی جذبے کا اظہار کرنا۔ اس کے برعکس، صبر واعراض یہ ہے کہ ناخوش گوار باتوں کا سامنا تحمل کے ساتھ کیا جائے۔ اپنے آپ کو منفی کارروائیوں سے بچایا جائے تا کہ اپنے مقصد کی طرف مثبت سفر کو جاری رکھا جا سکے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں فطری طور پر ایسا ہوگا کہ بہت سے لوگ اپنی آزادی کا غلط استعمال کریں گے۔ جس سے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ لیکن یہ صورت حال کسی فرد یا قوم کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کا نتیجہ ہے۔ خدا نے لوگوں کو جب امتحان کے لیے آزادی دی ہے تو ضرور ایسا ہوگا کہ لوگ اپنی آزادی کا غلط استعمال کریں۔ خدا جب تک لوگوں کی آزادی کو منسوخ نہ کرے اس کا غلط استعمال بھی بہر حال جاری رہے گا۔

ایسی حالت میں ناخوش گوار واقعات پر مشتعل ہونا، کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی خدا کے تخلیقی نقشے پر راضی نہیں۔ خدا کی قائم کردہ دنیا اس کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک اور دنیا ہو جو اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہو۔ مگر ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ انسان اپنی پسند کی ایک اور دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس لیے اس پر لازم ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی نقشے کو مان کر اس کے تحت، اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جس طرح دوسری باتوں کے نمونے موجود ہیں، اسی طرح مذکورہ صورت حال میں بھی آپ کی زندگی میں ہمارے لیے نمونہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق، قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مُذَمَّم (قابلِ مذمّت) رکھا تھا۔ پھر وہ آپ پر سبّ وشتم کرتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے تھے کہ کیا تم کو اِس پر تعجب نہیں کہ اللہ نے مجھ کو قریش کی ایذا رسانی سے بچا لیا۔ وہ مجھ کو مذمم کہہ کر میرا سب وشتم کرتے ہیں اور میری ہجو کرتے ہیں، حالاں کہ میں محمد (قابل تعریف) ہوں۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 356) یعنی اُن کی باتیں میرے اوپر پڑنے والی نہیں۔ یہ لوگ مذمم پر سب وشتم کررہے ہیں جب کہ میرا نام محمد ہے، نہ کہ مذمّم۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس نمونے کی روشنی میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ مسلمان جب مذکورہ کارٹون کو دیکھیں تو وہ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کردیں کہ پیغمبر اسلام تو بم بردار نہیں تھے بلکہ وہ امن بردار تھے۔ اس لیے یہ کارٹون پیغمبر اسلام سے متعلق نہیں ہوسکتا۔ وہ کسی اور انسان سے متعلق مانا جائے گا جو بم بردار ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے معاملے میں دیکھنے کی اصل بات یہ نہیں ہے کہ ہمارے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ بلکہ دیکھنے کی اصل بات یہ ہے کہ اگر ہم نے اقدام کیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ جیسا کہ معلوم ہے، جب سے پریس کا زمانہ آیا ہے اِس طرح کے معاملات بار بار پیش آتے ہیں۔ ہر بار مسلمان اس پر سخت برہمی کا ظہار کرتے ہیں۔ حتی کہ وہ توڑ پھوڑ اور تشدد کا طریقہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ نتیجہ ہمیشہ برعکس صورت میں نکلتا ہے۔ یعنی اخباروں یا کتابوں میں مسلم نقطۂ نظر سے ناخوش گوار باتوں کا چھپنا تو بند نہیں ہوتا، البتہ اسلام شدید طور پر بدنام ہوجاتا ہے، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی فضا بگڑ جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان وہ معتدل ماحول باقی نہیں رہتا جو کسی مثبت کام کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر دعوتی کام کے اعتبار سے دیکھیے تو اس طرح کا منفی ردّعمل، قاتلِ دعوت کی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ زمانے میں اخباروں اور کتابوں میں برابر ایسی چیزیں چھپتی رہتی ہیں جو اسلام

کی تصویر کو بگاڑنے والی ہوتی ہیں۔ اس کا صحیح جواب یہ نہیں ہے کہ اس کے خلاف مظاہرے کیے جائیں۔ بلکہ اس کا صحیح اور مؤثر جواب یہ ہے کہ ایسی کتابیں تیار کرکے چھاپی جائیں جو ہر اعتبار سے نہایت اعلیٰ معیار کی ہوں۔ ان میں ایسے دلائل کے ذریعے اسلام کی مثبت تصویر کو پیش کیا جائے جو لوگوں کے ذہنوں کو مطمئن کرنے والے ہوں، اور لوگوں کے دلوں میں اُتر جائیں۔

موجودہ صورتِ حال میں اسلام کی نسبت سے، سب سے بڑا مسئلہ وہ ہے جس کو امیج بلڈنگ (image building) کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام کے خلاف غلط فہمیوں کو دور کرنا اور اسلام کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے لانا۔ یہی کرنے کا اصل کام ہے، اور کرنے والوں کو یہی کام کرنا چاہیے— ''لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ''۔ (37:61) یعنی، اسی طرح عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

کارٹون کا مسئلہ

شمالی یورپ کا ایک علاقہ ہے جس کو اسکینڈی نیویا کہتے ہیں۔ اِس علاقے میں چار ممالک واقع ہیں — سویڈن، ناروے، فِن لینڈ اور ڈنمارک (Denmark)۔ یہاں کی آبادی میں تقریباً 2 لاکھ مسلمان ہیں۔ اسکینڈی نیویا یورپ کا ایک پُرامن خطّہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ مگر پچھلے چند مہینوں سے وہ بر عکس انداز میں، میڈیا میں نمایاں ہو رہا ہے۔

ڈنمارک میں ڈینش (Danish) زبان لکھی اور بولی جاتی ہے۔ ایک ڈینش اخبار شیلاندس پوستین (Jyllands-Posten) کے شمارہ 30 ستمبر 2005 میں ایک کارٹون چھپا۔ کارٹون، جدید صحافت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ کارٹون کا مقصد نہ تعریف ہے اور نہ توہین۔ کارٹون دراصل صحافت کا ایک تفنّن آمیز جُز (Comic item) ہے۔ چنانچہ عام طور پر لوگ کارٹون کو دیکھ کر یا تو اس سے محظوظ ہوتے ہیں یا سادہ طور پر اس کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

تاہم ڈنمارک کے اخبار کا مذکورہ کارٹون مسلمانوں کے لیے سخت قابلِ اعتراض ثابت ہوا۔ قصہ یہ تھا کہ اِس اخبار میں ایک مضمون کے تحت کچھ کارٹون شامل کیے گئے۔ اِن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ مثلاً ایک کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے ہاتھ میں ایک چھری لیے ہوئے ہیں اور آپ کے سر پر ایک پگڑی ہے جس کے اوپر بم رکھا ہوا ہے۔

اِس کارٹون کی خبر جب عام ہوئی تو ہر جگہ کے مسلمان اُس کو دیکھ کر یا اس کو سُن کر مشتعل ہو گئے۔ ان کے نزدیک یہ کارٹون پیغمبر اسلام کی توہین کے ہم معنیٰ تھا۔ جو کہ مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت حد تک قابلِ اعتراض ہے۔

چنانچہ ساری دنیا میں مسلمانوں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ بڑے بڑے جلوس نکالے گئے۔ ڈنمارک کے سفارت خانوں میں آتش زنی اور توڑ پھوڑ ہوئی۔ اِن پُر شور مظاہروں میں کئی افراد مارے گئے اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں یہ مظاہرے اتنے بڑھے کہ حکومتوں کے لیے ان پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اِس کے نتیجے میں جو ناخوش گوار واقعات پیش آئے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ کئی عرب ممالک نے ڈنمارک سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لیے اور اس سے اپنی تجارت منقطع کر دی۔

ڈنمارک، ڈیری صنعتوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کی ڈیری صنعت کا تقریباً 25 فیصد سامان عرب ممالک اور دیگر مسلم ممالک میں جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈنمارک کی کئی فیکٹریاں بند ہو گئیں اور بھاری تجارتی نقصان کی صورت میں ڈنمارک کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کے نتیجے میں ڈنمارک کو روزانہ ایک ملین ڈالر کا نقصان ہونے لگا۔

اِس معاملے میں ڈنمارک اور دوسرے مغربی ملکوں کا موقف یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے مطابق، آزادیِ اظہار انسان کا ناقابلِ تنسیخ حق ہے، اور مذکورہ کارٹون اِسی حق کا ایک استعمال تھا۔ اِس لیے ڈنمارک کے اخبار میں مذکورہ کارٹون کی اشاعت ان کے نزدیک کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق، مسلم جذبات کے لیے وہ ایک قابلِ اعتراض چیز ہو سکتی ہے لیکن ڈنمارک کے لوگوں کے نزدیک وہ صرف اپنی آزادی کا ایک استعمال تھا، اور مُلکی قانون کے مطابق، وہ آزادی کے اِس استعمال کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اجتماعی معاملات میں سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک، یہ کہ آئیڈیل کیا ہے، اور دوسرے یہ کہ پریکٹکل طور پر کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں۔ اِس معاملے میں اہلِ ڈنمارک کا جواب آئیڈیل کے اعتبار سے بظاہر درست ہو سکتا ہے، لیکن پریکٹکل کے اعتبار سے دیکھیے تو وہ بالکل نادرست قرار پائے گا۔ آزادی کا استعمال ایک فرد اپنے کمرے میں کرے تو اُس

سے کوئی اجتماعی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جب وہ اپنی آزادی کا استعمال اجتماعی زندگی میں کرے تو یقینی طور پر مسائل پیدا ہوں گے۔ ایسی حالت میں فرد کو یہ سوچنا چاہیے کہ کیا وہ اُن منفی نتائج کا تحمل کرسکتا ہے جو آزادی کے لامحدود استعمال کی صورت میں اس کے لیے پیدا ہوں گے۔

استعمالِ آزادی کے اِسی پہلو کو لے کر امریکا کے پروفیسر اسکنر (Skinner) نے کہا تھا کہ لامحدود آزادی کا تصور نہایت خطرناک ہے، ہم ایسی آزادی کا تحمّل نہیں کرسکتے:

"We can't afford such a freedom."

ڈنمارک کے لوگ روایتی طور پر امن پسند لوگ ہیں، وہ مادّی خوش حالی میں یقین رکھتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ڈنمارک کے لوگ یہ نادانی کریں گے کہ وہ اِس حد تک نظریہ پرست بن جائیں گے کہ وہ اپنی آزادی کا لامحدود استعمال کرتے رہیں، خواہ اس کے نتیجے میں ان کے بین اقوامی تعلقات خراب ہوں، ان کی فیکٹریاں بند ہوجائیں۔ ان کو ناقابلِ تلافی حد تک تجارتی نقصان کا سامنا کرنا پڑے۔ یقیناً اب وہ اِس معاملے میں اپنی پالیسی کو بدلیں گے۔ مگر فارسی شاعر کے مطابق، آدمی ایسا کام کیوں کرے جس کا نتیجہ شرمندگی ہو: کُجا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔

اِس معاملے میں مسلمانوں کو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق، احتسابِ خویش (introspection) سے کام لینا چاہیے۔ مسلمانوں کو بھی اِس معاملے میں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہ سوچنا چاہیے کہ اِس طرح کے معاملے میں صحیح ردّعمل کیا ہے اور نتیجہ خیز (result-oriented) تدبیر کیا ہوسکتی ہے۔

اسلامی طرزِ فکر کے مطابق، سوچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو صرف "سازش" کی اصطلاح میں نہ سوچا جائے بلکہ زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں اس کو سمجھنے کی کوشش کی

جائے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مذکورہ کارٹونسٹ نے جس تصور کو اپنے خاکے میں پیش کیا وہ تصور اس کو کہاں سے ملا۔ اگر غیر جذباتی انداز میں سوچا جائے تو خود مسلمان بھی اس میں یکساں طور پر شریک نظر آئیں گے۔

مثلاً کارٹونسٹ نے اپنے کارٹون میں دکھایا تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے ہاتھ میں ایک چھری لیے ہوئے ہیں۔ بے لاگ انداز میں غور کیجیے تو کارٹونسٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ کو یہ تصوّر مسلم شاعر ڈاکٹر محمد اقبال سے ملا۔ اقبال نے خود اپنے ایک شعر میں پیغمبر اسلام کے ماننے والوں کی تصویر اِن الفاظ میں پیش کی ہے:

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا

اقبال کے اِس مصرعے کا انگریزی ترجمہ مسٹر خوشونت سنگھ نے اِن الفاظ میں کیا ہے:

To every vein of falsehood, every Muslim was a knife.

اسی طرح ڈنمارک کا کارٹونسٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو ماننے والے خود یہ کررہے ہیں کہ اپنے جسم پر بم باندھ کر وہ اجتماعی مقامات پر جاتے ہیں اور دھماکہ کرکے وہاں بہت سے لوگوں کو ہلاک کردیتے ہیں۔ میں نے اپنے کارٹون میں صرف یہ کیا تھا کہ بم کو جسم پر باندھنے کے بجائے اس کو سر کے اوپر رکھ دیا— ظاہر ہے کہ اس بات کا مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا جواب نہ ہوگا جو مذکورہ کارٹونسٹ کو مطمئن کرسکے۔

اسلام کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ مسلمان ایسا کوئی کام نہ کریں جو دوسروں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ ہم تو وہی کررہے ہیں جس کا نمونہ ہم کو تمہاری اپنی زندگی میں ملا تھا (ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند)۔ مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص ان کی پرتشدد تصویر نہ بنائے تو خود ان کو بھی اپنے آپ کو پرتشدد اعمال سے بچانا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ مسلمان ایک پرتشدد عمل کریں اور میڈیا میں جب اس کی خبر آئے تو اس کے عنوان میں تشدد

کے بجائے امن لکھا ہوا ہو۔

اسی طرح اسلام اور عقل دونوں کے اعتبار سے وہی عمل صحیح عمل ہے جو اپنے انجام کے اعتبار سے مثبت نتیجے کا حامل ہو۔ ایسا اقدام جو اپنے نتیجے کے اعتبار سے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہو، وہ نہ اسلام کے اعتبار سے درست ہے اور نہ عقل کے اعتبار سے۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھیے تو اقدام کا نتیجہ برعکس صورت میں برآمد ہوا ہے۔ یعنی اسلام لوگوں کی نظر میں ایک ایسا مذہب بن گیا ہے جو آزادی کے خلاف ہے اور اپنے پیروؤں کو تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ یہ اسلام کی صحیح تصویر نہیں۔ پیغمبر اسلام کے زمانے میں مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام عبداللہ بن اُبی تھا۔ وہ اسلام، پیغمبر اسلام اور اہلِ بیتِ رسول کے خلاف سخت سازشوں کی بنا پر اس قابل ہو چکا تھا کہ اس کو قتل کر دیا جائے مگر پیغمبر اسلام نے قصداً اس کو قتل نہیں کیا اور فرمایا کہ موجودہ حالات میں اس کا قتل اسلام کی بدنامی کا سبب بن جائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج اس اصول کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ کیوں کہ پہلے بدنامی کی خبر صرف زبانی طور پر پھیل سکتی تھی مگر آج ایسی خبر پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے دور میں بجلی کی رفتار سے پھیلتی ہے۔

اس معاملے میں احتجاجات کا نتیجہ عملاً صرف معکوس صورت میں برآمد ہوا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ 30 ستمبر 2005 کو جب یہ کارٹون ڈنمارک کے اخبار میں چھپا تو بہت تھوڑے لوگوں نے اس کو دیکھا تھا۔ مگر اس کے خلاف مسلمانوں کے پرشور احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کارٹون انٹرنٹ پر آ گیا۔ اور ساری دنیا میں کروڑوں لوگ اس توہین آمیز کارٹون کو انٹرنٹ پر دیکھنے لگے۔

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو اعراض (avoidance) کہا جاتا

ہے۔ اعراض کا مطلب کسی ناپسندیدہ صورت حال میں، ہجرِ جمیل کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ یعنی اعلیٰ ظرفی کا وہی طریقہ جس کو تمثیل کی زبان میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے

اس معاملے میں پیغمبر اسلام کی زندگی میں ایک انوکھا نمونہ پایا جاتا ہے۔ ابن اسحاق نے ایک روایت میں بتایا ہے کہ قدیم مکہ میں عرب کے مخالفین، پیغمبر اسلام کو مذمّم یعنی مذمت کیا ہوا (condemned person) کہتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ کے سامنے آ کر آپ کو مذمم کہتا تو آپ اس کا کوئی جواب نہ دیتے بلکہ سادہ طور پر یہ فرماتے کہ ان لوگوں کو دیکھو، یہ مجھ کو مذمم بتا کر مجھ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ حالانکہ میرا نام تو محمد (قابلِ تعریف) ہے، (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 356)۔ یعنی ان کی بری باتیں اس شخص پر پڑیں گی جس کا نام مذمم ہو، وہ مجھ پر پڑنے والی نہیں، کیوں کہ میرا نام تو محمد ہے، مذمّم نہیں۔

موجودہ زمانے کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ اگر آدمی امن کے دائرے میں رہے تو وہ اپنے کسی بھی نظریے کو بلا روک ٹوک پیش کرسکتا ہے۔ البتہ تشدد کا طریقہ اختیار کرتے ہی اس کی آزادی ختم ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر تحریک پر امن دائرے میں رہ کر چلائیں تاکہ کوئی شخص ان کے خلاف بولنے کا موقع نہ پا سکے، خواہ کارٹون کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سختی کے ساتھ اپنی جدو جہد کو پر امن طریق کار کا پابند رہتے ہوئے چلائیں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس اہم اصول کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھیں۔ وہ اپنی تحریکوں کو اس بین اقوامی اصول کے مطابق چلائیں۔ اس کے بعد ان کی تحریک زیادہ مؤثر ہوگی اور مزید یہ کہ اسلام اور مسلمان دونوں بدنام ہونے سے بھی بچ جائیں گے۔

بے فائدہ عمل

امریکا کی ایک کمپنی نے ایک فلم بنائی۔ اِس فلم کا نام تھا— مسلمانوں کی معصومیت (Innocence of Muslims)۔ ستمبر 2012 میں اِس فلم کا ایک مختصر حصہ انٹرنیٹ پر ڈال دیا گیا۔ کچھ مسلمانوں نے اس کو دیکھا۔ پھر مسلمانوں کے درمیان بڑے پیمانے پر اس کا چرچا ہوا۔ مسلمانوں نے کہا کہ اِس فلم میں پیغمبر اسلام کی توہین کی گئی ہے۔ اِس پر ساری دنیا کے مسلمان بھڑک اٹھے اور مختلف ملکوں میں وہ اس فلم کے خلاف پرشور مظاہرے کرنے لگے۔ اِن مظاہروں کے درمیان جان ومال کا شدید نقصان ہوا۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (14 ستمبر 2012) میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اِس رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے — حقیقت یہ ہے کہ کچھ ہی لوگوں نے اِس فلم کو چند منٹ سے زیادہ دیکھا ہوگا، اور یہ امر سخت مشتبہ ہے کہ یہ فلم کبھی مکمل کی جاتی۔ لیکن اس کا تھوڑا سا حصہ جو آن لائن کیا گیا، اس میں اتنا بھونڈا پن اور مصنوعیت ہے کہ کوئی بھی اس کو سنجیدگی سے نہ لیتا، مگر مسلمانوں کے مظاہروں نے اس فلم کو عالمی طور پر شہرت دے دی:

> "In fact, few people have seen more than a few minutes of the film, and there are doubts if it was even completed. But the little that is online is so crude and contrived that it was not even taken seriously till Islamist mobs made it world-famous." (p. 26)

اِس طرح کے فتنے کو قرآن میں شجرِ خبیثہ (14:26) کہا گیا ہے، یعنی وہ فتنہ جو اپنے آپ مرجانے والا ہو۔ ایسے فتنے کے بارے میں دانش مندی یہ ہے کہ اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ جو فتنہ اپنے آپ مرجانے والا ہو، اس کو مارنے کی کیا ضرورت۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمان بار بار اِس قسم کی بے دانشی کا شکار ہورہے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو حضرت عمر فاروق نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا: "**أَمِيتُوا الْبَاطِلَ بِالصَّمْتِ عَنْهُ**" (دیکھیے، حلیۃ الاولیا، جلد 1، صفحہ 55)۔ یعنی باطل کو ہلاک کرو اُس کے بارے میں چپ رہ کر۔

جذباتی ہنگامہ آرائی

ستمبر 2012 میں امریکا میں ایک فلم بنائی گئی۔ اِس فلم کا نام تھا — مسلمانوں کی معصومیت (Innocence of Muslims)۔ اِس فلم میں ایسے مناظر دکھائے گئے تھے جو مسلمانوں کی نظر میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں "گستاخی" کے ہم معنی تھے۔ اِس کے بعد دنیا بھر کے مسلمان بھڑک اٹھے۔ شرق سے غرب تک، ہر جگہ اس کے خلاف پر شور احتجاج ہونے لگا۔ ہر جگہ دھوم کے ساتھ جذباتی مظاہرے اور تقریریں کی گئیں۔ اِن مواقع پر مسلمان جگہ جگہ اپنے مظاہروں کے دوران جو پلے کارڈ (placard) بلند کیے ہوئے تھے، اُن کی نوعیت کا اندازہ اُن پر لکھے ہوئے حسب ذیل الفاظ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے:

"Obama, Obama, we like Osama!

Behead all those who insult the Prophet!

Insulting the Prophet is insulting 1.5 billion Muslims!

The Prophet is dearer to us than our lives!"

اِس سلسلے میں دنیا کے مختلف ملکوں میں جو پرشور مظاہرے کیے گئے، اُن میں سے ایک پاکستان کا وہ مظاہرہ تھا جو 28 ستمبر 2012 کو "یومِ عشقِ رسول" کے طور پر منایا گیا۔ اِس واقعے کی رپورٹ لاہور کے ہفت روزہ سنڈے میگزین نوائے وقت (30 ستمبر 2012) میں شائع ہوئی ہے۔ اِس رپورٹ کے کچھ حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں: "پاکستانی قوم نے جمعہ کو یوم عشقِ رسول منایا۔ گستاخانہ امریکی فلم کے خلاف "یومِ عشقِ رسول" پر عوامی ردعمل کے دوران غیر معمولی توڑ پھوڑ اور تشدد کے واقعات ہوئے۔ اِن پرتشدد واقعات میں صرف جمعہ کو 32 افراد جاں بحق ہوئے اور 200 سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ کراچی میں 5 سینما گھر، تین بینک اور

لاتعداد دکانیں لوٹنے کے بعد جلا دی گئیں، گاڑیوں کو توڑا گیا، لوگوں پر ڈنڈے برسائے گئے، 4 پولیس موبائلیں اور بکتر بند گاڑیاں بھی جلا دی گئیں۔ اس دوران اسپتالوں پر بھی حملے کیے گئے اور اربوں روپیے کی املاک دھوئیں کی نذر ہو گئیں"۔ (صفحہ 4)

"گستاخیِ رسول" کے سوال پر اِس طرح کے پُرتشدد واقعات مسلمانوں کی طرف سے ہر جگہ ہو رہے ہیں، پاکستان میں بھی اور دوسرے ملکوں میں بھی۔ اِن واقعات کی رپورٹ برابر پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں میں آ رہی ہے۔ اِس صورتِ حال کو دیکھ کر ساری دنیا میں ایک سوال کیا جا رہا ہے، وہ یہ کہ — پُرامن گستاخی کے جواب میں مسلمان خود پرتشدد گستاخ کیوں بن جاتے ہیں۔ رسول کی شان میں "گستاخی" کرنے والا صرف یہ کرتا ہے کہ وہ اِس قسم کی ایک کتاب شائع کرتا ہے، یا اخبار میں ایک کارٹون چھاپ دیتا ہے، یا ایک فلم بنا کر اس کو انٹرنیٹ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ اگر گستاخی ہے تو وہ یقینی طور پر ایک پرامن گستاخی ہے، لیکن اس کے جواب میں مسلمان جو کچھ کرتے ہیں، وہ مبیّنہ طور پر ایک پرتشدد ردعمل یا پرتشدد گستاخی کا معاملہ ہے۔

پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی شریعت دی ہے، اُس میں واضح طور پر اِس طرح کے معاملات میں ایک اصول بتایا گیا ہے، وہ قِصاص (2:178) کا اصول ہے، یعنی برابر کا بدلہ (Equal Retribution)۔ قصاص کی تعریف قرآن میں اِن الفاظ میں دی گئی ہے:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (16:126)۔ تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا کہ تمھارے ساتھ کیا گیا ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن کی ایک اور آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

الظّٰلِمِیْنَ (42:40) یعنی برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی، پھر جس نے معاف کردیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

دو آپشن

قرآن کی مذکورہ آیتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس طرح کے معاملے میں اہلِ ایمان کے لیے دو میں سے ایک کا آپشن (option) ہے— ایک، عفو اور صبر کا آپشن اور دوسرا، قصاص کا آپشن۔ اِس طرح کے معاملے میں مسلمانوں کے لیے اِنھیں دو میں سے ایک کا آپشن جائز ہے، اس کے سوا کوئی تیسرا آپشن لینا اُن کے لیے سرے سے جائز ہی نہیں۔قتل کے معاملے میں اسلامی شریعت کا ایک مسلّمہ قانون یہ ہے کہ زمانہ جنگ میں بھی صرف مقاتل (combatant) کو مارا جائے گا، غیر مقاتل (non-combatant) کو مارنا جنگ کے زمانے میں بھی جائز نہیں۔ ایسی حالت میں اسلام کیسے اجازت دے سکتا ہے کہ امن کی حالت میں غیر مقاتل یا پر امن افراد کو مارا جائے۔

عفو اور صبر کے آپشن کا مطلب یہ ہے کہ آپ پیش آمدہ معاملے پر ردعمل کی نفسیات کے تحت نہ سوچیں، بلکہ اصلاح کی نفسیات کے تحت سوچیں۔ آپ یہ سوچیں کہ جو شخص اِس "گستاخی" میں ملوث ہوا ہے، وہ بھی ایک انسان ہے۔ اس کے اندر بھی وہی فطرت موجود ہے جو دوسرے انسانوں کے اندر ہوتی ہے۔ اِس لیے آپ ہمدردانہ انداز میں اس کی فطرت کو ایڈریس کرنے کی کوشش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی اصلاح ہوجائے اور وہ توبہ کرکے اللہ کے نیک بندوں میں شامل ہوجائے۔

اِس معاملے میں دوسرا آپشن وہ ہے جس کو قرآن میں قصاص کہا گیا ہے۔ یہ ثانوی درجے کا آپشن ہے۔ اِس کی حیثیت صرف ایک قانونی جواز کی ہے۔ جہاں تک اسوۂ رسول

کا معاملہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس طرح کے معاملے میں ہمیشہ عفو اور صبر اور اصلاح کے طریقے کو اختیار فرمایا، کیوں کہ یہی طریقہ عزیمت اور خُلقِ عظیم کا طریقہ ہے۔ جیسا کہ اِس سلسلہ کلام کے تحت اگلی آیت میں ارشاد ہوا ہے: وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ (42:43)۔ یعنی جس شخص نے صبر کا طریقہ اختیار کیا اور معاف کردیا، تو بے شک یہ بڑی عزیمت کے اوصاف میں سے ہے۔

ایذا (harm) کی دو قسمیں ہیں — ایک، جسمانی ایذا (physical harm) اور دوسرے، نفسیاتی ایذا (psychological harm)۔ دونوں قسم کی ایذاؤں کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیتوں کے مطابق، جسمانی ایذا کی صورت میں ہمارے لیے دو آپشن ہیں — قصاص، اور عفو۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، قصاص کا مطلب ہے: برابر کا بدلہ لینا، یعنی جتنا کسی نے کیا ہے، ٹھیک اتنا ہی اس کے ساتھ کرنا۔ اِس کے مقابلے میں، عفو کا مطلب ہے: یک طرفہ طور پر صبر کرلینا، نہ کوئی عملی کارروائی کرنا اور نہ زبان سے اس کے خلاف شکایت یا احتجاج کے الفاظ بولنا۔ گویا اسلامی تعلیم کے مطابق، جسمانی ایذا کی صورت میں اہلِ ایمان کے لیے دو آپشن ہیں، لیکن نفسیاتی ایذا کی صورت میں اُن کے لیے صرف ایک آپشن ہے، اور وہ صبر کا آپشن ہے۔

قصاص کا اصول

جیسا کہ عرض کیا گیا، اِس طرح کے معاملے میں قصاص کا آپشن ثانوی آپشن ہے۔ اگر مسلمانوں کو قصاص کا آپشن لینا ہے تو لازمی طور پر انھیں یہ کرنا ہوگا کہ وہ فریقِ ثانی کے ساتھ برابر کا معاملہ کریں، یعنی یہ کہ جتنا کسی نے کیا ہے، مسلمان بھی اس کے خلاف اتنا ہی کریں۔ اگر کسی شخص نے ایک کتاب چھاپی ہے تو مسلمان بھی اس کے جواب میں ایک

کتاب شائع کریں۔ کسی نے اگر کوئی قابلِ اعتراض آرٹکل یا کارٹون چھاپا ہے تو اس کے جواب میں مسلمان بھی اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ایک اور آرٹکل چھاپیں۔ اگر کسی نے اسٹیج پر ایک تقریر کی ہے تو مسلمان بھی اس کے جواب میں اسٹیج پر ایک تقریر کریں۔ اگر کسی نے ایک اخباری بیان دیا ہے تو مسلمان بھی اس کے جواب میں ایک مدلل اخباری بیان دیں۔ مسلمان اگر اِس طرح کے معاملے میں پیغمبر کے اسوہ کے مطابق، عفو وصبر کا طریقہ اختیار نہیں کرسکتے تو اسلامی شریعت کے مطابق، اُن کو صرف یہ حق ہے کہ وہ قلم کا جواب قلم سے دیں اور تقریر کا جواب تقریر سے دیں۔ اِس کے برعکس، قلم کا جواب پر تشدد مظاہرہ کے ذریعے دینا یا پر امن اعتراض کے جواب میں توڑ پھوڑ کرنا ایک ایسا فعل ہے جو بلاشبہ حرام کے درجے میں قابلِ ترک ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کی مثال سے یہی طریقہ ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مخالفین نے بہت بڑے پیمانے پر وہ سب کچھ کیا جس کو "شتمِ رسول" کہا جاتا ہے، مگر رسول اور اصحابِ رسول نے کبھی اس کے جواب میں احتجاج اور ہنگامے کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اِس کے برعکس جو کچھ ہوا، وہ صرف یہ تھا کہ حسان بن ثابت انصاری اپنے اشعار کے ذریعے سے اس کا جواب دیتے تھے (هَجَاهُمْ حَسَّانُ فَشَفَى وَاشْتَفَى) صحیح مسلم، حدیث نمبر 2490۔ واضح ہو کہ اُس زمانے میں شاعری کا وہی درجہ تھا جو موجودہ زمانے میں صحافت کا درجہ ہے۔

پر امن احتجاج

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ احتجاج (protest) ہمارا ایک مسلّمہ حق ہے، اِس لیے مسلمانوں کو لازماً اِس طرح کے واقعات پر احتجاج کرنا چاہئے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اُن کا یہ احتجاج پر امن ہو۔ مگر یہ شرط ایک ایسی شرط ہے جو عملاً کبھی پوری ہونے والی نہیں۔ عوامی احتجاج میں دو میں سے ایک برائی کا پیش آنا یقینی ہے، یا تو وہ بظاہر پر امن احتجاج کسی مرحلے

میں پہنچ کر لوگوں کو مشتعل کر دے گا اور پر امن احتجاج فوراً ہی پر تشدد احتجاج میں تبدیل ہوجائے گا۔ آغاز میں بظاہر وہ ایک پر امن احتجاج کی حیثیت سے شروع ہوگا، لیکن آخر میں وہ توڑ پھوڑ اور فساد اور تخریب کی شکل اختیار کر لے گا، جس کی ایک مثال پاکستان کے مذکورہ احتجاجی واقعے میں نظر آتی ہے۔

اگر بالفرض کوئی احتجاج واقعۃً پر امن احتجاج ہو، وہ اول سے آخر تک امن کی شرط پر قائم رہے، تب بھی عملاً وہ ایک فساد کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ اس کے نتیجے میں وہ سنگین برائی پیدا ہوتی ہے جس کو باہمی نفرت کہا جاتا ہے، اور نفرت بلاشبہ ایک منفعل تشدد (passive violence) ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تشدد اگر ایک بم ہے تو نفرت ایک ٹائم بم (time-bomb)۔

حبل اللہ، حبل الناس

''شتمِ رسول'' کے مسئلے پر ساری دنیا کے مسلمان پُرشور احتجاج (protest) کر رہے ہیں۔ اِس پُرشور احتجاج کے جواز کے لیے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ — حقوقِ انسانی (human rights) کے مسلّمہ اصول کے تحت احتجاج ہمارا ایک جائز حق ہے۔

سڑکوں پر احتجاجی جلوس نکالنا کوئی سادہ بات نہیں۔ گہرائی کے ساتھ غور کیجیے تو یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس کو رسول اور اصحابِ رسول نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ مسلمان آج جس طرح کے واقعات پر جگہ جگہ احتجاجی جلوس نکالتے ہیں، اُس طرح کے ناخوش گوار واقعات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زیادہ بڑے پیمانے پر موجود تھے۔ مثلاً مقدس کعبہ میں مشرکین کی طرف سے سیکڑوں کی تعداد میں بتوں کا نصب کیا جانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلے طور پر، نعوذ باللہ، مذمَّم اور مجنون کہنا، وغیرہ۔ مگر حدیث اور سیرت کی کتابوں سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول نے کبھی اُس کے خلاف احتجاج کا طریقہ

اختیار نہیں کیا۔ رسول اور اصحابِ رسول کے اِس ثابت شدہ عمل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ احتجاج کا طریقہ یقینی طور پر اسلام کا طریقہ نہیں۔

پھر احتجاج کا طریقہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو کہاں سے ملا۔ یہ طریقہ انھوں نے حقوقِ انسانی کی جدید شریعت سے اخذ کیا ہے۔ یہ انسانی شریعت کی ایک دفعہ ہے جس کو 1948 میں اقوامِ متحدہ کے یونی ورسل ڈیکلریشن (universal declaration) کے ذریعہ وضع کیا گیا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کے دو طریقے ہیں — ایک ہے، حبل اللہ کے تحت جینا، اور دوسرا ہے، حبل الناس کے تحت جینا (3:112)۔ حبل اللہ کے تحت زندگی کا حق ملنا کسی امت کی مطلوب حالت ہے، اور حبل الناس کے تحت زندگی کا حق ملنا سرتا سر غیر مطلوب حالت۔ قرآن میں حبل اللہ اور حبل الناس کے الفاظ کسی امت کی دو مختلف حالتوں کو بتانے کے لیے آئے ہیں۔ امت کی ایک حالت وہ ہے، جب کہ اس کے اندر خوفِ خدا کی روح موجود ہو اور وہ اپنے عمل کا نقشہ حبل اللہ، بالفاظِ دیگر، خدائی تعلیمات (قرآن وسنت) سے اخذ کرے، اور حبل الناس کا مطلب یہ ہے کہ امت بےخوفی کی نفسیات میں مبتلا ہوگئی ہو اور اتباعِ شہوات (19:59) کی بنا پر وہ اپنے عمل کا نقشہ تعلیمات الٰہی سے اخذ کرنے کے بجائے انسان کے وضع کردہ ضابطوں سے اخذ کرنے لگے۔

حبل اللہ اور حبل الناس کی اِس قرآنی تقسیم کے مطابق دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ زمانے کے مسلمان خود اپنی زبان سے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اِس معاملے میں وہ حبل اللہ پر قائم نہیں ہیں، بلکہ وہ حبل الناس پر قائم ہیں۔ وہ اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر اپنی احتجاجی روش کا جواز حبل اللہ میں نہ پا کر اس کو حبل الناس سے اخذ کر رہے ہیں۔ اور اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر اپنی غیر اسلامی روش کے لیے وہ حبل اللہ کے بجائے حبل

الناس کا حوالہ دے رہے ہیں، جو کہ ان کی قومی خواہشات کے مطابق ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں اتباعِ شہوات (19:59) کہا گیا ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔آپ قرآن کی مذکورہ آیت (3:112) کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ اس میں کس گروہ کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حبل اللہ کے بجائے حبل الناس سے اپنے لیے زندگی کا حق حاصل کررہا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک نہایت سنگین بات ہے۔ اِس طرح مسلمان اپنے آپ کو اُس گروہ کے ساتھ بریکٹ کررہے ہیں جس کے بارے میں وہ خود صبح وشام یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے نزدیک ایک مغضوب اور ملعون گروہ کی حیثیت ہے۔

سماجی جرم، اعتقادی جرم

پاکستان کے صوبہ پنجاب کے گورنر مسٹر سلمان تاثیر (عمر 66 سال) کو اسلام آباد میں 4 جنوری 2011 کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اخباری اطلاع کے مطابق، ان کو گولی مارنے والا خود اُن کا باڈی گارڈ ممتاز حسین قادری (عمر 26 سال) تھا۔ اس نے گورنر کے اوپر سرکاری گن سے فائرنگ کی۔ اِس حملے میں گورنر پنجاب کو 6 گولیاں لگیں۔ وہ فوراً ہی ہلاک ہو گئے۔ پولس نے قاتل کو گرفتار کرلیا۔ پولس کا کہنا ہے کہ قاتل کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ حراست میں لیے گئے ملزم نے اعتراف کیا ہے کہ اُس نے یہ حملہ اِس لیے کیا کہ گورنر پنجاب نے پاکستان کے ناموسِ رسالت قانون کو ایک کالا قانون کہا تھا۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، 5 جنوری، صفحہ 12 ؛ ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، 5 جنوری 2011، صفحہ 1)

اِس طرح کسی فرد کا کسی شخص کو گولی مار کر ہلاک کرنا بلا شبہ اسلام میں حرام ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ناموسِ رسالت کا قانون ایک بے بنیاد قانون ہے۔ اگر کوئی شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وہ فعل کرے جس کو سب وشتم کہا جاتا ہے، تب بھی اس کا جواب دلیل سے دیا جائے گا، نہ کہ گولی سے۔ بالفرض اگر ایسا کوئی قانون ہو، تب بھی شاتمِ کے خلاف کوئی عام آدمی کارروائی نہیں کرسکتا۔ وہ صرف یہ کرسکتا ہے کہ وہ ایسے شاتم کے معاملے میں عدالت سے رجوع کرے اور پھر باقاعدہ عدالتی کارروائی کے بعد عدالت جو فیصلہ کرے، اس کے مطابق، اس پر عمل کیا جائے۔

موجودہ زمانے کے مسلمان ہر جگہ شتمِ رسول (blasphemy) کے نام پر اِسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں، کہیں جلوس اور مظاہرے کی صورت میں اور کہیں شاتم کو قتل کرنے

کی صورت میں۔ اس کے نتیجے میں مفروضہ شتم تو بند نہیں ہوا، البتہ اسلام بہت زیادہ بدنام ہوگیا۔ جولوگ کسی کو شاتمِ رسول قرار دے کر اُس کے خلاف کارروائی کرتے ہیں، وہ خود شاتم سے بھی زیادہ بڑے مجرم ہیں۔ ایسے لوگ کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

سزا کا تعلق خدا سے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں داعی الی اللہ (3:46) کہا گیا ہے۔ اِس دعوتی مشن کو انجام دینے کے لیے آپ کو قرآن میں جو ہدایت دی گئیں، اُن میں سے ایک ہدایت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۔ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ (15:94-95)۔ یعنی، جس چیز کا تم کو حکم ملا ہے، اس کو تم واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کردو، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ہم تمھاری طرف سے اِن استہزا کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔

اِن آیات کو اس کے سببِ نزول کے اعتبار سے دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کو اپنی ساری توجہ دعوت کے کام میں لگانا چاہیے۔ اِس کے بعد اگر ایسا ہوتا ہے کہ مدعو گروہ کی طرف سے منفی ردعمل سامنے آتا ہے، وہ داعی کا مذاق اڑاتے ہیں، وہ داعی کا سب وشتم کرتے ہیں، وہ داعی کو لوگوں کی نظر میں گھٹانے کے لیے توہین واستہزا کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، تو ایسی حالت میں داعی کو چاہیے کہ وہ ردعمل کی نفسیات سے بچتے ہوئے یک طرفہ اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ اپنی دعوت کو مزید مدلل کرنے کی کوشش کرے، حتی کہ وہ ایسے لوگوں کی اصلاح کے لیے اپنے رب سے دعا کرے۔ وہ کہے کہ خدایا، تو اِن مخالفین کو میرا ساتھی بنادے، تو ان کو اپنی رحمت کے سائے میں لے لے۔ اِس کے بعد جہاں تک استہزا کرنے والوں کے استہزا کا معاملہ ہے، وہ اس کو پوری طرح خدا پر

چھوڑ دے۔ داعی کا کام صرف پر امن دعوت ہے، اس کا کام لوگوں کو سزا دینا نہیں(88:21-22)۔

سب وشتم کی حیثیت دراصل آزادی کے غلط استعمال کی ہے۔ سب وشتم کی حیثیت جرم مستوجبِ سزا(cognizable offense) کی نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ شاتم کو پُرامن نصیحت کی جائے گی، اُس کو مجرم قرار دے کر اس کو جسمانی سزا نہیں دی جائے گی۔ اِس معاملے میں نصیحت کا تعلق داعی سے ہے اور سزا کا تعلق خدا سے۔ داعی اگر شاتم کو سزا دینے کی کوشش کرے تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا کے کام کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتا ہے، اور ایسا کرنا بلاشبہ ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

عفو ودرگزر کا حکم

قرآن کی سورہ الجاثیہ میں ایک آیت آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْماً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ(45:14)۔ یعنی ایمان والوں سے کہہ دو کہ وہ اُن لوگوں کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ کریں جو ایّام اللہ کے ظہور کی توقع نہیں رکھتے، تاکہ اللہ ایک قوم کو اُس چیز کا پورا بدلہ دے جو وہ کرتی رہی ہے۔

قرآن کی اِس آیت کی تشریح میں مفسر القرطبی نے لکھا ہے: نَزَلَتِ الْآيَةُ بِسَبَبِ أَنَّ رَجُلًا مِنْ قُرَيْشٍ شَتَمَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَهَمَّ أَنْ يَبْطِشَ بِهِ (تفسیر القرطبی، جلد 16، صفحہ 161)۔ یعنی یہ آیت اِس واقعے کے بعد اتری کہ قریش کے ایک آدمی نے عمر بن الخطاب کا سب وشتم کیا۔ عمر نے چاہا کہ وہ اس کو پکڑیں اور ماریں۔ اِس موقع پر قرآن میں یہ ہدایت اتری۔

قرآن کی اِس آیت سے اور اِس قسم کی دوسری آیتوں سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا

ہے، وہ یہ کہ سب وشتم کا معاملہ قانونی سزا (legal punishment) کا معاملہ نہیں ہے۔ کوئی شخص نعوذ باللہ، خدا کا استہزاء کرے، وہ صحابہ کا استہزا کرے، وہ قرآن کا استہزا کرے، تو اِس بنیاد پر اُس کو قانونی مجرم قرار دے کر قانونی سزا نہیں دی جائے گی۔ اِس معاملے میں سزا کا تعلق تمام تر اللہ سے ہے۔ اللہ اپنے علم کے مطابق، ایسے لوگوں کو جو سزا دینا چاہے گا، وہ سزا دے گا۔ ایسے معاملے میں کسی شخص کو سزا دینا اسلام کی حمایت کے نام پر اسلام کے ساتھ بدترین عداوت کے ہم معنیٰ ہے۔

سب وشتم کے معاملے میں مسلمانوں کو جو کرنا ہے، وہ یہ کہ وہ ایسے شخص کے لیے دعا کریں، وہ اُس سے مل کر اُس کو نصیحت کریں، وہ اس کو دلائل کے ذریعے مطمئن کرنے کی کوشش کریں، وہ اس کی اصلاح کی پر امن جدوجہد کریں، وہ اس کو جسمانی سزا دینے کا کام اپنے ذمے نہ لیں۔ مومن کی حیثیت اِس دنیا میں داعی کی ہے، نہ کہ داروغہ (الغاشیۃ، 22-21 :88) کی۔

شتم اور ارتداد

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں شتمِ رسول کی سزا قتل ہے۔ اِسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں ارتداد (apostasy) کی سزا قتل ہے۔ شتم اور ارتداد کی اِس سزا کو حد (legal punishment) کا درجہ دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ شاتم یا مرتَد کو بطور حد قتل کیا جائے گا (یُقتل حدًّا)۔

یہ قانون اسلام کے بعد کی تاریخ میں عباسی دور (1258-750ء) کے فقہاء نے بنایا، مگر اصل اسلامی ماخذ میں اِس قسم کا کوئی حکم موجود نہیں۔ اِس لیے عین جائز ہے کہ اس حکم کو کالعدم سمجھا جائے اور اس کو غیر اسلامی قرار دے کر رد کر دیا جائے۔

اسلامی تاریخ کے مکی دور میں جو اہلِ ایمان ہجرت کر کے حبش (Abyssinia) گئے

تھے، اُن میں سے ایک شخص کا نام عبید اللہ بن جحش تھا۔ حبش ایک عیسائی ملک تھا۔ وہاں جا کر عبید اللہ بن جحش عیسائی مذہب سے متاثر ہوئے اور اعلان کے ساتھ اسلام کو چھوڑ دیا۔ یہ واضح طور پر ارتداد کا ایک واقعہ تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ عبید اللہ بن جحش مرتد ہو گئے ہیں، اُن کو بطور حد قتل کر دو۔ اِس واقعے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ محمدی میں ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے۔ اِسی طرح مدینہ میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام عبد اللہ بن اُبی تھا۔ یہ شخص کھلے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شتم کرتا تھا، لیکن رسول اللہ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ عبد اللہ بن ابی نے شتم رسول کے جرم کا ارتکاب کیا ہے، اِس لیے اس کو بطور حد قتل کر دو۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں سماجی جرم (social crime) پر سزا ہے، اسلام میں اعتقادی جرم (ideological crime) پر کوئی سزا نہیں۔ شاتم اور مرتد کے لیے تبلیغ و نصیحت ہے، نہ کہ قتل کا حکم۔

تاریخ کا سبق

نور الدین زنگی (وفات 1174ء) مصر کے سلطان تھے۔ صلاح الدین ایوبی (وفات 1193ء) اُن کے ایک فوجی افسر تھے۔ سلطان نور الدین زنگی کے انتقال کے بعد اگرچہ اُن کے بیٹے موجود تھے، لیکن صلاح الدین ایوبی نے حکومت پر قبضہ کرکے سلطان کا منصب حاصل کرلیا۔ تیسری صلیبی جنگ (Crusade) میں، جس کا زمانہ 1189-1192 عیسوی ہے، صلاح الدین ایوبی نے فاتحانہ رول ادا کیا تھا۔ اِس زمانے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مسیحی جنرل ریجی نالڈ (Reginald of Chatton) نے 1182 عیسوی میں ایک مسلم قافلے پر حملہ کرکے اس کو زیر کرلیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اُس وقت ریجی نالڈ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا: **أَيْنَ مُحَمَّدُ كُمْ لِيُنْقِذَ كُمْ** (النوادر السلطانیۃ للقاضی ابن شدّاد، صفحہ 64)۔ یعنی تمھارے محمد کہاں ہیں کہ وہ تم کو بچائیں۔ بعد کو حطّین کی جنگ (1187ء) میں ریجی نالڈ کو صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ ریجی نالڈ گرفتار ہوکر صلاح الدین کے کیمپ میں لایا گیا۔ اُس وقت صلاح الدین ایوبی نے ریجی نالڈ کو اُس کا قول یاد دلایا اور یہ کہہ کر اُس کو اپنی تلوار سے قتل کردیا: **هَا أَنَا انْتَصِرُ لِمُحَمَّدٍ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ** (النوادر السلطانیۃ، صفحہ 64)۔ یعنی یہ لو، میں محمد علیہ الصلاۃ والسلام کا انتقام لیتا ہوں۔

مسلم مورخین اِس واقعے کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی دینی حمیت اور اس کی قوتِ ایمانی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ صحیح اسلامی شعور کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ یہ

موقع تھا، جب کہ صلاح الدین اور دوسرے مسلمان ریجی نالڈ کے سامنے اِس بات کی گواہی دیتے کہ ہمارے دین کے معاملے میں تم غلط فہمی کا شکار رہو۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مشکل کشا سمجھتے ہیں، حالاں کہ ہم، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اپنا ہادی اور پیغمبر سمجھتے ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق، مشکل کشائی کا اختیار صرف اللہ رب العالمین کو ہے، نہ کہ محمد یا کسی اور شخصیت کو۔ پیغمبرانہ اسوہ کے مطابق، یہ وقت ریجی نالڈ کے سامنے حق کی گواہی دینے کا تھا، نہ کہ تلوار مار کر اس کو قتل کرنے کا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے جو کچھ کیا، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، قومی حمیت یا شخصی حمیت کا معاملہ تھا، مگر قومی حمیت یا شخصی حمیت کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں۔ رسول اللہ کا طریقہ حمیتِ خداوندی کا طریقہ ہے، نہ کہ قومی حمیت یا شخصی حمیت کا طریقہ۔

اِس حمیتِ خداوندی کی ایک مثال یہ ہے کہ ہجرت (622ء) کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق دشمنوں کی نظر سے بچنے کے لیے غارِ ثور میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ مگر دشمن آپ کو تلاش کرتے ہوئے غارِ ثور کے دہانے تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر نے دیکھا کہ وہ لوگ تلواریں لیے ہوئے غارِ ثور کے باہر کھڑے ہیں۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا تھا، وہ قرآن میں اِن الفاظ میں نقل ہوا ہے:

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (9:40)۔ یعنی، تم غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس طرح کے معاملے میں مومن کا احساس کیا ہونا چاہیے۔ اِس طرح کے معاملے میں مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے عجز کے مقابلے میں اللہ کی قدرت کو دریافت کرے۔ وہ یہ یقین کرے کہ سارا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اللہ دینے والا ہے، اور اللہ چھیننے والا۔ عزت بھی اللہ کے ہاتھ

میں ہے اور ذلت بھی اللہ کے ہاتھ میں۔ سارا اختیار اللہ کو حاصل ہے۔ اختیار کے معاملے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

مومن پر فرض ہے کہ وہ پورے شعور کے ساتھ اِس حقیقت کو جانے۔ ذاتی اعتبار سے اُس کا یقین اِسی عقیدے پر قائم ہو۔ اِسی کے ساتھ مومن پر یہ فرض ہے کہ جب بھی اِس قسم کا کوئی وقت آئے تو وہ لوگوں کے سامنے اِس حقیقت کی گواہی دے۔ وہ لوگوں کو بتائے کہ اللہ کے اختیار میں کوئی اس کا حصہ دار نہیں۔ اللہ کے اختیار میں کسی کو حصے دار ماننا شرک ہے، اور شرک ایک ایسا جرم ہے جو اللہ کے یہاں کسی حال میں قابلِ معافی نہیں (النساء، 4:48)۔ جس طرح اللہ کی قدرت میں کسی کو شریک ماننا ایک جرم ہے، اُسی طرح یہ بھی ایک جرم ہے کہ کسی مومن کے سامنے اِس طرح کی صورت پیش آئے اور وہ لوگوں کے سامنے اِس حقیقت کی گواہی نہ دے۔

قومی توہین

مسجد کے سامنے سے ہندوؤں کا جلوس گزرے تو مسلمان فوراً اس سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر اسی مسجد کے سامنے سے مسلمانوں کا شادی کا جلوس گزرے تو کوئی مسلمان اس کو روکنے کے لیے نہیں اٹھتا۔ کوئی ہندو اگر مسجد کے اندر ٹرانسسٹر بجائے تو مسلمان اتنا مشتعل ہوں گے کہ پوری بستی میں فساد کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اسی مسجد میں اگر مسلمان ٹرانسسٹر بجائے تو کسی مسلمان کو غصہ نہیں آتا۔ کوئی ہندو مسجد میں بُت رکھ دے تو فوراً ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ مگر مسلمان بزرگوں کی درگاہوں میں ان کی قبر کو بُت بنا کر پوجتے ہیں اور اس پر کوئی شور نہیں مچتا۔

ایک ہی قسم کے دو واقعات میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ مسلمان ایک ہندو کے جس فعل پر بھڑکتے ہیں، وہی فعل ایک مسلمان کرے تو وہ نہیں بھڑکتے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی خودساختہ قومی شریعت ہے نہ کہ خدا کی دی ہوئی اسلامی شریعت۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے اپنی پڑوسی قوم کے ساتھ پچھلی نصف صدی سے رقابت (rivalry) قائم کر رکھی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب وہ کوئی ایسا واقعہ دیکھتے ہیں جس میں ان کے خیال کے مطابق، ہندو قوم، مسلم قوم کی بڑائی کو پامال کر رہی ہو تو وہ اس میں اپنی قومی توہین محسوس کرتے ہیں اور قومی جذبہ کے تحت بھڑک اٹھتے ہیں اور فریقِ ثانی سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں نے بطور خود ان چیزوں کو ملی غیرت یا اسلامی غیرت کا نام دے رکھا ہے۔ مگر یہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ ایک جھوٹے قومی عمل کو اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرنا

ہے۔مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسا ہر فعل اللہ کی نظر میں صرف ان کے وِزر (گناہ) کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں ان کو انعام کا مستحق نہیں بناتا۔

اس قسم کا لڑائی جھگڑا کرنے والے اگرچہ ہمیشہ عوام ہوتے ہیں۔مگر مسلمانوں کے رہنما بھی اس معاملہ میں یکساں طور پر مجرم ہیں۔کیوں کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ ایسا کرتے ہیں، مسلم رہنما کبھی ان کی مذمت نہیں کرتے۔اس طرح عوام اگر براہ راست طور پر اس کے ذمہ دار ہیں تو خواص اور رہنما بالواسطہ طور پر۔اور قرآن وحدیث کے مطابق، اس طرح کے معاملہ میں بالواسطہ شرکت بھی اتنی ہی بُری ہے جتنی براہِ راست شرکت۔

توہینِ رسول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ 6ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہنچ کر عمرہ کریں۔ آپ کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ بھی تھے۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ، جو اس وقت مشرک تھے، انھوں نے طے کیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں۔ آپ حدیبیہ میں ٹھہر گئے۔

اس کے بعد اہل مکہ سے بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران اہل مکہ طرح طرح کی اشتعال انگیزی کرتے رہے۔ مگر آپ قطعاً اس سے مشتعل نہیں ہوئے اور صبر و برداشت کے ساتھ ان سے بات چیت جاری رکھی۔ آخر کار دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ بھی تقریباً ایک طرفہ تھا۔ اس میں بظاہر وہ تمام باتیں مان لی گئی تھیں جن کا مطالبہ اس وقت اہل مکہ کر رہے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت آپ کو پابند کیا گیا تھا کہ آپ مکہ میں داخل نہ ہوں اور اس سال عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں۔ مکہ کا کوئی آدمی مسلمان ہو کر مدینہ جائے تو اس کو دوبارہ مکہ واپس کر دیں۔ معاہدہ میں ''محمد رسول اللہ'' کا لفظ مٹائیں اور اس کے بجائے محمد بن عبداللہ کا لفظ لکھیں۔ وغیرہ۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سوچتے کہ اہل مکہ کی ان باتوں کو ہرگز نہیں ماننا ہے۔ کیوں کہ اس وقت اگر ان کی بات مان لی گئی تو آئندہ وہ اور زیادہ جری ہو جائیں گے۔ آج عمرہ کے لیے روک رہے ہیں، کل حج کے لیے روکیں گے۔ آج مکہ میں داخل ہونے پر پابندی لگا رہے ہیں، کل مدینہ میں داخلہ پر پابندی لگائیں گے۔ آج نئے مسلمانوں کو واپس کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں، کل پرانے مسلمانوں کو واپس کرنے کے

لیے کہیں گے۔ آج رسول اللہ کا لفظ مٹانے کے لیے کہہ رہے ہیں، کل خدا کا لفظ مٹانے کا مطالبہ شروع کردیں گے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

مگر اہل مکہ کی ہٹ دھرمی کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح نہیں سوچا۔ آپ نے اس قسم کے تمام اندیشوں کو شیطانی وسوسہ قرار دیتے ہوئے انھیں بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور اہل مکہ کی تمام شرطوں کو مان کر مدینہ واپس چلے آئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کی یہ "واپسی" عظیم "اقدام" کے ہم معنیٰ بن گئی۔ اس کے بعد اللہ کی مدد آئی اور صرف 2 سال کے اندر نہ صرف مکہ آپ کے کنٹرول میں آ گیا، بلکہ مکہ والے بھی آپ کے سچے ساتھی بن گئے۔

موجودہ زمانے میں بھی مسلمانوں کے سامنے اس قسم کے معاملات پیش آرہے ہیں۔ غیر مسلم طبقہ کی طرف سے بعض اوقات ایسے مطالبے کیے جاتے ہیں جو مذکورہ بالا مطالبات کے مشابہ ہیں۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ اپنی سنت کی زبان میں مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ میں تمہارے لیے خدائی نمونہ ہوں۔ تم وہی کرو جو میں نے کیا۔ مگر مسلم ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ جھوٹے لیڈروں کے کہنے پر چل رہے ہیں ، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر۔

جب بھی مذکورہ نوعیت کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو نام نہاد لیڈر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو، ذرا بھی نرم نہ پڑنا۔ اگر تم نرم پڑے تو اغیار اور زیادہ کڑے ہو جائیں گے۔ دیکھو ، ذرا بھی ان لوگوں کے ساتھ رعایت نہ کرنا۔ اگر تم نے رعایت کا معاملہ کیا تو وہ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے اور تمہارے ساتھ مزید سختی کا معاملہ کریں گے۔ ایسے مواقع پر مسلمان اپنے رسول کی سنت کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لیڈروں کے کہے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

یہ بلا شبہ سب سے بڑی توہینِ رسول ہے۔ جب ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے پکار رہے ہوں، اور دوسری طرف جھوٹے لیڈر اپنی جھوٹی آوازیں لگا رہے ہوں ، ایسی حالت میں خدا کے رسول کی شان میں اس سے بڑی گستاخی اور کیا ہوسکتی ہے کہ مسلمان خدا کے رسول کی پکار کو نظر انداز کردیں اور لیڈروں کی پکار کی طرف دوڑ پڑیں۔

یہ توہینِ رسول کا سب سے زیادہ بڑا واقعہ ہے جو آج خدا کی زمین پر پیش آرہا ہے۔ اور اس توہینِ رسول کا ارتکاب کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو توہینِ رسول سے روکنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ موجودہ حالت میں ان کا یہ فعل غفلت پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اور جو لوگ غفلت پر سرکشی کا اضافہ کریں وہ اللہ کے نزدیک صرف اپنے جرم کو بڑھاتے ہیں، وہ کسی درجہ میں بھی اس کو کم نہیں کرتے۔

دلیل یا سزا

قرآن، اسلام کی سب سے زیادہ مستند کتاب(source book) ہے۔ قرآن میں کچھ ایسے جرائم کا ذکر ہے جو قرآن کے نزدیک، قابلِ سزا جرم(punishable crime) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں جہاں اِس قسم کے جرائم کا ذکر ہے، وہیں واضح الفاظ میں ان کی سزا کا بھی ذکر ہے۔

اِس کی ایک مثال وہ جرم ہے جس کو اسلام میں ’قذف‘ کہا جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی متعلق آیت یہ ہے: وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً (24:4) یعنی، جولوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر وہ چار گواہ نہ لائیں، تو اُن کو اسّی کوڑے مارو۔

قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پاک دامن عورت کی عصمت پر کوئی شخص بےثبوت الزام لگائے تو وہ قرآن کی نظر میں ایک ایسا مجرم بن جاتا ہے جس کو عدالتی کارروائی کے بعد جسمانی سزا(physical punishment) دی جائے۔ اِس معاملے میں قرآن نے جب جرم کا ذکر کیا تو اُسی وقت اس کی متعین سزا کا بھی ذکر کردیا۔

اب دوسرے پہلو سے غور کیجئے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے زمانوں میں اللہ تعالی نے ہر قوم اور ہر بستی میں لگاتار پیغمبر بھیجے(23:44)۔ قرآن مزید یہ بتاتا ہے کہ اِن تمام پیغمبروں کے ساتھ اُن کے معاصرین نے وہی منفی روش شدیدتر انداز میں اختیار کی جس کا ذکر قرآن کی مذکورہ آیت میں پاک دامن خواتین کی نسبت سے کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں فرمایا کہ: مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (36:30) یعنی بندوں پر افسوس

ہے، جو رسول بھی ان کے پاس آیا، وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔

قرآن میں دو سو سے زیادہ ایسی آیتیں ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کے معاصرین نے مسلسل طور پر وہی فعل کیا جس کو آج کل ''اہانتِ رسول'' کہا جاتا ہے۔ کسی نے اپنے زمانے کے پیغمبر کو کذاب (40:24) کہا، یعنی بہت بڑا جھوٹا۔ کسی نے اپنے زمانے کے پیغمبر کو مجنون (15:6) کہا، یعنی دیوانہ۔ کسی نے اپنے زمانے کے پیغمبر کو مفتری (16:101) کہا، یعنی جھوٹ گڑھنے والا۔ کسی نے اپنے زمانے کے پیغمبر کو سفیہ (7:66) کہا، یعنی بے وقوف، احمق۔ کسی نے اپنے زمانے کے پیغمبر کا استہزا کیا (36:30)، وغیرہ۔ قرآن میں کثرت سے اِس قسم کے توہین آمیز کلمات کا ذکر ہے، لیکن قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ ایسے لوگوں کو کوڑے مارو یا ان کو قتل کردو، قرآن میں ایسی کسی سزا کا مطلق ذکر موجود نہیں۔

اِس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کی توہین سزا کا موضوع نہیں ہے، بلکہ وہ ڈائلاگ کا موضوع ہے، یعنی جو شخص ''توہینِ رسالت'' کا ارتکاب کرے، اس کو جسمانی سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ دلیل کی زبان میں اس سے ایسی بات کہی جائے گی جس سے اس کا ذہن ایڈریس ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ''توہینِ رسالت'' کا ارتکاب کرنے والوں کو دلیل کی زبان میں خطاب کرکے ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی، نہ کہ اُن کو قتل کرنا یا کوڑے مارنا۔

اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا (4:63) یعنی اُن کے دلوں میں جو کچھ ہے، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ پس تم ان سے اعراض کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان سے ایسی بات کہو جو اُن کے دلوں میں اتر جائے۔

اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کے خلاف جولوگ منفی روش اختیار کرتے ہیں، اُن کوسزا دینا اللہ کا کام ہے، جواُن کے دلوں کے حال کو جانتا ہے۔ تمھاری ذمے داری یہ ہے کہ تم اُن کی ایذا رسانی کونظر انداز کرتے ہوئے ان سے دردمندانہ نصیحت کا معاملہ کرو، تم ان کو ایسے موثر انداز میں نصیحت کرو جواُن کے ذہن کو ایڈریس کرنے والی ہو۔

اِس معاملے کی ایک مثال قرآن کی سورہ الغاشیہ ہے۔ اس کی متعلق آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ”کیا وہ اونٹ کونہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا، اورزمین کو کہ وہ کس طرح بچھائی گئی۔ پس تم یاددہانی کرو، تم صرف یاددہانی کرنے والے ہو، تم اُن پر داروغہ نہیں۔ مگر جس نے روگردانی کی اورانکار کیا، تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے، پھر ہمارے ذمے ہے ان کا حساب لینا“ (88:17-26)۔

قرآن کی اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا وہ اسلوب کیا ہے جس کی تلقین پیغمبر کو کی گئی تھی۔ وہ اسلوب یہ ہے کہ لوگوں کو دلائل کے ذریعے خطاب کیا جائے۔ دین کی صداقت پر ان کو عقلی طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔ مخاطَب کے منفی ردعمل کے باوجود دعوت کا یہی مثبت اسلوب آخر وقت تک جاری رہے گا۔ داعی کا یہ کام نہیں کہ وہ ان کے اوپر داروغہ بن کر ان کوسزا دینے لگے۔ اس کے بعد جہاں تک سزا وجزا کا معاملہ ہے، اس کا تعلق تمام تر اللہ سے ہے۔ قیامت میں اللہ ہر ایک کو اکٹھا کرے گا اور پھر ہر ایک کے عمل کے مطابق، اس کے لیے جزا یا سزا کا فیصلہ فرمائے گا۔

اِس معاملے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ جو شخص رسول کے خلاف سب وشتم کرے، اس کو ایسا کرنے سے روکو اور اگر وہ نہ رکے تو اس کو سخت سزا دو۔ اِس کے برعکس، قرآن میں اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم فریقِ ثانی کے خلاف

سب وشتم نہ کرو۔ اِس سلسلے میں قرآن کی متعلق آیت یہ ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (6:108)۔ یعنی اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، تم ان کو سب وشتم نہ کرو، ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو سب وشتم کرنے لگیں گے۔

قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کا یہ کام نہیں کہ وہ میڈیا واچ (media watch) قائم کرکے ایسے لوگوں کی تلاش کریں جس نے ان کے خیال کے مطابق، سب وشتم کا فعل کیا ہے اور پھر اس کو ہر قیمت پر قتل ڈالیں۔ اِس کے برعکس، قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ اہلِ ایمان آخری حدتک ایسی کسی روش سے بچیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ لوگ مشتعل ہوجائیں اور وہ دینِ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف سب وشتم جیسا معاملہ کریں۔ گویا کہ قرآن کی ہدایت کے مطابق، اِس معاملے کی ذمے داری خود اہلِ ایمان کو اپنے اوپر لینا ہے، نہ کہ اس کو دوسروں کے اوپر ڈال کران کی سزا کا مطالبہ کرنا۔

اِس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی روش قرآن کی تعلیم کے عین خلاف ہے۔ مسلمان یہ کررہے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص اُن کے خیال کے مطابق، تقریر یا تحریر کے ذریعے ''اہانتِ رسول'' کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ فوراً مشتعل ہوکر اس کے خلاف جلوس نکالتے ہیں اور یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ — اُن تمام لوگوں کی گردن ماردو جو پیغمبر کی توہین کرتے ہیں:

Behead all those who insult the Prophet.

جولوگ اِس قسم کے اشتعال انگیز جلوس نکالتے ہیں اور مفروضہ ''مرتکبینِ اہانت'' کے قتل کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ خود سب سے بڑی اہانت کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔ اُن کی اِن

متشددانہ کارروائیوں کا یہ سنگین نتیجہ ہوا ہے کہ آج کا انسان یہ یقین کرنے لگا ہے کہ اسلام تہذیب سے پہلے کا دین ہے۔ اسلام انسان کی آزادانہ سوچ پر پابندی لگاتا ہے، اسلام ایک ایسا مذہب ہے جوفکری جرم(thought-crime) میں یقین رکھتا ہے، اسلام تشدد کا مذہب ہے، وغیرہ— موودہ زمانے میں اسلام کی اِس منفی تصویر(negative image) کے ذمے دار تمام تر خود مسلمان ہیں، اور اس طرح اسلام کی تصویر بگاڑنا بلاشبہ تمام جرائم میں سب سے بڑے جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔(2012)

اختلاف رائے کا کیس

شتم رسول (blasphemy) کا تصور اسلام میں اجنبی ہے۔ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی اس کا حکم موجود نہیں۔ بعد کے دور میں کچھ علماء نے بطور خود یہ تصور وضع کیا، اور اس کو اسلام کا قانونی حصہ بنا دیا۔ پیغمبر اسلام کو دعوت الی اللہ کا حکم دیا گیا تھا، یعنی خدا کے پیغام سے لوگوں کو باخبر کرنا۔ قرآن میں پیغمبر کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (88:21-22)۔ یعنی تم یاددہانی کرو، تم صرف یاددہانی کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو۔ یہی ذمہ داری امت محمدی کی ہے۔ زندگی کے اسلامی نقشہ میں اس تصور کے لیے کوئی جگہ نہیں کہ جو شخص مفروضہ شتم کا ارتکاب کرے، اس کو مار ڈالو۔ شتم کی اصل حقیقت اختلافِ رائے (difference of opinion) ہے۔

انسانی آزادی کی بنا پر دنیا میں اختلاف رائے کا معاملہ پیش آتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ شخص جس کو مسلمان بطور خود شاتم کہتے ہیں، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اختلافِ رائے رکھنے کا کیس ہے، نہ کہ شتم کا کیس۔ ایسے انسان کو دلیل کی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر کوئی شخص آپ کو مختلف رائے رکھنے والا ملے تو آپ کو اس سے پیس فل ڈسکشن کا حق ہے، نہ کہ اس کو مارنے کا حق۔ ایسا انسان مجرم (criminal) نہیں ہے۔ وہ خدا کی دی ہوئی آزادی کے غلط استعمال (misuse of freedom) کا کیس ہے۔ جو لوگ ایسے انسان کو قتل کرنے کا اعلان کریں، وہ خود غلط کار ہیں، نہ کہ مفروضہ شاتم۔

امت محمدی کا مشن پر امن مشن ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے تو یہ اللہ رب العالمین کے دائرے کا کیس ہے، وہ کسی انسان کے دائرے کا کیس نہیں۔ جو لوگ ایسے انسان کو شاتم رسول کہہ کر اس کو قتل کرنا چاہیں، وہ خود انسانی دائرے سے نکل کر اللہ کے دائرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، نہ کہ مفروضہ شاتم رسول۔

تحفظِ نبوت، تحفظِ کارِ نبوت

موجودہ زمانے میں مسلم تنظیمیں اور مسلم ادارے جگہ جگہ تحفظِ ختمِ نبوت کے نام سے جلسے کررہے ہیں۔ اِن موقعوں پر مسلمانوں کی بھیڑ اکھٹا ہوتی ہے، مقررین پر جوش تقریریں کرتے ہیں۔ وہاں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم ہر قیمت پر ختمِ نبوت کا تحفظ کریں گے۔مگر اِس قسم کے جلسے اور تقریریں سراسر بے معنی ہیں۔ان کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

قرآن میں اعلان کیا گیا تھا کہ اللہ خاتم النبیین کی حفاظت فرمائے گا(5:67)۔اللہ اپنے آخری کلام قرآن کو ہمیشہ محفوظ رکھے گا(15:9)۔اللہ کا یہ فیصلہ پورا ہوا۔دنیا میں ایسے حالات پیدا ہوئے جس کے بعد خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم پوری طرح محفوظ ہوگئی۔قرآن پرنٹنگ پریس کے زمانے میں پہنچ کرآخری طور پر محفوظ ہوگیا۔اب مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ کا نہیں ہے، بلکہ اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ کارِ نبوت (دعوت الی اللہ) کو ہر زمانے میں مسلسل طور پر جاری رکھا جائے۔

کارِنبوت سے مراد وہی کام ہے جس کو قرآن میں تبلیغ ما انزل اللہ(5:67) کہا گیا ہے۔پیغمبر اسلام کا مشن دراصل دعوتی مشن تھا۔مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اِس دعوتی مشن کو ہر قوم میں اور ہر زمانے میں جاری رکھیں۔وہ دعوت وتبلیغ کے کام میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی کریں۔یہی کرنے کا اصل کام ہے اور یہی امتِ محمدی کی اصل ذمے داری۔

اصل یہ ہے کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا،لیکن پیغام نبوت کا سلسلہ جاری ہے۔

اب مسلمانوں کی ذمے داری یہ نہیں ہے کہ وہ نعت خوانی کریں، یا گستاخِ رسول کو قتل کریں، یا تحفظ ختم نبوت کے جلسے کریں۔ یہ سب غیر متعلق کام ہے، اصل کام یہ ہے کہ تمام انسانوں تک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن کو پہنچایا جائے، ہر زمانے کے لوگوں کو اس کے پیغام سے باخبر کیا جائے— تحفظ، خدا کا کام ہے اور دعوت اہلِ اسلام کا کام۔

مثبت جواب

ہجرتِ رسول کے تیسرے سال مدینہ میں قریش اور اہلِ اسلام کے درمیان ایک جنگ ہوئی جو غزوہ احد کے نام سے مشہور ہے۔ اِس میں بعض اسباب سے اہلِ ایمان کو شکست ہوئی۔ تقریباً 70 مسلمان مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ زخمی ہونے والوں میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم شامل تھے۔ جنگ کے خاتمے پر قریش کے سردار نے فخر کے ساتھ اپنی فتح کا کریڈٹ اپنے بت عزی کو دیتے ہوئے کہا: لَنَا الْعُزَّی وَلَا عُزَّی لَکُمْ (ہمارے پاس عزی ہے، اور تمھارے پاس کوئی عزی نہیں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر صحابہ نے اِن الفاظ میں اِس کا جواب دیا: اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلَی لَکُمْ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 4043)۔ اللہ ہمارا مولا ہے، اور تمھارا کوئی مولا نہیں۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں، بلکہ وہ زندگی کا ایک عمومی اصول ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر فریقِ ثانی کوئی اشتعال انگیز بات کہے تو تم اس کے جواب میں خود مشتعل نہ ہو، بلکہ مثبت انداز میں اس کا جواب دو۔ فریقِ ثانی کی طرف سے خواہ کچھ بھی کیا جائے، تمھارا طریقہ مثبت ردعمل کا طریقہ ہونا چاہئے، نہ کہ منفی ردعمل کا طریقہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صحابہ نے فریقِ ثانی کو جو جواب دیا، اُس میں بہ یک وقت دو فائدے تھے — ایک، یہ کہ صحابہ نے اپنے آپ کو منفی ردعمل کی نفسیات سے بچالیا، اور منفی ردعمل سے بچنا ہی تزکیہ نفس کا اصل ذریعہ ہے۔ منفی ردعمل آدمی کے نفس کو آلودہ کرتا ہے اور مثبت ردعمل آدمی کے نفس کو پاک کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اِس طرح مثبت جواب دینے کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ قول محض قول نہ رہا، وہ ایک دعوت کا

قول بن گیا۔ اِس کے ذریعے صحابہ نے فریقِ ثانی کو یہ پیغام دیا کہ شرک کا عقیدہ ایک بے بنیاد عقیدہ ہے۔ صحیح اور درست عقیدہ یہ ہے کہ آدمی اللہ واحد کو مانے اور اُسی سے ہر قسم کے خیر کی امید رکھے۔ ساری طاقت کا مالک اللہ ہے۔ کسی کو جو کچھ ملتا ہے، وہ صرف اللہ سے ملتا ہے، نہ کہ کسی اور سے۔

نبیِ رحمت کا طریقہ

فتح مکہ کے بعد مکہ کی بہت سی عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر اسلام قبول کیا۔ انہیں میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ بن ربیعہ تھی ۔ یہ وہی عورت ہے جس نے احد کی جنگ میں حضرت حمزہ کی لاش کی بے حرمتی کی تھی ۔ وہ کئی عورتوں کے ساتھ آئی ۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے محمدؐ کے سامنے کلام کیا تو وہ پہچان لیں گے، اور اگر انھوں نے پہچان لیا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے (فَقَالَتْ: إِنِّي إِنْ أَتَكَلَّمْ يَعْرِفْنِي، وَإِنْ عَرَفَنِي قَتَلَنِي)تفسیر الطبری، جلد 23، صفحہ 341۔

چنانچہ بیعت کے وقت ہند نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ مگر وہ اونچے خاندان کی عورت تھی ، اس لیے وہ اپنی بڑائی کے احساس سے چپ نہ رہ سکی۔ بیعت کے الفاظ ادا کراتے ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا کہ یوں کہو کہ ہم اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے (وَلانَقْتُلَ أَوْلادَنَا) تفسیر ابن ابی حاتم، حدیث نمبر 18871۔

اس وقت ہند نے بے برداشت ہو کر گستاخی کے الفاظ کہے۔ اس کے الفاظ مختلف روایتوں میں اس طرح نقل کیے گئے ہیں: قَالَتْ هِنْدٌ: أَنْتَ قَتَلْتَهُمْ يَوْمَ بَدْرٍ فَأَنْتَ وَهُمْ أَبْصَرُ رَبَّيْنَاهُمْ صِغَارًا، فَقَتَلْتُمُوهُمْ كِبَارًا تَقْتُلُ آبَاءَهُمْ وَتُوصِينَا بِأَوْلادِهِمْ (تفسیر ابن ابی حاتم، حدیث نمبر 18872، 18874)۔ ہند نے کہا کہ آپ نے ان کو بدر کے دن قتل کر دیا اس لیے آپ جانیں اور وہ جانیں ۔ ہم نے چھوٹے پر انھیں پالا اور بڑے پر آپ نے انھیں قتل کر دیا۔ آپ خود تو ان کے باپوں کو قتل کرتے ہیں اور ہم کو ان کی اولاد کے بارے میں نصیحت کر رہے ہیں۔

ہند نے اس سے پہلے بھی بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مذکورہ واقعے میں تو اس نے رودر روتوہین رسالت کا ارتکاب کیا۔ موجودہ زمانے کے نام نہاد مسلم رہنماؤں نے جو خود ساختہ اسلام وضع کر رکھا ہے، یہی اسلام اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہوتا تو آپ فوراً ہند کو قتل کرا دیتے۔ مگر آپ نے بیعت لے کر ہند کو اسلام میں داخل کرلیا۔

آج مسلمانوں سے سب سے بڑی چیز جو کھوئی گئی ہے وہ نبیِ رحمت کا یہی طریقہ ہے۔

خاتمہ

سوچنے کی بات

قرآن خدا کی کتاب ہے جو کائناتی حقیقتوں کو بیان کرتی ہے۔ قرآن میں جن حقیقتوں کا اعلان کیا گیا ہے، ان میں سے ایک عالمگیر حقیقت وہ ہے جو ان لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے: فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:5-6)۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

موجودہ دنیا میں جس طرح کانٹے کے ساتھ پھول ہوتا ہے، اسی طرح یہاں دشواری کے ساتھ آسانی کا پہلو بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ کبھی خوشگوار امکانات کو ختم نہ کر سکے۔ ہر ناپسند صورت حال میں دوبارہ ایک پسندیدہ موقع آدمی کے لیے باقی رہے۔ امکانات کی یہ فہرست اتنی لمبی ہے کہ اس کا سلسلہ سلمان رشدی جیسے نازیبا واقعات تک پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم مدینہ میں سلمان رشدی جیسا ایک برا کردار موجود تھا۔ یہ عبداللہ بن ابی بن سلول ہے۔ اس ظالم نے ایک بار ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنایا اور اس کے ذریعہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر نعوذ باللہ بدکرداری کا الزام لگایا۔ یہ جھوٹی کہانی اس طرح پھیلی کہ پورے مدینہ میں ایک مہینہ تک ہنگامی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد قرآن میں اس کی تردید میں سورۃ النور (آیات 11 تا 20) اتاری گئی۔

ان تردیدی آیات میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ: لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ (24:11)۔ یعنی اے مسلمانوں، یہ طوفان جو تمہارے خلاف برپا کیا گیا ہے، اس کو تم اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے حق میں اچھا ہے۔ بہتان تراشی کا واقعہ بظاہر ''عسر'' کا ایک واقعہ تھا۔ مگر قرآن نے بتایا کہ اس میں بھی

تمہارے لیے "یسر" کا یقینی پہلو چھپا ہوا ہے۔

اس یُسر (موافق پہلو) کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ جب داعی کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے تو اس کی ذات اور اس کی دعوت لوگوں کے درمیان گفتگو کا موضوع بن جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے لیے ایک سوالیہ نشان کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اس طرح داعی کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان جھوٹے پروپیگنڈوں کی تردید کرکے اصل حقیقت کو واضح کرے۔ وہ اپنی بات کو ازسرِ نو مزید وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرسکے۔

اس طرح ایک طرف مخالفین کا برسر باطل ہونا معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف داعی کا برسرِ حق ہونا اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ وہ اور زیادہ ثابت شدہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئے لوگ دعوتِ حق سے متعارف ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ابھی تک شبہات کا شکار تھے، وہ اس کے بعد یقین کے درجہ تک پہنچ کر داعی کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ لوگ اپنی آنکھوں سے عیاناً دیکھ لیتے ہیں کہ حق کا داعی ٹھوس حقیقت کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مخالفین کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس جھوٹے الزام اور بے بنیاد اتہام کے سوا اور کچھ نہیں۔

اصل مسئلہ

گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو اس معاملہ میں قابل غور مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہاں رشدی جیسے لوگ ہیں جو اسلام کے خلاف لکھتے اور بولتے ہیں۔ بلکہ اصل قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سے حالت ہیں جس نے انہیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف لکھیں اور بولیں۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ برطانیہ میں 17 ویں صدی سے ایک قانون موجود ہے جو مسیحیت (اینگلیکن چرچ) کے خلاف کفریہ کلمات (Blasphemy)

کو قابلِ سزا جرم قرار دیتا ہے۔ مگر اس تعزیری قانون کے ہوتے ہوئے برطانیہ میں ایک فلم بنائی گئی ہے جو سراسر اس کی منشا کے خلاف ہے۔ اس فلم کا نام ہے:

"The Last Temptation of Christ" (1988)

اس فلم میں نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جنسی زندگی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ ان کو اور ان کی والدہ محترمہ (حضرت مریم) کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے ان کے تقدس پر حرف آتا ہے۔ یہ فلم برطانیہ میں کھلے طور پر دکھائی جارہی ہے مگر مذکورہ قانون کے باوجود اس فلم پر آج تک پابندی نہیں لگائی گئی اور نہ اس کے بنانے والوں کو کوئی سزا دی گئی۔

اب اسی ملک کی ایک برعکس مثال لیجیے۔ پیٹر رائٹ (Peter Wright) ایک انگریز ہے جو ریٹائر ہونے کے بعد اب آسٹریلیا میں رہتا ہے۔ وہ برطانیہ کے محکمہ انٹلجنس میں ایک اعلیٰ افسر تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنی یاداشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے — اسپائی کیچر:

"Spycatcher: The Candid Autobiography of a Senior Intelligence Officer" (1988)

اس کتاب میں برطانیہ کے محکمہ جاسوسی کے بہت سے راز بتائے گئے ہیں۔ پیٹر رائٹ نے اپنی یہ کتاب لندن کے ایک پبلشر کے ہاتھ فروخت کی مگر اس کی اشاعت سے پہلے حکومت برطانیہ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے فوراً یہ کہہ کر اس پر پابندی لگادی کہ یہ کتاب سرکاری رازوں کی پردہ داری کے خلاف ہے۔ مصنف اور پبلشر کی تمام کوششوں کے باوجود یہ کتاب لندن میں چھپ نہ سکی۔ 1988 میں وہ ایک بیرونی ملک میں چھاپی گئی ہے۔ تاہم برطانی حدود میں اس کا داخلہ مکمل طور پر ممنوع ہے۔

اس تقابلی مثال پر غور کیجیے۔ ایک ہی ملک ہے۔ وہاں ”توہین پیغمبر“ کا واقعہ ہوتا ہے مگر باقاعدہ قانون کے ہوتے ہوئے بھی اس پر پابندی نہیں لگائی جاتی۔ دوسری طرف اسی ملک میں ”توہین ریاست“ کا واقعہ ہوتا ہے تو حکومت اس کے خلاف فوراً سرگرم ہوجاتی ہے اور پورا ملک اس کو اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کردیتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ برطانیہ توہین ریاست کی اہمیت سے واقف ہے، مگر توہین نبوت کی اہمیت کا اسے احساس نہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے ان کے یہاں دونوں مثالوں میں فرق پیدا کردیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ آج اسلام کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کی عظمت و اہمیت جدید لوگوں کے ذہن سے نکل گئی ہے۔ وہ اسلام کو ایک بے قیمت اور آج کے لحاظ سے بے ضرورت چیز سمجھنے لگے ہیں۔ یہی وہ حالات ہیں جس نے لوگوں کو اسلام کے خلاف بولنے کے لیے جری کردیا ہے۔ نہ صرف غیر مسلموں میں بلکہ خود مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو مذکورہ قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، چنانچہ وہ اسلام کے خلاف نہایت سطحی انداز میں لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔

اس وقت جڑ کا کام یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں جدید انسان کی غلط فہمی کو دور کیا جائے۔ اسلام کی اہمیت کو آج کے انسان کے لیے دوبارہ ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دیا جائے۔ اسلام کی تصویر کو لوگوں کی نظر میں اتنا باعظمت بنا دیا جائے کہ کوئی آدمی اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہ کرسکے۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص اس قسم کی نازیبا حرکت کرے تو اس کی بات ماحول کے اندر اپنے آپ میں بے وزن ہوکر رہ جائے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے آج کوئی شخص جمہوریت (ڈیموکریسی) کے خلاف بولے تو اس کی بات موجودہ ماحول میں اپنے آپ بے وزن ہوکر رہ جائے گی۔

جدید اسلامی لٹریچر

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سلمان رشدی جیسے لوگ جب کوئی شر پھیلاتے ہیں تو وہ ہمارے لیے صرف شر بن کر رہ جاتا ہے، وہ ہمارے لیے خیر کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے امام اور مفکر ایسے لوگوں کے سامنے اسلام کا جو تعارف پیش کررہے ہیں وہ صرف شور وغل ہے۔ اور شور وغل آج کے انسان کو صرف متنفر کرسکتا ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں اس کو متاثر کرنے والا نہیں۔

ایسے مواقع پر فطری طور پر اسلام کے مطالعہ کی فضا بنتی ہے۔ لوگوں کے اندر اسلام کے بارے میں تجسّس پیدا ہوتا ہے، وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ اسلام کو جاننے کی خواہش مند ہوجاتے ہیں۔ مگر وہ پاتے ہیں کہ موجودہ کتب خانوں میں ایسا لٹریچر موجود نہیں جو ان کی قابلِ فہم زبان میں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کو پیش کررہا ہو۔ جس کے اندر اتنی جاذبیت ہو کہ وہ اس کو دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھ سکیں۔ آج کے انسان کے اردگرد مخالف اسلام لٹریچر کا انبار موجود ہے، مگر موثر اسلوب میں تیار کیا ہوا موافق اسلام لٹریچر کا کہیں وجود نہیں۔

راقم الحروف نے چالیس سال پہلے عصر حاضر کی اس ضرورت کا احساس کیا تھا۔ اس کے مطابق میں نے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا، اور اسی کے ساتھ جدید علوم کو اس کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد میں نے عصری تقاضوں کے تحت ایسا اسلامی لٹریچر تیار کرنا شروع کیا جو آج کے انسان کے ذہن میں اسلام کی عظمت قائم کرسکے۔ میری تمام کتابیں کسی نہ کسی پہلو سے اسی خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کام میں اگرچہ مجھے ملّت کا مطلوبہ تعاون حاصل نہ ہوسکا۔ تاہم اپنی حد تک میں نے اپنی پوری طاقت اسی کام میں لگا رکھی ہے۔

اسی خاص ضرورت کے تحت میں نے ایک نئی کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے ''اسلام دورجدید کا خالق''۔ یہ کتاب ایک سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اور وہ الحمد اللہ اسلامی مرکز کے تحت چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

مذکورہ کتاب میں واقعات و حقائق کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ جدید سائنس اور موجودہ ترقی یافتہ دور جس پر آج کا انسان فخر کرتا ہے، وہ تمام تر اسلام کا عطیہ ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ رسول کے ذریعہ لایا جانے والا اسلامی انقلاب ہے جس نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار وہ عمل جاری کیا جس کے نتیجہ میں بالآخر دورِ جدید کی تمام ترقیاں ظہور میں آئیں۔ یہ کتاب اُردو اور انگیریزی، وغیرہ زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔

مثبت طریقِ کار

راجوری (کشمیر) سے ڈاکٹر مظفر شاہین نے اپنے ایک مفصل خط میں لکھا تھا: ”جب سے سلمان رشدی کی کتاب شائع ہوئی۔ وہ اخباروں اور رسالوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ تمام دنیائے اسلام میں عالم محشر بپا کر دیا گیا۔ حتی کہ رہنماؤں کے احتجاج سے متاثر ہو کر اسلام آباد، سرینگر اور بمبئی وغیرہ میں فسادات رونما ہوئے۔ لیکن کہیں بھی کسی مسلم عالم نے اس کتاب کا عقلی اور علمی دلائل سے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ کتاب دراصل ہمارے علماء کے لیے چیلنج ہے، نہ کہ عام معنوں میں اسلام کی تذلیل۔ چنانچہ آج تک کسی مسلم عالم کی طرف سے اس کتاب کی مدلل تردید نظر سے نہیں گزری۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو پڑھ کر اس کے بیانات سے متاثر ہوئے ہوں گے، کیا ہمارا شور و غل ان کے تاثر کا علاج بن سکتا ہے۔“

اس خط کے جواب میں میں نے لکھا کہ بلا شبہ یہ بے حد اہم بات ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف سلمان رشدی کی کتاب سے نہیں ہے بلکہ اس طرح کی تمام چیزوں سے ہے۔ مسلم رہنماؤں کا عام طریقہ یہ ہے کہ جب اس قسم کی کوئی کتاب چھپتی ہے تو وہ اس کے خلاف پُرشور بیانات دیتے ہیں اور عوامی ہنگامے برپا کرتے ہیں۔ مگر اصل کتاب کا مدلل جواب نہیں دیتے۔

مجھے اس بات سے صد فی صد اتفاق ہے کہ ایسا ہر واقعہ اسلام کی اہانت سے زیادہ خود ہمارے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب کے مخالفین اشعار کے ذریعہ اس قسم کی توہین آمیز اور دل آزاری باتیں کرتے تھے جو موجودہ زمانہ کے مخالفین کرتے ہیں۔ مگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یا صحابہ کرام کا وہ ردّ عمل نہیں ہوتا

تھا جس کا مظاہرہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما کر رہے ہیں۔ اس کے بجائے مسلمانوں میں سے وہ لوگ کھڑے ہوتے تھے جو شعر اور خطابت کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ دلائل کی زبان میں مخالفین کا جواب دیتے تھے۔ یہی اس طرح کے معاملات میں اسلامی طریقہ ہے اور یہی موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کو اختیار کرنا چاہیے۔

قدیم عرب میں خبر رسانی (communication) کا سب سے بڑا ذریعہ شاعری تھی۔ جس خیال کو عوام تک پہنچانا مقصود ہوتا اس کو منظوم کلام کی صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا جو سننے والوں کو بآسانی یاد ہو جاتا تھا۔ لوگ اس منظوم کلام کو لے کر جگہ جگہ سناتے تھے۔ اس طرح وہ بات سارے عوام میں پھیل جاتی تھی۔

موجودہ زمانہ میں پریس کی ایجاد نے شاعری کی یہ اہمیت ختم کر دی ہے۔ اب خبر رسانی کا سب سے بڑا ذریعہ صحافت ہے۔ موجودہ زمانہ میں جس فکر کو عوام تک پہنچانا مقصود ہو اس کو مرتب کر کے اخبارات میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ یہ اخبارات پریس کے ذریعہ چھپ کر کثیر تعداد میں لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

دور اول کے مسلمانوں نے خبر رسانی (comunication) کے قدیم ذریعہ (شاعری) کو استعمال کر کے مخالفین کی باتوں کی تردید عوام تک پہنچائی تھی۔ موجودہ زمانہ میں یہی کام ہم کو اخبار (یا کتاب) کے ذریعہ کرنا چاہیے۔ مسلم رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ ایسے مواقع پر ایسا نہ کریں کہ وہ اسلام کی اہانت اور ناموس رسول پر حملہ جیسے الفاظ بول کر عوام کو بھڑکائیں۔ یہ طریقہ ایک اعتبار سے بدعت ہے۔ اس سے مسلم عوام تو بھڑک جاتے ہیں مگر مخالفین کی باتوں کی تردید نہیں ہوتی۔ مخالفین کی باتیں بدستور لوگوں کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ اس کے بجائے مسلم رہنماؤں کو سنّت کے طریقہ پر عمل کرنا چاہیے۔ یعنی اخبار کا جواب اخبار سے اور کتاب کا جواب کتاب سے دینا چاہیے۔ اور وہ بھی اسلامی اخلاق اور علمی دلائل کی روشنی

میں ہو، نہ کہ سبّ وشتم کے انداز میں۔ مسلم رہنما اگر اس انداز پر عمل کریں تو زیادہ بہتر طور پر اسلام کی خدمت کریں گے۔

قابلِ تقلید نمونہ

ڈاکٹر رفیق زکریا بمبئی کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ انھوں نے سلمان رشدی کی کتاب ”شیطانی آیات“ کے جواب میں ایک کتاب محمد اور قرآن (انگریزی) لکھی۔ اس کتاب کو رشدی کی کتاب ہی کے پبلشر پنگوئن بکس (Penguin Books) نے شائع کیا جس کی شاخیں امریکا، برطانیہ اور ہندستان میں ہیں۔ یہ کتاب آج پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر فروخت ہو رہی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کا کرم ہے کہ اس کتاب کا خود پنگوئن والوں پر اتنا زبردست اثر ہوا کہ انھوں نے معاہدہ کے باوجود رشدی کی کتاب کا پیپر بیک اڈیشن نکالنے سے انکار کر دیا۔ (ہفت روزہ نئی دنیا، نئی دہلی، 3 اپریل 1992ء)

اس سے مثبت اندازِ کار کی غیر معمولی اثر انگیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذکورہ مثال کے مطابق، سلمان رشدی کی بیہودہ کتاب کے جواب میں اسلام پر ایک صحیح تعارفی کتاب تیار کی گئی۔ اس کتاب کو ”شیطانی آیات“ کے پبلشر ہی نے اپنے یہاں سے شائع کیا اور پھر ہر جگہ اس کو پڑھا جانے لگا۔ مزید یہ کہ خود پبلشر پر اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ شیطانی آیات کی مزید اشاعت سے باز آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مثبت طریقِ کار میں معجزاتی تاثیر چھپی ہوئی ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

خاموشی کی طاقت

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک بہت بامعنی قول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ باطل کو مارو اس کی طرف سے چپ رہ کر (امیتوا الباطل بالصمت عنه) حلیۃ الاولیا، جلد 1، صفحہ 55۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات شر اور باطل کے بارے میں خاموش رہ جانا اور اس کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہ کرنا ہی اس کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اس صمت عن الباطل (باطل کے بارے میں خاموشی) کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ محض ذاتی بغض کی بنا پر آپ کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلاتے ہیں اور بیہودہ مضامین شائع کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر آپ ان کا جواب دیں تو آپ صرف اپنا وقت ضائع کریں گے۔ ایسی باتوں کا بہترین جواب یہ ہے کہ ان کا جواب نہ دیا جائے۔ قدیم مثل ہے کہ "کتّے بھونکتے رہتے ہیں، ہاتھی چلتا رہتا ہے"۔ آپ "ہاتھی" والا کردار ادا کیجیے، شرپسندوں کے چھیڑے ہوئے فتنے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

ایک شخص آپ کے اوپر کیچڑ پھینکتا ہے۔ آپ کے گھر میں گندگی ڈال دیتا ہے۔ اب اگر آپ مشتعل ہو کر اس سے لڑنے لگیں تو آپ نے اس کے مقصد کو پورا کیا۔ آپ کی اشتعال انگیز کارروائی اس کو مزید موقع دے گی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے آپ کے خلاف مکمل فساد برپا کر دے گا۔ لیکن اگر آپ اس کی اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں تو گویا آپ نے اس کے بم کو ناکارہ کر دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے وہی بات ایک اور انداز سے فرمائی ہے کہ جس کو قرآن میں اعراض کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اعراض کا مطلب ہے اوائڈ کرنا، نظر

انداز کرنا۔ اعراض محض ایک سلبی فعل نہیں وہ ایک ایجابی کاروائی ہے۔ وہ خود ایک طاقت ورعمل ہے۔ وہ ناطق جواب کے مقابلہ میں خاموش جواب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ چپ کی طاقت بول کی طاقت سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں نظر انداز کرنا کسی شر کو دفع کرنے کی سب سے زیادہ موثر تدبیر ہوتی ہے۔ جہاں سب سے بڑی کارروائی یہ ہوتی ہے کہ سرے سے کوئی کارروائی ہی نہ کی جائے۔

فرض کیجیے کہ ایک شخص آپ کے خلاف ایک بے ہودہ جھوٹ گھڑتا ہے اور اس کو کتاب کی صورت میں چھاپ کر بازار میں لے آتا ہے۔ اب آپ کی کامیابی کس چیز میں ہوگی۔ آپ کی کامیابی اس میں ہوگی کہ یہ کتاب لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو کر رہ جائے۔ کوئی اس کو حاصل کر کے پڑھنے کی ضرورت نہ سمجھے۔

یہ مقصد سب سے زیادہ خاموشی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کتاب کے خلاف شور وغل کریں تو اس کا اشتہار ہوگا۔ لوگ غیر ضروری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کی طرف سے خاموشی اختیار کر لیں تو اس کو شہرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ اس کی کتاب اپنے آپ مر جائے گی۔

یہ زندگی کی ایسی حقیقت ہے جس کا بار بار تجربہ کیا گیا ہے اور تاریخ میں اس کو بار بار ریکارڈ کیا گیا ہے۔ مثلاً انگریزی کے ایک مصنف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کیا— افترا پردازی ہمیشہ مخالفت سے ترقی کرتی ہے:

"Scandal ever improves by the opposition."

کوئی شخص آپ کے خلاف جھوٹی تہمت لگائے تو اس کے بارے میں خاموشی اختیار کر لیجیے۔ اس کے خلاف بول کر آپ اس کو پھیلائیں گے۔ اس کے بارے میں چپ رہ کر آپ عین اسی مقام پر اس کا خاتمہ کر دیں گے جہاں وہ ابتداءً گھڑی گئی تھی۔

اصل کام

سلمان رشدی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے — آدھی رات کے بچّے:

"Midnight's Children"

اس کتاب میں سلمان رشدی نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ میں عقیدہ اور بے عقیدگی کے درمیان جھول رہا ہوں:

"I am hanging between belief and disbelief."

رشدی کا یہ کہنا کہ میں مذہب کے معاملے میں یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکا ہوا ہوں۔ یہ صرف ایک شخص کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک پوری نسل کا معاملہ ہے۔ سلمان رشدی نے جو بات اپنے بارے میں کہی ہے یہی کروروں مسلمانوں کی بات ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسل جس کی تعلیم جدید ماحول میں ہوئی ہے اس کا کم از کم 75 فیصد حصہ اسی قسم کی بے یقینی میں مبتلا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں سے کسی شخص نے رشدی والا قلمی پیشہ اختیار کیا اور وقتی فائدے کی خاطر اپنے دل کی گندگی کو کاغذ پر اُنڈیلنے لگا۔ اس کے برعکس، دوسرے لوگ کسی اور میدان میں کھانے کمانے میں مشغول ہیں۔ چنانچہ انہیں رشدی جیسی گندی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دسمبر 1988ء میں جب کہ میں امریکا میں تھا، مجھے وہاں کے ایک اسلامی مرکز میں لے جایا گیا۔ یہ مرکز جس خطہ میں واقع ہے وہاں تقریباً ایک لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ میں نے منتظمین سے پوچھا کہ اس علاقہ کے ایک لاکھ مسلمانوں میں سے کتنے لوگ ہیں جو اسلامی مرکز سے جڑے ہوئے ہوں۔ ایک ذمہ دار نے جواب دیا کہ دس فیصد مسلمان ہے۔ حاضرین میں سے دوسرا شخص بولا کہ آپ مبالغہ کر رہے ہیں، بمشکل 5 فیصد تعداد ہوگی جو اس مرکز سے جڑی ہوئی ہو۔

مجھے بتایا گیا کہ جو مسلمان امریکا میں آباد ہیں ان کی نئی نسلوں کی بیشتر تعداد اسلام سے بالکل ناواقف ہو چکی ہے۔ ان کو نماز، روزے سے کوئی مطلب نہیں، جنس اور شراب اور غذا کے معاملہ میں ان کے طریقے وہی ہیں جو دوسرے آزاد خیال امریکیوں کے ہیں۔ وہ بس برائے نام مسلمان ہیں۔

یہ کوئی انکشاف کی بات نہیں۔ ہر وہ شخص جو مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل سے واقف ہے، وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "رشدی" ہمارے درمیان ایک نہیں، بلکہ کروروں کی تعداد میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کی "رشدیت" ظاہر ہو چکی ہے اور کسی کی اب تک چھپی ہوئی ہے۔

مسلم نسل کی یہ صورتِ حال موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کی ترقی یافتہ زبانوں میں اعلیٰ معیار کا اسلامی لٹریچر تیار کر کے شائع کیا جائے تا کہ "ارتداد ذہنی" میں مبتلا ہونے والے ان بے شمار مسلمانوں کی بے یقینی کو دوبارہ یقین میں تبدیل کیا جا سکے۔ ان کو بے عقیدگی کے دلدل سے نکال کر دوبارہ عقیدہ کی صالح زمین پر کھڑا کیا جائے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جو اس کام کو موثر اسلوب اور مطلوبہ معیار پر انجام دے رہا ہو۔ اپنے دعویٰ کے مطابق بہت سے لوگوں نے عصری کتابیں چھاپ رکھی ہیں مگر یہ نام نہاد عصری کتابیں عصری کوڑا خانہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

راقم الحروف نے الرسالہ جولائی 1987ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "دور جدید کی تحریکیں"۔ اس مضمون میں جدید لٹریچر کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ جدید لٹریچر دورِ جدید میں اسلام کے احیاء کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ مگر کتابوں کے

ان گنت انبار کے باوجود، یہ ضرورت ابھی غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔حتی کہ لوگوں کے اندر اس کا حقیقی شعور بھی موجود نہیں۔

میں نے مزید لکھا تھا کہ میں اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکے جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں لکھی جا چکی ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔

اس مضمون کی اشاعت پر اب کئی سال کی مدّت پوری ہو چکی ہے۔ مگر آج تک کسی مسلم ذمہ دار کی طرف سے ایسی کوئی کتاب میرے پاس نہیں بھیجی گئی۔

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا اولین اور اہم ترین کام یہ تھا کہ وہ جدید علوم کو پڑھیں۔ وقت کی زبانوں کو سیکھیں۔ آج کے طریقِ استدلال اور اسلوبِ تحریر میں مہارت پیدا کریں۔ اور اس کے بعد اسلام کی ابدی تعلیمات کو موثر اور طاقتور انداز میں پیش کریں تا کہ آج کا انسان اور جدید مسلم نسل اس کو پڑھے اور اس کے ذریعہ سے اپنے کھوئے ہوئے عقیدہ کو دوبارہ حاصل کرے۔ مگر جدید اسلوب میں طاقتور لٹریچر وجود میں لانا تو درکنار، موجودہ مسلم رہنما قرآن کا ایک صحیح انگریزی ترجمہ بھی تیار کر کے شائع نہ کر سکے۔

ایسی حالت میں مسلم رہنماؤں کا سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کرنا حقیقتاً خود اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کے ہم معنی ہے۔ یہ اس کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرنا ہے جس کو انھوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ کچھ کیے بغیر کریڈٹ لینا چاہیں ان کے لیے خدا کے یہاں عذاب ہے، نہ کہ انعام (3:188)۔

ہمارے لکھنے والوں نے موجودہ زمانہ میں جو اسلامی کتابیں تیار کی ہیں وہ غیر منحرف ذہن کے لیے مفید ہوسکتی ہیں ۔ مگر منحرف ذہن کے لیے وہ سراسر غیر مفید ہیں ۔ کیونکہ وہ منحرف ذہن کے تقاضے کو بالکل پورا نہیں کرتیں ۔

ان تمام کتابوں کا یکساں طور پر یہ حال ہے جیسے ان کے لکھنے والوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اعتقادی استدلال کیا ہے ۔ اور عقلی استدلال کیا۔ جولوگ اس دونوں چیزوں کے فرق کو نہ جانیں وہ کبھی جدید نسل کے لیے اسلامی لٹریچر فراہم نہیں کر سکتے ۔

یہ کتابیں تقریباً سب کی سب اعتقادی استدلال کے اصول پر لکھی گئی ہیں ۔ اعتقادی استدلال صرف وہاں کارآمد ہوتا ہے جہاں زیر بحث مسئلہ میں دونوں فریق بنیادِ استدلال کے بارے میں ایک رائے رکھتے ہوں ۔ مگر جہاں اس بارے میں دونوں فریق کی سوچ الگ الگ ہو، وہاں اعتقادی طریق استدلال بالکل بے اثر اور بے قیمت ہوجاتا ہے ۔

جدید نسل جو جدید افکار سے متاثر ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی پیشگی مسلّمہ پر یقین نہیں رکھتی ۔ اس کا تصور یہ ہے کہ جو دعویٰ کیا جائے اس کو سائنس اور تاریخ کے معلوم حقائق کی بنیاد پر ثابت ہونا چاہیے ۔ گویا پہلے طریق استدلال کی بنیاد اگر اعتقادی مسلّمات پر قائم ہے تو دوسرے طریق استدلال کی بنیاد عقلی مسلّمات پر ۔ مگر موجودہ زمانہ میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں ہمارے لکھنے والوں نے جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اسلام کو حقیقی معنوں میں جدید انسان کے اپنے مسلمات کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہو ۔

دوسری کمزوری جو ان تمام کتابوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کتابیں افضلیت اور برتری کی اصطلاحوں میں لکھی گئی ہیں ۔ ان کا مقصد براہ راست یا بالواسطہ طور پر یہ ہوتا ہے کہ اسلام یا مسلمانوں کی برتری ثابت کریں ۔ اس قسم کا لٹریچر کچھ مسلمانوں کو خوش کر سکتا ہے مگر وہ جدید ذہن کے لیے ہرگز مؤثر نہیں ہوسکتا ۔

جدید ذہن کو اپیل کرنے والا لٹریچر صرف وہ ہوگا جس میں یہ دکھایا گیا ہو کہ اسلام کی تعلیمات عین فطرت کے مطابق ہیں۔ اسلام اور انسانی فطرت دونوں ایک دوسرے کا مثنی (counter part) ہیں۔

تیسری کمزوری جو جدید پیدا شدہ لٹریچر میں بہت زیادہ عام ہے، وہ یہ کہ یہ کتابیں دعوت کی زبان میں نہیں لکھیں گئیں، بلکہ عداوت کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب اپنے سینہ میں یہ احساس لیے ہوتے ہیں کہ موجودہ دنیا اسلام کی دشمن ہوگئی ہے۔ ہر طرف اسلام کے خلاف سازشیں کی جارہی ہیں۔ ہر قوم اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔اس نفسیات کے تحت جو لٹریچر تیار کیا جائے وہ عداوتی لٹریچر ہوگا، نہ کہ دعوتی لٹریچر۔

جو شخص اپنے سینہ میں مدعو کے خلاف نفرت لیے ہوئے ہو وہ پہلے مرحلہ ہی میں اس کام کے لیے اپنے آپ کو نا اہل ثابت کر رہا ہے۔ دعوتی کلام کے لیے مدعو کے حق میں محبت کی نفسیات درکار ہے، نہ کہ نفرت کی نفسیات۔ اس لیے ہمارے لکھنے والے جب تک اپنے سینہ کو منفی نفسیات سے خالی نہ کریں، ان کا دعوتی لٹریچر تیار کرنا ایک جرم ہے، نہ کہ کوئی واقعی اسلامی خدمت۔

سلمان رشدی جیسے واقعات کے مقابلہ میں مسلم رہنماؤں کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ اس کو مرتد قرار دے کر ان کے اوپر اسلامی سزا کے نفاذ کا اعلان کریں۔اس کے برعکس، ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ان کے کیس کو سمجھیں۔ان کی ذہنی پیچیدگیوں کا مطالعہ کریں۔ ان کے فکر ونظریہ سے پوری واقفیت حاصل کریں۔

اس طرح کے گہرے مطالعہ کے بعد ان کا فرض ہے کہ وہ اسلام پر ایسی کتابیں تیار کریں جو اس قسم کے لوگوں کو مطمئن کرنے والی ہوں۔ جو ان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا کر انہیں ان کے رب کے قریب کرسکیں۔

موجودہ زمانہ کے منحرف ذہنوں میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو امکانی طور پر اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ اسلام کو اپنے دل کی آواز پا کر اسے قبول کرلیں۔ مگر یہ امکان صرف اس وقت واقعہ بن سکتا ہے جب کہ دین حق کو اس کی مانوس زبان اور ان کے قابل قبول اسلوب میں ان کے سامنے پیش کردیا جائے۔

ایک پیاسا آدمی پانی کا گلاس صرف اس وقت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے جب کہ اسے یقین ہو کہ اس گلاس کے اندر جو چیز ہے وہ پانی ہے۔ اسی طرح ہر پیدا ہونے والا بلا شبہ حق کا طالب ہے۔ مگر جو تحفہ اس کے سامنے پیش کیا جائے اس کی بابت پہلے اس کو اس کی مانوس زبان میں یہ یقین دلانا ہوگا کہ یہ وہی مطلوب چیز ہے جس کو تم اپنی فطرت کے زیر اثر تلاش کر رہے تھے۔

سوال و جواب

سوال

سوال یہ ہے کہ کیا اسلام میں ذہین لوگوں کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ یہ سوال اس لیے ذہن میں پیدا ہوا کہ میں دیکھتا ہوں کہ ماضی میں اور حال میں بھی ذہین یا منطقی لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا گیا۔ مثلاً ماضی میں سید شہاب سہروردی کو قتل کر دیا گیا جب کہ وہ ابھی صرف 37 سال کے تھے۔ مگر بہت ذہین انسان تھے۔ ابن رشد کو جیل میں ڈالا گیا۔ رازی، فارابی اور بوعلی سینا پر کفر کا فتویٰ لگا کر ان کو ذلیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہمارے یہاں سرسید احمد خاں کی تکفیر کی گئی اور انہیں ذلیل کیا گیا۔ ڈاکٹر اقبال پر بھی کفر کا الزام لگایا گیا۔ بوعلی سینا نے بھی اپنے ایک فارسی قطعہ میں کہا ہے کہ یہاں اگر رہنا ہے تو گدھا بن کر رہو، اگر عقلمند بنو گے تو پھر خیر نہیں۔

کیا اسلام میں ایسے ہی لوگوں کی گنجائش ہے جو منطقی نہ ہوں، استدلالی نہ ہوں، اپنی عقل و فہم کی روشنی میں حیات و کائنات کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔ (احساس آفاقی، کُرلا، ممبئی)

جواب

آپ نے چند مثالوں کو لے کر ان کو جنرلائز (generalize) کر دیا ہے۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں فکری آزادی کو بہت بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ اس معاملہ کی تفصیل کے لیے آپ میری کتاب دین انسانیت کا باب "حریت فکر" ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ، آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

قرآن میں بار بار اہلِ عقل کو خطاب کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خود قرآن کے نزول کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ عقل والے اس پر غور کریں (38:29)۔ چنانچہ ہر دور میں عقلی غور و فکر

کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ آپ نہج البلاغہ کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت علی کتنا زیادہ عقلی غورو فکر کو پسند کرتے تھے۔ عباسی خلافت اور اسپین کی اموی خلافت کے دور میں عقلی غور وفکر کی زبردست حوصلہ افزائی ہوئی جس کی تفصیل آپ فلپ ہٹی کی کتاب 'ہسٹری آف دی عربس' میں دیکھ سکتے ہیں۔

قدیم زمانہ میں فخر الدین رازی کی ضخیم تفسیر اور موجودہ زمانہ میں جوہری طنطاوی کی مفصل تفسیر قرآن کی عقلی تشریح کی مثالیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' خاص اسی مقصد کے لیے لکھی۔ خود راقم الحروف نے تقریباً چالیس سال سے اسلام کی عقلی اور سائنسی تشریح کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس پر سو سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں مگر ساری مسلم دنیا میں کسی بھی شخص نے اس پہلو سے میری مخالفت نہیں کی۔

تاہم بعد کے زمانہ میں ایک غلط مسئلہ مسلمانوں میں پھیل گیا اور وہ یہ کہ جو شخص رسول کی اہانت کرے یا اسلام کی اہانت کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔ اس مسئلہ کی بنا پر کچھ لوگوں کا قتل بھی ہوا۔ مگر یہ مسئلہ بذات خود غلط ہے۔ اس کی کوئی اصل قرآن یا حدیث میں نہیں۔ اس مسئلہ کی ذمہ داری بعد کے دور کے کچھ مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے، نہ کہ خود اسلام پر۔

سوال

سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (Satanic Verses) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کہا جاتا ہے کہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں اور اس کا مصنف ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہے جس کی سزا سخت ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ (نکہت کاظمی، نئی دہلی)

جواب

اسلام کی تعلیمات حقیقت پسندی پر مبنی ہیں۔ اس طرح کے معاملات کو اسلام میں

جذباتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ رزلٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم باطل معبودوں کو برا کہو ورنہ لوگ جہالت کی بنا پر خدا کو برا کہنے لگیں گے۔(6:108)

یہی وجہ ہے کہ قدیم مدینہ کے سب سے بڑے گستاخ عبداللہ بن ابی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے طاقت کے باوجود قتل نہیں کرایا۔ اس کی وجہ آپ نے یہ بتائی کہ اگر میں ایسا کروں تو وہ اسلام کی بدنامی کا باعث ہوگا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4905)۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی اپنی طبعی موت مرا اور اس کو قتل نہیں کیا گیا، حالانکہ اس وقت عبداللہ بن اُبی کو قتل کرنا بالکل آسان تھا۔

سلمان رشدی کے خلاف قتل کا فتویٰ 17 فروری 1989 کو دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کو تحریر لکھے جانے تک (جولائی 2000 میں) تقریباً 12 سال ہو رہے ہیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھیے تو اس فتویٰ نے صرف الٹا نتیجہ پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا میں بڑے پیمانے پر اسلام کی بدنامی ہوئی۔ اسلام کو نفرت اور تشدد کے مذہب کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔

اس کتاب کے خلاف فتویٰ اور شوروغل سے اس کے مصنف کو زبردست فائدہ حاصل ہوا، یعنی اس کو شہرت ملی، اور ''شیطانی آیات'' نہ صرف انگریزی بلکہ دیگر مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر پوری دنیا میں کثیر تعداد میں فروخت ہوئی۔ جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے حصہ میں صرف اس کا نقصان آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ میڈیا کا دور تھا اور جدید میڈیا کے دور میں یقیناً وہی ہونے والا تھا جو عملاً پیش آیا۔

سلمان رشدی کی مذکورہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب تصنیفی اعتبار سے اس قدر لغو اور غیر دلچسپ ہے کہ شاید کوئی بھی شخص اس کو شروع

کر کے ختم نہیں کرسکتا۔(تفصیل کے لیے دیکھیے، زیرِنظر کتاب کا عنوان: سورج پر خاک)

عام حالت میں وہ ایک ایسی کتاب تھی جو اپنی لغویت کی بنا پر اپنے آپ مرجاتی۔ اس کو نہ کوئی خریدتا اور نہ اس کو کوئی پڑھتا۔ مگر مصنف کے قتل کے فتویٰ کے بعد جب میڈیا میں اس کا چرچا ہوا تو فطری طور پر لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس طرح ایک ناقابل مارکیٹ کتاب بھی قابلِ مارکیٹ (marketable) کتاب بن گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس فتنہ کا صحیح ترین حل یہ تھا کہ اس کو مکمل طور پر نظر انداز کردیا جاتا اور اس طرح یقینی طور پر وہ اپنے آپ مرجاتا۔ اس طرح کے مسئلہ کا صحیح ترین حل وہ ہے جو اسلام کے خلیفۂ ثانی عمر فاروق کے ایک قول میں ملتا ہے۔ انہوں نے کہا: **إِنَّ لِلّٰہِ عِبَادًا یُمِیتُونَ البَاطِلَ بِھَجْرِہِ** (حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 55)۔ یعنی اللہ کے کچھ بندے ہیں جو باطل کو ہلاک کرتے ہیں اس پر چپ رہ کر۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تم باطل کا خاتمہ کرو اس کو نظر انداز کر کے۔

خاتمۂ کلام

اس کتاب کے بیشتر مضامین سلمان رشدی کا مسئلہ پیش آنے کے جلد ہی بعد لکھے گئے تھے۔اس کے کچھ حصے ماہنامہ الرسالہ میں بھی شائع ہوئے۔ یہ پورا مجموعہ 1989 میں کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر چھپنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔تاہم بعض وجوہ سے بروقت اس کی اشاعت ممکن نہ ہوسکی۔لمبی تاخیر کے بعد 1996 کے آخر میں اس کو شائع کیا جارہا ہے۔

اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تاخیر حکمت سے خالی نہ تھی۔اسی تاخیر کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ ”خاتمۂ کلام“ کا یہ باب کتاب کے آخر میں شائع ہو سکے جو بہت بعد کو جون 1996 میں لکھا گیا ہے۔اگر 1989 میں یہ کتاب چھپ جاتی تو وہ اس ضروری باب سے خالی ہوتی۔

ہمارا لکھنے اور بولنے والا طبقہ عام طور پر سلمان رشدی کو ”اعداء اسلام“ کی سازش سمجھتا ہے۔اس کا خیال یہ ہے کہ یہ اسلام کے خلاف اہل مغرب کی سازش ہے جس نے سلمان رشدی کے قصہ کی صورت اختیار کی۔میرے نزدیک یہ محض سطحی بات ہے جو سراسر بے بنیاد ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب مصنف کا ایک انفرادی فعل ہے، نہ کہ مغربی ملکوں کا کوئی اجتماعی منصوبہ۔

موجودہ زمانہ کا نام نہاد مسلم پریس اس بات کو بہت اچھالتا رہا ہے کہ امریکا اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد امریکا (اور اہل مغرب) نے اسلام کو اپنے دشمن کے طور پر دریافت کیا ہے۔سوویت یونین کے ٹوٹنے سے پہلے مغرب جس طرح کمیونزم کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھا، اسی طرح اب اس نے اسلام کو اپنے نشانہ پر رکھ لیا ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کو اپنے وجود کے لیے ایک عدو درکار تھا، اشتراکی عدو کے خاتمہ کے بعد اس نے اسلامی عدو کو ایجاد کرلیا ہے تاکہ عالمی سطح پر وہ اپنے بقا کی جدوجہد

جاری رکھ سکے۔ مغربی تہذیب مقابلہ کے اصول پر قائم ہے، اور مقابلہ آرائی کے لیے ایک حریف لازمی طور پر ضروری ہوتا ہے۔

مگر یہ تمام باتیں محض اوہام اور مفروضات کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بے حقیقت ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آج بھی مغربی ملکوں کے ہزاروں لوگ مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی عظمت کو قائم کرنے والی بہترین کتابیں اہل مغرب ہی نے لکھی ہیں۔ (ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب فکر اسلامی، صفحہ 72-70)

مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں کچھ مغربی حلقوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ اور پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں اسلام کی تصویر بگاڑنے کی جو کوشش کی گئی ہے، اس کا سب سے بہتر اور مؤثر جواب بھی بعض مغربی مصنفین ہی نے فراہم کیا ہے۔ ان میں سے ایک قابل تذکرہ کتاب ایک برطانی خاتون کی ہے جو پہلی بار 1991 میں لندن سے چھپی ہے۔ 280 صفحہ کی یہ قیمتی کتاب حسب ذیل ہے:

Karen Armstrong, *Muhammad; A Western Attempt to Understand Islam*, Victor Gollancz Ltd., London

حال ہی میں لندن سے ایک اور کتاب چھپی ہے۔ اس کتاب نے اس افسانہ کا خاتمہ کر دیا ہے کہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد مغرب نے اسلام کو اپنے عدو کے روپ میں پیش کرنا شروع کیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس افسانہ کی شہرت مغربی دنیا سے زیادہ مسلم دنیا میں ہوئی ہے۔ یہ کتاب ایسے لوگوں کے لیے انتہائی قابل مطالعہ کتاب ہے جو عداوت کے مفروضہ میں یقین رکھے ہوئے ہیں:

Fred Halliday, *Islam and the Myth of Confrontation: Religion and Politics in the Middle East* (London: I. B. Tauris, 1995)

یہ دوسری کتاب عربی زبان میں بھی ترجمہ ہو کر چھپ چکی ہے۔ اور اس کا نام یہ ہے:**الاسلام واسطورة الواجهة**۔

سلمان رشدی کے واقعہ کے ذریعہ زیادہ اہم چیز جو بےنقاب ہوئی ہے وہ خود مسلمانوں کے علماء اور دانشوروں کی ایک مہلک کمزوری ہے، وہ ہے —ایک خبر کو سن کر فوراً اس کے اوپر بھڑک اٹھنا اور بلاتحقیق اس کے پیچھے دوڑ پڑنا۔ اس قسم کی عاجلانہ کاروائی ہمیشہ آخر کار خود اپنی رسوائی کا باعث ہوتی ہے۔ اور وہی اس معاملہ میں ہمارے ساتھ پیش آیا ہے۔

اس قسم کا ردعمل بلاشبہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ قرآن وحدیث میں واضح طور پر اہل اسلام کو ایسے عاجلانہ ردعمل سے منع کر دیا گیا ہے۔

قرآن کی سورہ الحجرات میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ پر نادانی سے جا پڑو، پھر تمھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے (49:6)۔

برائی کے خلاف عاجلانہ اقدام خدا کی اسکیم کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ اکثر حالات میں ندامت ہوتا ہے۔ سلمان رشدی کے معاملہ میں تقریباً پوری ملّت اسی نادانی سے دو چار ہوئی ہے۔ اس معاملہ کی خبر جب میڈیا کے ذریعہ لوگوں کے سامنے آئی تو تحقیق اور مشورہ کے بغیر ہر ایک لفظی جہاد کے میدان میں کود پڑا۔ مگر آخر میں ہر ایک کو ندامت کا شکار ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

1۔ ہندستان کے علماء، مثلاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)، مولانا ابواللیث اصلاحی (سابق امیر جماعت اسلامی ہند) نے قتل کے فتوے کی حمایت میں فوراً اخبار میں بیان دے دیا۔ بعد کو حالات نے بتایا کہ ان کی حمایت درست نہ تھی۔ چنانچہ دونوں نے اپنے سابقہ بیان میں تعدیل کی اور دوسرا بیان اخبار میں شائع کیا (ملاحظہ ہو، زیر نظر کتاب کا صفحہ 81)۔

2۔اس واقعہ کے ابتدائی زمانہ میں مکہ میں مسلم ذمہ داروں کی ایک میٹنگ رابطۃ العالم الاسلامی کے تحت ہوئی۔ اس میٹنگ میں ان ذمہ داروں نے اعلان کیا کہ سلمان رشدی مرتد ہے، اور اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے (ملاحظہ ہو، زیرِنظر کتاب کا صفحہ 44-43)۔

اس کے بعد ریاض میں تنظیم اسلامی کانفرنس (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں 26 مسلم ملکوں کے اعلیٰ ذمہ دار شریک ہوئے۔ انھوں نے بلااعلان مذکورہ بیان کی تصحیح کی اور متفقہ طور پر اس کے بالکل برعکس بیان دیا۔ انھوں نے آیت اللہ خمینی کے فتوے کو کلی طور پر رد کر دیا۔ (ملاحظہ ہو، زیرنظر کتاب، صفحہ 46)

3۔مسلم دنیا کی مشہور شخصیت اور سعودی عالم دکتور عبداللہ عمر نُصَیف نے ابتدا میں وہی بات کہی جو آیت اللہ خمینی کی حمایت میں عام علماء کہہ رہے تھے۔یعنی یہ کہ سلمان رشدی اپنی مذکورہ کتاب کی وجہ سے قابلِ قتل ہے۔ (ملاحظہ ہو زیرِنظر کتاب، صفحہ 43)۔مگر بعد کو انھیں اس انتہا پسندانہ نظریہ سے رجوع کرنا پڑا۔ دکتور عبداللہ عمر نصیف 1993 کے آغاز میں روم (اٹلی) گئے۔ وہاں انھوں نے مسیحی پیشوا پوپ جان پال دوم سے ملاقات کی۔ روم میں انھوں نے ایک عالمی ایجنسی ورلڈ نیوز لنک (World News Link) کو ایک انٹرویو دیا۔ انگریزی رپورٹ کے مطابق، اس کا ایک سوال وجواب یہ تھا:

Q. What is your opinion on the death penalty imposed on the British author Salman Rushdie by Iran's religious leaders?

A. Some people, in emotion, pass these resolutions. I think that today, we must promote human rights. The death penalty should be only for criminals who commit the crime of killing people. Otherwise, human

rights should be given to everybody." (*Newstime*, Hyderabad, 17 February, 1993)

سوال: ایران کے مذہبی رہنماؤں نے برطانی مصنف سلمان رشدی کے خلاف موت کی سزا کا فیصلہ دیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: کچھ لوگ جذباتی طور پر اس قسم کی تجویزیں منظور کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج ہمیں انسانی حقوق کو فروغ دینا چاہیے۔ موت کی سزا کو صرف ان مجرموں کے لیے ہونا چاہیے جو قتل کا جرم کرتے ہیں۔ بصورت دیگر، ہر ایک کو انسانی حقوق دیا جانا ضروری ہے۔

4۔ خود ایرانی رہنماؤں کا بھی یہی حال ہوا۔ ابتداءً انھوں نے بڑے زور شور کے ساتھ قتل کی سزا کا اعلان کیا۔ مگر اس کے بعد ساری دنیا میں ان کے خلاف جو ردعمل ہوا اس کی بنا پر وہ اس کے لیے کوئی بھی عملی اقدام نہ کر سکے۔ پھر یہ خبریں آنے لگیں کہ ایرانی رہنما سلمان رشدی کے قتل کے فتوے کو واپس لے رہے ہیں۔ آخر کار 12 مارچ 1996ء کو ابوظبی کی ڈیٹ لائن کے ساتھ اخباروں میں اس عنوان کی خبر آ گئی کہ — ایران رشدی کے خلاف قتل کی سزا کو موقوف کرتا ہے:

"Iran drops death sentence on Rushdie."

اگلے دن اخباروں نے خوشی کے ساتھ ادارتی نوٹ لکھے کہ ساڑھ سال بعد ایران نے اس ”غیر مہذب“ فتوے کو واپس لے لیا۔ ہندوستان ٹائمس (13 مارچ 1996) کے ادارتی نوٹ (End of a Fatwa) کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا:

"The Iranian decision must be welcomed with the hope that the twentieth-century world will turn a leaf on the medieval practices of burning books and sending their authors to the stake."

ایران کے اس فیصلہ کو خیر مقدم کیا جانا چاہیے، اس امید میں کہ بیسویں صدی کی دنیا اب قرون وسطیٰ کے ان طریقوں سے نجات پا جائے گی، جب کہ کتابوں کو جلایا جاتا تھا اور ان کے مصنفین کو زندہ نذر آتش کر دیا جاتا تھا۔

5۔ یہی واقعہ وسیع تر سطح پر ملّت کے ساتھ پیش آیا۔ سلمان رشدی کی کتاب پر آیت اللہ خمینی کا فتویٰ آنے کے بعد ساری دنیا کا مسلم پریس بیک زبان اس کی تائید پر کھڑا ہو گیا۔ تمام اخبار لکھنے اور بولنے والے لوگ مکمل طور پر خاموش ہیں، جب کہ سلمان رشدی بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔

اگر ان لوگوں کا پچھلا موقف درست تھا تو شرعی طور پر ان کے لیے جائز نہیں کہ سلمان رشدی زندہ موجود ہو اور وہ اس کے معاملہ خاموشی اختیار کر لیں۔ انھیں نہ صرف لکھنا اور بولنا چاہیے، بلکہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے اعلان کی عملی تکمیل کرنا چاہیے۔ اور اگر ان پر ان کی غلطی واضح ہو گئی ہے تو ان کا فرض ہے کہ جس طرح پہلے انھوں نے واضح لفظوں میں رشدی کی گردن زدنی ہونے کا اعلان کیا تھا، اب کھلے طور پر اپنی مجرمانہ غلطی کا اعتراف کریں۔ اور جن لوگوں تک انھوں نے اپنی پہلی رائے پہنچائی تھی، اب ان تمام لوگوں تک اپنی دوسری رائے بھی پہنچائیں۔

ان دو کے سوا تیسرا رویہ — بلا اعلان چپ ہو جانا، موجودہ حالت میں ایک جرم ہے اور سخت اندیشہ ہے کہ اس تیسرے موقف کو اختیار کرنے کے لیے انھیں خدا کے یہاں سخت مواخذہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے بار بار ایسا کیا ہے کہ ان کے سامنے ایک صورت حال آئی۔ انھوں نے ضروری تحقیق کے بغیر جلد بازی میں ایک انقلابی قدم اٹھا دیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا اقدام غلط تھا۔ اس علم کے بعد انھوں نے صرف یہ کیا

کہ خاموش ہو کر اپنے اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی رہنما کے لیے یہ موقف جائز نہیں۔ اس طرح بزعم خود وہ اپنی تصویر بگڑنے سے بچا لیتا ہے مگر عوام کو ابدی طور پر وہ ہلاکت کے گڑھے میں باقی رہنے دیتا ہے۔ عام لوگ کسی معاملہ کی گہرائی کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اپنے قائد کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ اس لیے جس قائد نے عوام کو پہلی بار غلط راستہ پر دوڑایا تھا، اسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مشتبہ انداز میں اپنی غلطی کا اعلان کرے، تاکہ اس کے اَتباع (followers) معاملہ کی صحیح نوعیت کو سمجھ لیں اور دوبارہ ایسی غلطی میں مبتلا نہ ہوں۔

امتحان کی اس دنیا میں غلطی کرنا جرم نہیں ہے۔ اصل جرم یہ ہے کہ غلطی کرنے کے بعد آدمی اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے۔

شتمِ رسول کا مسئلہ

شاتم کے لیے قتل کی سزا مقرر کرنا، اسلام کے ثابت شدہ اصولوں کے خلاف ہے۔ اس معاملے میں صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ کتاب کا جواب کتاب سے دیا جائے۔ کتاب کا جواب تلوار سے دینا، اسلام کے معلوم اصولوں کے مطابق نہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں شتمِ رسول کے مسئلے کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔

PDF BUY

ISBN 978-81-78987-71-2

9 788178 987712

Goodword Books
CPS International